اردو شرح

انوار الباری

صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

ودیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240)

انوار الباری ۱۸

اردو شرح

صحیح البخاری

تقدمہ
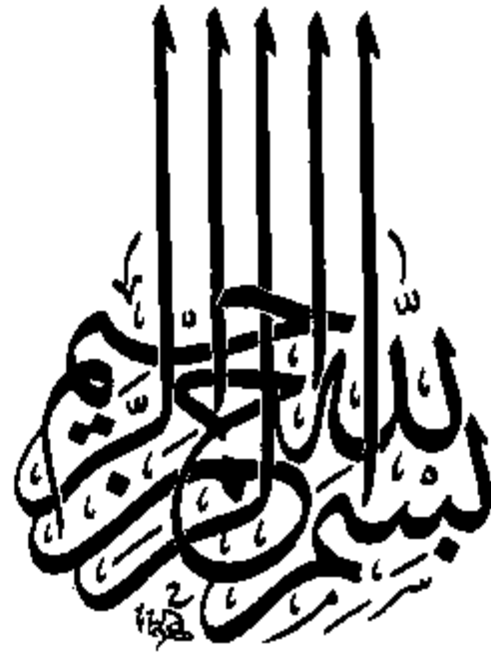
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ و به استعين و اصلي و اسلم علي رسوله النبي الامين ،قسط نمبر ۱۷ کے بعد قسط ہذا کافی تاخیر سے پیش کی جارہی ہے دوسرے عوارض وموانع کے علاوہ مالی مشکلات بھی حائل رہیں، کیونکہ اس عرصہ میں جو آمدنی ہوئی وہ ختم شدہ حصوں کی مکرر اشاعت پر صرف ہوتی رہی تا کہ نئے خریداروں کے لئے مکمل سیٹ مہیا ہوتے رہیں، ایسی صورتیں بھی سامنے آئیں کہ کافی رقوم مل سکتی تھیں، جو ہماری آزادحق گوئی پراثر انداز ہوتیں، اس لئے ان کو قطعی طور سے نظر انداز کیا گیا۔اور ایسا ہی آئندہ بھی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس مشکل کا ایک حل یہ خیال کیا گیا کہ میں پاکستان کا سفر کروں، چنانچہ دسمبر ۸۰ء میں وہاں گیا۔اور خاص احباب ومخلصین سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا گیا۔اور چونکہ ایک مدت سے گیارہویں جلد کے بعد وہاں کتاب نہیں جارہی تھی، جبکہ زیادہ خریدار بھی وہیں تھے، محصول ڈاک بھی بہت زیادہ ہوگیا تھا اور وہاں سے رقوم بھی نہ آسکتی تھیں، اس لئے طے کیا گیا کہ پاکستان میں ہی انوارالباری کی طباعت واشاعت کا انتظام کیا جائے، کئی ادارے اس کے لئے آمادہ تھے مگر قرعۂ فال محترم جناب مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب اوقاف و مالک مکتبہ حفیظیہ گوجرانوالہ کے نام نکلا اور اکابر واحباب کی رائے سے خدا پر بھروسہ کر کے ان ہی کو یہ کام سپرد کردیا گیا۔معاہدہ میں یہ طے ہوا کہ وہ شائع شدہ سترہ جلدوں کو جلد سے جلد پاکستان میں طبع کرا کر شائع کریں گے۔اور قیمت کتاب کا دس فی صدی مکتبہ ناشر العلوم بجنور کو عطا کرتے رہیں گے۔تا کہ اس سے یہاں اگلی جلدوں کی طباعت میں مدد ملتی رہے اور یہاں سے نئی جلدیں بھی ان کو بھیجتے رہیں گے۔

مگر افسوس کہ وہ اپنے عزائم پورے نہ کر سکے اور اب تک صرف چار جلدیں طبع کرا سکے ہیں۔انہوں نے کتابت وطباعت کا معیار بھی بہت بلند کردیا تھا، آفسٹ سے اعلیٰ کاغذ پر اشاعت کی، لیکن پورے سیٹ کے نئے خریدار اور گیارہویں حصہ کے بعد کے سابق خریدار بھی کتاب نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔اب ارادہ ہے کہ پھر پاکستان جاؤں اور اکثر جگہ کے احباب اور علماء ومدارس سے رابطہ کروں تا کہ ان کو توجہ دلا کر اس مسئلہ میں مزید اور بہتر پیش رفت ممکن ہو۔وَمَا ذٰلِکَ عَلَي اللہ بعزيز.

اس سلسلہ میں ایک تائید غیبی یہ بھی پیش آئی ہے کہ دسمبر ۸۳ء میں ایک تقریب سے جنوبی افریقہ کا سفر ہوا، اور وہاں کے قدیم وجدید احباب ومخلصین نے انوارالباری کی تکمیلِ تالیف واشاعت کیلئے اصرار کیا تو ان کو حالات ومشکلات سے واقف کیا گیا، اس پر انہوں نے پھر سے ہمت وحوصلہ دلایا کہ باقی ۱۲ جلدیں تالیف کر کے شرح بخاری شریف کو تیس جلدوں میں حتی الامکان جلد شائع کردیا جائے۔لہٰذا اب سابقہ شائع شدہ حصوں کو بھی پھر سے شائع کر کے سیٹ مکمل کئے جارہے ہیں، اور یہ نئی جلد بھی پیش کی جارہی ہے۔ناظرینِ انوارالباری کی خدمت میں درخواست ہے کہ وہ اس سلسلہ کی تکمیل اور آسانیوں کیلئے دعا فرمائیں، اور ہر قسم کے علمی واصلاحی مشوروں سے بھی مدد فرماتے رہیں۔

اس جلد سے متن بخاری شریف کا التزام ختم کیا جارہا ہے۔یوں بھی بخاری شریف میں اسناد ومتونِ احادیث کا تکرار بہت زیادہ ہے، پھر یہ کہ اس سے شرح کی ضخامت میں بھی تقریباً ۱۵۔۲۰ جلدوں کا اضافہ ہوجائے گا، جن کی وجہ سے وقت ولاگت میں غیر معمولی زیادتی ہوگی،

جس کوموجودہ احوال وظروف میں مناسب نہیں سمجھا گیا۔

انوار الباری کا مقصد علمی حدیثی ابحاث وانظار کو پیش کرنا اور اکابر امت کے منتشر محققانہ افادات کو یکجا کر دینا نیز حضرت العلامۃ المحدث شاہ صاحبؒ کے محدثانہ علوم وتحقیقات عالیہ کو وثوق واحتیاط کے ساتھ حتی الامکان سہل وواضح انداز میں مرتب کرنا ہے۔اس میں کمی نہ ہوگی۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔وہوالمعین۔

حضرت الاستاذ العلام شاہ صاحبؒ کے ملفوظات گرامی کا ایک مجموعہ ''نطق انور'' کے نام سے بہت عرصہ پہلے شائع کیا تھا،اب ارادہ ہے کہ حسب گنجائش ہر جلد کے ساتھ ان کو دیا کریں گے۔

مقدمۂ فیض الباری کا ذکرِ خیر

ناظرین انوارالباری جانتے ہیں کہ ۱۹۳۸ء میں راقم الحروف نے محترم مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی رفاقت میں حرمین شریفین اور مصر وترکی کا سفر کیا تھا۔اور مصر میں طویل قیام کر کے فیض الباری اور نصب الرایہ کو طبع کرایا تھا۔فیض الباری کے شروع میں مولانا بنوریؒ کا مقدمہ بھی تھا، جو کئی بار کی طباعتوں میں بدستور شائع ہوتا رہا۔ پھر اسی کے ساتھ عزیز مولوی سید آفتاب عالم سلمہ کے اہتمام سے بھی پہلی دو جلدیں لاہور سے شائع ہوئیں، جن میں حضرت مولانا سید بدر عالم صاحبؒ کے حواشی واستدراکات کا اضافہ ہے،ان میں مفید علمی وحدیثی افادات دیکھ کر بہت مسرت ہوئی جزاھم اللہ خیر الجزاء،مگر اس کے مقدمہ وغیرہ میں حذف والحاق کا جو غیر موزوں اقدام کیا گیا ہے،اس سے مجھے نہایت افسوس بھی ہوا۔

اس کے بارے میں چونکہ میرا وہم وگمان بھی نہ تھا نہ ایسی توقع تھی،اس لئے صرف ان حواشی ہی کا مطالعہ کیا تھا،مقدمہ وغیرہ نہیں پڑھا تھا،جب پاکستان کا سفر ہوا تو کراچی کے احباب نے اس کا ذکر کیا اور یہ بھی بتلادیا کہ افریقہ کے احباب کو بھی اس پر اعتراض ہے۔لاہور واپس ہوا تو وہاں بھی بعض علماء نے اس پر نکتہ چینی کی اور اب سفر افریقہ کے دوران بھی علماء کو ان پر معترض پایا۔تاہم یہ رائے ہوئی کہ اس معاملہ کو اخبارات ورسائل کی سطح پر نہ لایا جائے اور صرف اہل علم ہی اس پر مطلع ہوں اور احقر ہی اس کو انوارالباری میں کسی موقع پر لکھ دے تاکہ مغالطہ کی صورت خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو جائے۔اگر عزیز موصوف اس اقدام سے قبل ہی مجھ سے رجوع کر لیتے،تو میں ان کو صحیح صورتِ حالات سے واقف کر کے اس سے روک دیتا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب نے باوجود درسی مشغولیتوں کے فیض الباری ایسا اہم علمی کام انجام دیا اور علم حدیث کی دنیا میں ایک بڑی خدمت پیش فرمادی،اس لئے وہ ہم سب کے دلی تشکر کے مستحق ہیں۔

جیسا کہ خود انہوں نے بھی اپنے مقدمہ میں اعتراف فرمایا ہے کہ اس تالیف کا کام انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد کیا ہے اور میرے علم میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرتؒ کی حیات کے آخری سال میں الحاج مولانا محمد بن موسیٰ سملکیؒ سے اس کام کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور انہوں نے غالباً حضرتؒ سے استمزاج کے بعد خاموشی اختیار کر لی تھی،لیکن مجھے اس کام کی اہمیت کا خیال تھا،اس لئے حضرتؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد بدر عالمؒ سے گزارش کی کہ وہ اس کام کو کریں،اور مجھے توقع تھی کہ وہ اس کام کو العرف الشذی اور انوار المحمود سے بہتر کریں گے،غرض میں نے حضرت مولانا میاں صاحبؒ کو لکھا تو انہوں نے میری رائے سے اتفاق فرمالیا اور کام ہوتا رہا۔

یہ کام ہم نے ''مجلسِ علمی'' کے لئے کرایا تھا۔مگر طباعت کے وقت اس کے مصارف کی ذمہ داری جمعیت علماءِ ٹرانسوال نے لے لی۔

اس طرح اس کو جمعیت کی طرف سے اور نصب الرایہ کو مجلسِ علمی کے خرچ پر مصر میں طبع کرا کر شائع کرنے کا پروگرام بنالیا گیا۔

مولانا بنوریؒ میرے رفیقِ سفر ہوئے،اور قاہرہ جا کر یہ طے ہوا کہ مولانا فیض الباری کے اصول و پروف دیکھیں۔حتی الامکان عبارات

وکتابت کی غلطیاں بھی درست کریں، اور میں نصب الرایہ کا کام اسی طرح کروں۔ ۸۔۹ ماہ کا طویل عرصہ ہم نے اس کام میں لگایا، دوران طباعت میں مولانا نے مجھے بار بار کہا کہ تہذیب عبارات اور تصحیح پروف وغیرہ کا کام تو میں کر رہا ہوں اور کر بھی سکتا ہوں مگر کتاب میں دوسری خامیاں بھی ہیں، جن کے لئے بیسیوں کتابوں کی مراجعت درکار ہے، وہ اس وقت نہیں ہو سکتی، اور خاص طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف بہ کثرت انتسابات مشکوک ومشتبہ نظر آتے ہیں، اس پر میں نے کہا کہ اب تو صرف یہی ہو سکتا ہے کہ آپ مقدمہ میں ان امور کی طرف اشارہ کر دیں گے، اور وہ بھی اس طرح کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات بھی خطاؤں سے محفوظ ہو سکے۔ اور مولانا کو اس طرح بچائیں کہ وہ مراجعت کا وقت نہ پا سکے اور دوسرے فارغین طلبہ کی درسی تقاریر بھی ان کے سامنے تھیں، ان سے ایسی اغلاط کی در اندازی ہوئی ہوگی۔

یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا ہے اور خدا شاہد ہے کہ مولانا جب بہت پریشان ہوئے اور مجھے بھی پریشان کیا تو اس صورت کے علاوہ ہمارے پاس کوئی علاج نہ تھا، کیونکہ فیض الباری کی طباعت کو روک دینا بھی ہم مناسب نہ سمجھتے تھے، کہ اور کچھ نہیں تو **العرف** اور **انوار المحمود** ہی کی طرح کافی مفید محققانہ علمی حدیثی ابحاث سامنے آ ہی جائیں گی۔ اور اغلاط کا تدارک پھر ہوتا رہے گا۔

غرض مولانا نے بہت احتیاط سے اور مولانا بدر عالم صاحب سے ڈرتے ڈرتے مقدمہ لکھ دیا۔ اور طبع بھی کرا لیا۔ مگر میں نے وہ طبع شدہ فرمہ مولانا موصوف کے پاس ڈابھیل ارسال کر دیا کہ ہم نے ضرورت سے مجبور ہو کر ایسا کر دیا ہے، لیکن آپ ناپسند کریں تو میں اس کو شائع نہ کروں گا۔ اس پر مولانا کا جواب آیا کہ تم نے اچھا کیا، اور اس کو شائع کرنے پر مجھے اعتراض نہیں ہے۔

حضرت مولانا نے **کلمة الشکر** لکھ کر ارسال فرمایا، وہ بھی ہم نے ٹائٹل سے اگلے صفحہ پر فہرست مضامین سے قبل شائع کر دیا اس کے بعد ہم لوگ ڈابھیل واپس ہوئے۔ اور عرصے تک ہم لوگ ساتھ رہے۔ حضرت مولانا مرحوم نے کبھی کوئی ناگواری کا اظہار مولانا بنوریؒ کے مقدمہ کے بارے میں نہیں کیا۔ پھر یہ کہ حضرت مولانا نے خود بھی اپنے مقدمہ میں مندرجہ ذیل امور کا اعتراف فرمایا ہے۔

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ درس میں بہت تیزی سے بولتے تھے، جس کی وجہ سے مجھ کو آپ کی مراد ومقصد کے سمجھنے اور ضبط کرنے میں سخت دشواری پیش آتی تھی، کیونکہ اس کیلئے جید حفظ، مکمل تیقظ حدید نظر، سریع قلم، سیال ذہن وبالغ فکر کی ضرورت تھی جو کم کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

(۲) کبھی ہم آپ کے کلام کی طرف پوری توجہ کرتے تھے تو املاء رہ جاتا۔ اور کبھی کتابت کی طرف توجہ کرتے تو آپ کی بات پوری طرح نہ سن سکتے تھے۔

(۳) میں نے مقدور بھر سعی کی کہ آپ کی پوری بات ضبط کر لوں، مگر یہ بات میرے مقدور سے باہر رہی۔ اس لئے بہت سی اہم باتیں ضبط کرنے سے رہ گئیں، بلکہ بسا اوقات علماء اور کتابوں کے ناموں میں تصحیف اور نقل مذاہب میں تحریف بھی ہو گئی۔

(۴) مجھے بڑی تمنا تھی کہ میں اس تالیف کو حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی میں جمع کر لیتا کہ حضرتؒ اس کو ملاحظہ فرما کر اصلاح فرما دیتے مگر یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔

(۵) میری پوری سعی کے باوجود اس میں قسم قسم کی اغلاط وسہو ہو گئے ہیں۔

(۶) شواغل مدرسہ اور دوسرے افکار نے اس کی تحریر کے لئے مجھے فرصت نہیں دی۔

(۷) اگر مجھے پہلے سے اس کام کی صعوبت ومشکلات کا اندازہ ہوتا تو میں اس کا ارادہ ہی نہ کرتا۔

(۸) میں جہاراً وسراً ہر طرح سے بتا چکا ہوں کہ مجھے تمام مباحث میں رجعت اصول اور تصحیح نقول کی فرصت نہیں ملی، جبکہ اس کے لئے طویل فرصتوں کی ضرورت تھی۔ البتہ نقول صحاح ستہ کی تصحیح میں میں نے زیادہ اعتنا کیا ہے۔

(۹) میں پوری سچائی کے ساتھ یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں درس کے اندر ضبط وتحریر میں خطاؤں سے سالم نہیں رہا۔

(۱۰) اگر کہیں کسی بحث کے اندر لہجہ کی تیزی یا ترفع کی شان وغیرہ دیکھوتو اس کو صرف میری طرف منسوب کرنا (یعنی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف نہیں) کیونکہ وہ سب میری سوءِ تعبیر اور خباثتِ نفس کا اثر ہوگا۔

اوپر کی تفصیل اس لئے بھی ضروری ہوئی کہ خود حضرت مولانا بدر عالم صاحب ہی کے بیان سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و تحقیقاتِ عالیہ کی وقت وعظمت اور اس کام کی غیر معمولی دشواریوں کی تفصیل سامنے آجائے، اور حضرتؒ کے مقصد ومراد کو پوری طرح سمجھ لینا اور اداءِ مطالب پر قادر ہونا تو ایک بڑا امر مرحلہ تھا ہی، بغیر مراجعت اصول ومطالعۂ کتب کے ان مضامینِ عالیہ دقیقہ کو پیش کردینا بھی بڑا نقص تھا اور اس کا اعتراف خود مؤلف نے بھی بار بار اور جہاراً وسراًہر طرح کیا ہے۔ تو پھر یہ بات کیوں کر موزوں ومناسب تھی کہ مولانا بنوریؒ کی تنقیدِ صحیح کی عبارت کو ان کے مضمون میں سے حذف کر کے دوسری عبارات داخل کردی گئیں، جن میں ان کے مقصد ومنشا کے بالکل خلاف یہ دعویٰ کیا گیا کہ مؤلف فیض الباری کو اس کام کے لئے خدا کی طرف سے توفیق کامل حاصل ہوئی تھی اور ان کے لئے حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آسانی بھی مل گئی تھی کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علومِ عالیہ کا احاطہ کرلیں اور انہوں نے اس کام کے لئے سعی بلیغ کی اور امالی شیخ کو ضبطِ تام کیا تھا، اور انہوں نے اس کام کے لئے مصادر کی مراجعت نامہ مرۃ بعد مرۃ کی تھی۔ اور بلا شک وریب حضرتؒ کے علوم کی خدمت ان سے زیادہ اتم واکمل کوئی دوسرا تلمیذِ شیخ کر ہی نہ سکتا تھا۔

مولانا بنوریؒ نے اپنے نقد میں یہ بھی کہا تھا کہ "باوجود سعیِ شکور کے مؤلف یہ دعوے نہیں کرسکتے کہ انہوں نے حضرتؒ کے امالی و مشکلات علوم وتراجم رجال وغیرہ کو بنقیرہ وقطمیرہ جمع کرلیا ہے اور آپ کے فوائد علمیہ ونظریاتِ عمیقہ میں سے کسی کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

اس عبارت کو سراسر بدل کر یہ دعویٰ بلسان العلامۃ البنوری درج کردیا گیا کہ مؤلف نے امالی شیخ کو بنقیرہ وقطمیرہ جمع کردیا ہے۔ اور حضرتؒ کے تمام ہی مشکلاتِ علوم، تراجمِ رجال، فوائد مختلفہ ونظریاتِ عمیقہ کا احاطہ کرلیا ہے۔ حتیٰ کہ امالی شیخ میں سے کوئی کلمہ بھی بغیر احصاء وضبط کے نہیں چھوڑا۔ اور خود مؤلف نے جو اپنے مقدمہ میں (اس کے خلاف) لکھا ہے وہ محض ان کی تواضع اور کسر نفس ہے اور کچھ نہیں۔

واضح ہو کہ یہ سب حذف والحاق کی کارروائی ص ۳۱ وص ۳۲ میں موجود ہے اور مولانا بنوریؒ کا آخری مضمون سراسر بدل کر ان کا نام بھی آخر سے حذف کردیا گیا ہے، **فیا للعجب**! اس کے علاوہ حضرت المؤلف کی طرف سے جو کلمۃ الشکر کا ایک صفحہ مصری ایڈیشن میں شائع ہوا تھا، وہ بھی حذف کر کے عزیز آفتاب میاں سلمہ نے دوسرے مضمون کا کلمۃ الشکر شائع کیا ہے، تاکہ یہ امر صفحۂ تاریخ سے محو ہوجائے کہ کس کی تحریک سے یہ تالیفِ فیض الباری کا کام شروع ہوا تھا، کس ادارہ نے پہلی سرپرستی کی، معاوضہ بھی ادا کیا، اور پھر کس ادارہ نے اس کے مصارف طبع برداشت کئے، اور کس نے طباعتِ قاہرہ کے زمانہ میں اس کتاب کی اصلاحِ مضامین وعباراتِ تصحیح اصول و پروف ریڈنگ وغیرہ کی زحمتیں ۸۔۹ ماہ تک گوارا کی تھیں۔ **والی اللہ المشتکی**۔

افسوس ہے کہ مجھے یہ سب واقعات لکھنے پڑے، اور اس کا بھی افسوس ہے کہ مذکورہ بالا حذف والحاق وغیرہ امور کا ارتکاب یا مشورہ دینے والے حضرات نے صرف حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحبؒ کے تعلق وعقیدت کا تو لحاظ کیا اور حضرت شاہ صاحبؒ کی غیر معمولی عظمت واہم علمی مقام کو نظر انداز کردیا، جن کے بارے میں علامۂ محقق شیخ کوثریؒ نے فرمایا تھا کہ پانچ سو سال کے بعد شیخ ابن الہمامؒ کے بعد ایسا جامعِ علوم وکمالات محقق پیدا ہوا اور حضرت تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک ایک جملہ پر ایک ایک رسالہ لکھا جاسکتا ہے اور وہ آپ سے مسائل مشکلہ میں آپ کی درایت وروایت دونوں سے استمداد فرماتے تھے، اور علامہ مفتی کفایت اللہؒ نے لکھا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا علم وہبی وارثی ہے، صرف کسب سے اتنا علم حاصل ہونا بہت مستبعد ہے، اور حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فرمایا تھا کہ آپ کی وفات سے ہم جیسے علمی اشتغال رکھنے والے بھی یتیم ہوگئے۔ اور فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا رسالہ **کشف الستر** سترہ بار

پڑھا تب معلوم ہوسکا کہ آپ نے کن کن مشکلاتِ علوم کو حل فرمادیا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحبؒ کی عظمت وشخصیت وکمالات سے میں خوب واقف ہوں، ۱۹ سال ہم ڈابھیل میں ساتھ رہے ہیں، ساتھ کھانا پینا اور طویل علمی مجلسیں رہی ہیں، درس وارشاد میں وہ اعلیٰ خصوصیات کے مالک تھے، مگر تصنیف وتالیف کے میدان میں خاص طور سے جہاں سینکڑوں کتابوں کی مراجعت درکار ہوتی ہے، وہ بہت آگے نہ آسکے۔ حضرتؒ کے رواں دواں درسِ امالی کو پوری طرح حفظ وضبط میں بھی نہ لاسکے، اور تراجمِ رجال میں بھی غلطیاں ہوگئیں، جبکہ حضرتؒ کے یہاں اس قسم کی غلطیاں تقریباً ناممکن تھیں۔ برخلاف ان کے مولانا بنوریؒ تھے وہ درس کے ساتھ تصنیف کے بھی مردِ میدان تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ان کو حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں ۴۔۵ بار ترمذی وبخاری میں شرکت کا موقع مولانا سید بدر عالم صاحب کی طرح مل سکتا تو وہ حضرتؒ کے علوم کی وہ خدمت کرجاتے کہ باید وشاید، مگر افسوس ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے صرف کچھ حصہ ترمذی شریف کا اور چند اوراق بخاری شریف کے پڑھ سکے تھے، اور وہ سال حضرتؒ کی طویل علالت کے سبب سب سے کم درسِ حدیث کا سال تھا۔

وجہ یہ کہ وہ تمام علوم وفنون سے غیر معمولی مناسبت کے ساتھ مطالعۂ کتب کے بھی بڑے عاشق وعادی تھے، مطالعہ کا شوق مجھے بھی تھا مگر وہ مجھ سے بہت آگے تھے، تاہم مجھے کہا کرتے تھے کہ یہ سب پڑھ پڑھ کر کنویں میں ڈال رہے ہو، کچھ تصنیف بھی کیا کرو۔ مگر نہ میری اس وقت اس کی طرف نہ توجہ تھی اور نہ "مجلسِ علمی" کی انتظامی مشغولیات اس کی مہلت دیتی تھیں، بہت عرصہ کے بعد جب "مجلسِ علمی" کا تعلق ختم کرکے ہندوستان میں ہی مستقل قیام کا عزم ہوگیا تو اپنی قدیم یادداشتوں کو دیکھنا شروع کیا، اور اپنی دو سال کی درسِ بخاری شریف کی املائی تقاریرِ انوری کو انوارالباری کی شکل میں لانے کا خیال پیدا ہوا۔ وللہ الحمد۔

میرے نہایت ہی محترم ومحسن مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی ثم افریقی" جو مجھے مجلسِ علمی کراچی میں بھی رکھنے پر بہت مصر تھے اور اپنی طرف سے میرے اہل وعیال کے لئے مکان بھی تجویز کردیا تھا جو بعد کو بھی کئی سال تک میری امید پر روکے رکھا مگر میں ترکِ وطن پر آمادہ نہ ہوسکا تھا۔ ان کو جب مقدمۂ انوارالباری کی دونوں جلدیں پہنچیں تو مجھے مبارکباد دی اور "مجلسِ علمی" چھوڑنے پر بڑے افسوس کا اظہار کیا، اور تاکید کی کہ انوارالباری میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم وتحقیقات کو خوب اجاگر کرنا، پھر انوارالباری کی توسیع اشاعت کے لئے بھی سعی فرمائی، مگر افسوس ہے کہ اس کے بعد ان کی رحلت جلد ہوگئی، اور وہ بعد کے حصے ملاحظہ نہ کرسکے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جس طرح حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحبؒ کو توجہ دلا کر فیض الباری کی تالیف وترتیب پر احقر نے آمادہ کیا اور مولانا سملکیؒ کو اس کی اشاعت کے لئے ترغیب دی، جبکہ وہ خود مولانا موصوف کی تحریک پر بھی آمادہ نہ ہوسکے تھے، اسی طرح احقر نے محترم مولانا بنوری کو جامعہ ڈھابھیل میں بلانے کی سعی کی، اور العرف الشذی کو معارف السنن کی صورت میں بدلنے کا کام مجلسِ علمی کے لئے کرایا، چنانچہ مولانا نے اس کا کام زیادہ تر ڈابھیل ہی میں کیا تھا، اور پھر کراچی میں دوسری مصروفیات کے سبب سے تصنیفی خدمت کا وقت نہ نکال سکے۔ یہ کام چونکہ مراجعتِ اصول اور وسیع مطالعہ کے ساتھ ہوا تھا، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے تمام امالیِ درس پر برتر وفائق ہوا ہے۔ اور حضرتؒ کی حیات مبارکہ کے زمانہ میں آپ کے امالیِ درسِ ترمذی شریف "العرف الشذی" نے بھی علوم انوریہ کا تعارف اعلیٰ پیمانہ پر کرادیا تھا، اگرچہ اس میں ضبط وکتابت وطباعت کی خامیاں بھی تھیں، پھر بھی اس سے بہت بڑا فائدہ ہوا، اور محققانہ درسِ حدیث کا ایک نہایت گراں قدر اعلیٰ نمونہ سامنے آیا، جس سے سب ہی اساتذۂ حدیث نے استفادہ کیا۔ یہ تالیف محترم مولانا محمد چراغ صاحب دام فیضہم کی سرسری محنت کا نتیجہ تھی، جس سے ان کا علم وفضل اور حدیثی مناسبت وتفوق نمایاں ہے اور اگر ان کو اسی زمانہ میں دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی میں حضرت شاہ صاحبؒ کی نگرانی کا شرف مل جاتا کہ وہ مراجعتِ اصول ومطالعۂ کتب کے ساتھ العرف الشذی کو شرح ترمذی شریف کی صورت میں تالیف کردیتے، تو یہ نہایت ہی گرانقدر

علمی حدیثی خدمت ہو جاتی۔ کاش مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدیر دارالعلوم کی توجہ دوسرے امور سے زیادہ اس طرف ہوتی۔

انوار المحمود: اس کے بعد دوسری خدمت حدیث امالی ابی داؤد کی صورت میں ظاہر ہوئی کہ مولانا ابوالعتیق محمد صدیق صاحب ساکن نجیب آباد ضلع بجنور نے انوار المحمود کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ ابی داؤد کے امالی مرتب کر کے شائع کئے، جس کا حصہ اول حضرت شاہ صاحبؒ کے ملاحظہ سے بھی گزرا تھا اور آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ "انوار المحمود" کو بعض بعض جگہ سے بغور دیکھا، عبارتی اور مضمون کی غلطی سے مبرا پایا اور یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ میری مراد کو سمجھ کر صحیح عبارت میں ادا کیا گیا ہے، اور اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان عباراتِ شارحینِ شروح سے لی جائیں۔ خلافِ امید اتنا بڑا کام باوجود مشغلۂ درس و تدریس کے جو تم نے انجام دیا ہے، اس سے بے حد مسرت ہوئی، فجزاکم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء فی الدارین، اللہ تعالیٰ وقت و ہمت میں برکت عطا فرمائے۔ میری رائے ہے کہ اس کو اسی طرح جلد طبع کرادیا جائے اس سے طلباء کو العرف الشذی سے بہت زیادہ فائدہ ہوگا، اور جو اس میں خامی تھی وہ بھی رفع ہوگئی، صرف اس کا لحاظ بہت زیادہ کیا جائے کہ کتابت کی غلطیاں نہ ہونے پائیں۔ تم خود اس کو طبع کراؤ میں بھی ان شاء اللہ مدد دوں گا اور بعض مخلصین سے بھی امداد کے متعلق کہا ہے۔ محمد انور عفا اللہ عنہ۔

مؤلف انوار المحمود نے لکھا کہ صرف جلد اول حضرتؒ کے مطالعہ کے لئے گئی تھی اور وہ بھی طبع نہ ہو سکی تھی کہ روحِ انور عالم بالا کو پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی طباعت میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کھلی کرامت ہے ورنہ یہ کام میری استطاعت سے بالکل باہر تھا۔"

اس کتاب میں نہایت محققانہ محدثانہ ابحاث ہیں، ضرورت ہے کہ مجلسِ علمی کراچی یا ارباب دارالعلوم علامہ بنوری کراچی اس طرف جلد خصوصی توجہ کریں اور مزید تحقیقات و حوالوں سے مزین کر کے اس کو شرح ابی داؤد کی صورت میں شائع کرادیں۔

درحقیقت جو محدثانہ تحقیقی رنگ حضرت شاہ صاحبؒ کا ہے، وہ دوسری تالیفات میں کمیاب ہے اور اگر جلد ایسے اہم کاموں کی طرف توجہ نہ دی گئی تو آئندہ ان کاموں کی تکمیل کرانے والے باصلاحیت و استعداد، اساتذۂ حدیث بھی نہ رہیں گے، جس طرح احقر کی رائے ہے کہ اگر علمِ حدیث کی بڑی درس گاہوں میں تخصیصِ حدیث کا درجہ نہ کھولا گیا تو علمِ حدیث کا فن بڑی تیزی سے انحطاط پذیر ہوگا۔ کیونکہ تخصصِ حدیث کرانے والے اساتذہ اب بھی گنے چنے رہ گئے ہیں۔ وللہ الامر من قبل و من بعد۔

آخر میں مختصراً گزارش ہے کہ فیض الباری میں اب بھی بہت سی مسامحات و اغلاط ہیں۔ جن میں کچھ کی نشاندہی بھی اصحابِ تصانیف نے کی ہیں یہ بھی عدمِ مراجعت اصول اور عدمِ واقفیتِ تراجمِ رجال کا نتیجہ ہے۔ جبکہ حضرت شاہ صاحبؒ ایسی اغلاط سے مبرا تھے اور اس کی طرف ان کی نسبت کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ اس لئے پاکی داماں کی حکایت طویل کرنے سے بہتر ہے کہ مراجعاتِ اصول اور مطالعۂ تراجمِ رجال کر کے ان خامیوں کا ازالہ کیا جائے، اور اس خوش فہمی کا سہارا نہ لیا جائے کہ خود حضرتِ مؤلفؒ نے جن خامیوں کا اعتراف کر لیا تھا وہ محض تواضع و کسرِ نفسی تھی۔ پھر یہ کہ مولانا بنوری کے مقدمہ میں جو حذف و الحاق کیا گیا ہے، اس کی معذرت شائع کی جائے، یا اس کو لکھنے والے صاحب خود اپنی طرف منسوب کریں مولانا مرحوم کا جتنا حصہ ان کو باقی رکھنا ہے اس پر ختم کر کے مولانا نے جس طرح اپنا مقدمہ ختم کیا تھا اسی طرح ختم کردیں اور اب میں اس پر ختم کرتا ہوں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

مختصر حالات سفر حرمین شریفین

اپنے رب کریم کی لاتعداد نعمتوں کا شکر کس زبان و قلم سے ادا کروں کہ سب سے پہلے اس نے میرے نہایت ہی مشفق باپ کے دل

میں یہ داعیہ پیدا فرمایا کہ مجھے دینی تعلیم دیں، اس کی جگہ وہ اگر مجھے عصری تعلیم دلاتے اور کروڑوں اربوں کی دولت بھی میرے لئے چھوڑ جاتے تو وہ ہیچ در ہیچ ہوتی، پھر تکمیل کے بعد ہی حضرت شاہ صاحبؒ کی دوسالہ معیت واستفادہ کی نعمت سے ذرہ نوازی کی گئی، جس کے صدقہ میں سولہ سال مجلسِ علمی میں رہ کر علمی دنیا سے روشناسی ملی۔ علم تو بہت بڑی چیز ہے، اور بڑوں کے ہی نصیب میں خدا نے دی ہے۔ لیکن اکابرِ امت کے علمی دروازوں میں جھانکنے کی سعادت ملنے کا اعتراف شاید بے جا نہ ہو۔ و کفی به فخر المثلی الظلوم الجهول ۔ آخری دور میں حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھا گویا تمام جبالِ علم وتقویٰ اکابرِ امت کی روشن تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی، سب سے پہلے علمی سفر رفیقِ محترم مولانا بنوریؒ کی معیت میں حرمین شریفین کا ۱۹۳۸ء میں ہوا دونوں نے حج کی درمیانی مدت مصر میں اقامت کی تھی، مصری علماء خاص کر علامہ کوثریؒ سے طویل استفادہ نعمتِ غیر مترقبہ تھا، علماء حرمین میں سے حضرت الشیخ سلیمان الصنیع رئیس هیة الامر بالمعروف والنهی عن المنکر کی طویل علمی مجالس بھی نہایت اہم تھیں۔

وہ بڑے وسیع قلب اور کثیر مطالعہ کے عالم تھے، نجدی علماء میں ایسے کم دیکھے ہیں۔ وہ اکثر اختلافی مسائل میں اکابرِ دیوبند کی آراء کو دریافت کرتے اور ان پر بحث ونظر کرتے تھے، اور ہم دونوں ان کو بقدرِ امکان تشفی کرتے تھے، آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اکثر مسائل میں اکابرِ دیوبند ہی کی رائے درست ہے اور نجدی علماء بھی وسعتِ مطالعہ کے بعد ان سے اتفاق کریں گے۔

اس کے بعد راقم الحروف کو ۶۰ء میں، پھر ۷۱ء میں پھر سفر افریقہ کے ساتھ ۱۹۷۵ء میں حج وزیارت کی سعادت ملی، اور صرف عمرے وزیارتِ مبارکہ کا شرف مئی ۸۰ء میں اپریل ۸۲ء میں اور اب سفرِ افریقہ کے بعد جنوری ۸۴ء میں حاصل ہوا۔ وللّٰہ الحمد والمنة۔ ہر سفر میں علماءِ نجد وحجاز وشام سے ملاقاتوں اور علمی مذاکرات کے مواقع میسر ہوئے اور یہ معلوم ہو کر بڑی مسرت ہے کہ تدریجی طور سے وہاں بھی وسعتِ خیال میں بڑی حد تک پیش رفت ہوئی ہے اللهم زد فزد۔

چنانچہ کئی سال قبل اکابر علماء نجد وحجاز نے باستثناءِ شیخ ابن باز کثیر مطالعہ اور بحث ونظر کے بعد متفقہ فیصلہ کیا کہ یک لفظی طلاقِ ثلاث تین ہی ہوں گی۔ ایک نہ ہوگی، یعنی اس نہایت اہم مسئلہ میں بہ مقابلۂ علامہ ابن تیمیہ وابن القیمؒ جمہور اکابرِ امت کے فیصلہ کو ترجیح دے دی گئی۔ اور اب الحمدللہ یہی حکم قلمرو نجد وحجاز میں کئی سال سے جاری ونافذ بھی ہے۔ اور یہ رجحان بھی ترقی پذیر ہے کہ اختلافی مسائل میں جمہورِ امت کے ہی مسلک کو ترجیح دی جایا کرے۔ اور درحقیقت یہی رجحان حرمین شریفین کی علمی ودینی وسیاسی مرکزیت کے لئے موزوں تر بھی ہے۔ والله ولی الامور۔

لمحۂ توقف: سابقہ دونوں سفر مئی ۸۰ء اور اپریل ۸۲ء میں عمرے کی نیت سے کئے تھے، اور زیارتِ مبارکہ گویا ضمناً تھی، لیکن اب جنوری ۱۹۸۴ء میں سفر بہ نیت زیارۃ مبارکہ نبویہ کیا گیا اور عمرہ اس کے بعد ہوا۔ ہمارے اکابر نے لکھا ہے کہ حج وعمرے کے سفر کے بعد ایک سفر خالص زیارت نبویہ کی نیت سے بھی کرنا چاہئے، اس لئے دل کا تقاضا ہوا کہ اس سعادت کو بھی حاصل کیا جائے کہ یہ سفر اشرف الاماکن وافضل البقاع علی الاطلاق کے لئے ہے، جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ کر چکے ہیں۔ بہت عرصہ قبل علامہ شیخ تقی الدین حصنیؒ م ۸۲۹ھ کی نہایت گرانقدر تالیف " دفع شبه من تشبه و تمرد و نسب ذلک الی سیدنا الامام احمد" (ص ۱۲۲) میں علامہ ابن القیمؒ کا ایک واقعہ دیکھا تھا کہ وہ جب قدس شریف گئے تو اپنی مجلسِ وعظ میں ممانعتِ سفرِ زیارت کا مسئلہ بیان کر کے فرمایا کہ لو! اب میں یہاں سے لوٹتا ہوں اور حضرتِ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کی قبر کی زیارت نہیں کروں گا۔ پھر وہاں سے نابلس گئے تو وہاں کی مجلسِ وعظ میں بھی اسی مسئلہ کو دہرا کر کہا کہ وہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی بھی زیارت نہیں کریں گے، اس پر لوگ کھڑے ہو گئے اور ان کو قتل کرنے پر آمادہ ہوئے، والی نابلس نے ان کی جان بچائی، پھر مالکی قاضی کی عدالت میں طلب کئے گئے تو اپنی بات سے رجوع ظاہر کرنے پر بری کئے گئے۔ واضح ہو کہ ان دونوں حضرات کے ساتھ ممانعتِ سفرِ زیارت کے قائل مشہور مفسر ابن کثیر بھی تھے، و لعله لا رابع لهم من اکابر الملة۔ والله تعالیٰ اعلم۔

جب ان حضرات اوران کے غالی متبعین کی ایک غلط بات کے لئے اتنی شدت ہے تو ہمیں جمہور کے صحیح مسلک کے اتباع میں اور بھی زیادہ استقلال وثابت قدمی دکھلانی چاہئے۔ واللہ الموفق۔

مؤتمر عالم اسلامی کا ذکرِ خیر

جمعیت علماءِ ہند کے مؤقر جریدۂ عربیہ "الکفاح" بابۃ ستمبر ۸۳ء، ۱۷ جلد ۱۰ میں جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز دام عزہ وسلطانہ کی وہ عربی تقریر شائع ہوئی ہے۔ جو آپ نے بموقع افتتاح مجمع عالمی للفقہ الاسلامی ۲۶ شعبان ۱۴۰۳ھ (م ۷ جون ۱۹۸۳ء) کو مکہ معظمہ میں ارشاد فرمائی، اس نہایت گراں قدر اور شاندار افتتاحی تقریر کے چند اہم نکات قابل ذکر ہیں۔

(۱) سیاسی، ملکی وانفرادی جدوجہد کی حدود سے بالاتر ہو کر یہ پہلی عالمی تنظیم ہے، جس کا مطمح نظر وحدتِ امت اسلامیہ ہے۔

(۲) یہ اس عالمی مؤتمر کی قرارداد کے نتیجہ میں منعقد کی جارہی ہے، جس کو زعماءِ عالم اسلامی نے مجمع الفقہ الاسلامی کے نام سے موسوم کیا تھا۔

(۳) جو کچھ مشکلات وآفات اور ضعف وذلت کی صورتیں مسلمانوں کو پیش آرہی ہیں، وہ صرف ضعفِ ایمان وعقیدہ اور ترک کتاب وسنت کی سزا ہے۔

(۴) میرا یقین وعقیدہ ہے کہ وحدتِ امت کی بنیاد صرف اپنے باہمی اختلافات ختم کر دینے سے ہی مضبوط ومستحکم ہو سکتی ہے، آیاتِ قرآن مجید واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا، اور ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم وغیرہ اس پر شاہد ہیں۔

(۵) نصف صدی سے زیادہ ہوا کہ ملک عبدالعزیزؒ نے پہلی مؤتمر اسلامی مکہ معظمہ میں منعقد کی تھی۔ تاکہ زعماءِ عالم اسلامی کے مشورہ سے مصالح امت پر اجتماعی غور وفکر کر کے اجتماعی فیصلے کئے جائیں۔ پھر اسی کی روشنی میں مسلمانوں کو تعلیماتِ قرآن وسنت کی طرف رجوع کرانے کی مساعی برابر جاری رہیں۔

(۶) ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی مشکلات ومسائل میں تو اضافہ ہو رہا ہے، مگر علماءِ اسلام باوجود اپنی عددی کثرت کے اپنے اختلافات کی وجہ سے اجتماعی رائے کے ذریعہ فیصلے کرنے سے عاجز ہیں لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ تمام علماءِ اسلام، فقہاء، حکماء اور مفکرین عالم اسلامی سر جوڑ کر بیٹھیں اور تمام مسائل ومشکلات کے اجتماعی حل پیش کریں۔

(۷) روحِ تعصب اسلام سے بعید ترین چیز ہے، جس سے باہم تباغض، افتراق اور فکری انتشار پیدا ہوتا ہے، اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں میں بغض وعداوت پیدا کرنے والی سب باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر یہ کہ جب صرف کتاب وسنت پر ہی پورا اعتماد ہونا چاہئے تو دینِ اسلام میں تعصب کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

(۸) آخر میں سیاسۃ السعودیہ کے عنوان سے ملکِ معظم نے فرمایا کہ حکومتِ سعودیہ نے ائمۂ مسلمین میں سے اقتداءِ سلفِ صالح کا التزام کیا ہے، اور جلالۃ الملک عبدالعزیزؒ نے حتمی فیصلہ کیا تھا کہ مذاہب اسلامیہ معتمدہ کے اندر جن مسائل میں اختلاف ہے، ان میں بھی ہیئتِ علمیہ کتاب وسنت کی روشنی میں جس حکم کو بھی قوی تر سمجھے گی، صرف اسی ایک حکم کو نافذ کیا جائے گا۔ اور ہم خیال کرتے ہیں کہ تمام بلادِ اسلامیہ میں ایک ہی جیسے احکام تمام شئونِ حیات میں موافق احکام شرعیہ نافذ ہونا ضروری ہیں کہ یہی وحدتِ اسلامیہ کا تقاضہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ مہم بہت شاق اور مرحلہ دشوار تر ہے۔ مگر خدا کے بھروسہ پر اس سمت میں آگے بڑھنے کا حوصلہ کرو گے، تو منزل ضرور آسان ہوگی، وھو الموفق۔

ضروری معروضات

جلالۃ الملک فہد طال بقاءہ کے افتتاحیہ میں جو زیادہ اہم اور مفید اجزاء ہمارے نزدیک تھے وہ افادۂ ناظرین کے لئے پیش کر دیئے

گئے، وحدتِ امت۔ جمع کلمۂ مسلمین اور مسائل ومشکلات کے اجتماعی حل کے لئے جن بہتر وموثر تر تجاویز وہدایات کی ضرورت تھی، وہ انہوں نے بڑی خوبی سے پیش کردی ہیں۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء۔ ملک موصوف عز سلطانہ نے پچاس سال قبل کی مؤتمر عالمِ اسلامی کا بھی ذکر کیا ہے جو ملک عبدالعزیز مرحوم نے ۱۳۴۴ھ (م۱۹۲۶ء) میں منعقد کی تھی۔ اس میں بھی عالمِ اسلام کے تمام زعماء نے شرکت کی تھی۔ اور جمعیت علماء ہند کی طرف سے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ تشریف لے گئے تھے، جس کا ذکر انہوں نے اپنی فتح الملہم شرح صحیح مسلم ص ۲/۲۲۳ میں کیا ہے۔ جس طرح اس وقت عصری مسائل ومشکلات کی اہمیت ہے اس وقت آثار ومقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کا مسئلہ زیادہ اہم تھا، اور اس پر کئی روز تک بحث ہوئی تھی۔ خود ملک عبدالعزیز ؒ بھی علماء داعیانِ عالم اسلامی کی مجالس میں شرکت کرتے اور ابحاث سنتے تھے۔ فیصلہ اس وقت بھی کتاب وسنت ہی پر موقوف تھا۔ لیکن مولانا کا بیان ہے کہ جب ہم نے احادیث وآثارِ صحابہ وتابعین سے تبرک بآثار الصالحین کا جواز پیش کیا تو علماءِ نجد نے قبول نہ کیا اور وہ اپنی بات تبرک بالا مکنہ والمواضع کو بدعت وغیر مشروع ہی ماننے پر مصر رہے۔ اور ملک کو اس طرف متوجہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں کچھ نہیں جانتا، آپ ہمارے علماء کو مطمئن کردیں۔ چنانچہ تمام آثار متبرکہ کو تدریجاً تقریباً ختم کردیا گیا۔ اور ایسے امور میں اب تک بھی غیر ضروری تشدد اور تعصب کی شان موجود ہے، اس وقت شیخ الاسلام عبداللہ بن بلیہد پیش پیش تھے، تو اس دور میں شیخ ابن باز، آگے آگے ہیں۔ افسوس ہے کہ اب حضرت علامہ عثمانیؒ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث اور علامہ بنوریؒ ایسے کثیر المطالعہ محققین اصحابِ علم وفضل اور جرأت مندانہ اظہارِ حق کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہ حضرات علماء سعودیہ پر بھی دلائل کے ساتھ برابر اتمامِ حجت کرتے رہے، ان کے برعکس اس دور میں کم سواد "متاعِ قلیل" کے حریص اور اخفاءِ حق کے مریض زیادہ ہیں۔ والی اللہ المشتکی لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

ابھی چند سال قبل یک لفظی طلاقِ ثلاث کی بحث علماءِ نجد وحجاز کے سامنے آئی تو سب نے جمہور کے مسلک کو راجح تسلیم کرلیا شیخ ابن باز نے اس سے اختلاف کیا، درود شریف میں سیدنا کے استعمال کے خلاف بھی ان کا تشدد بدستور ہے۔

یہاں اس واقعہ کی یاد دہانی مناسب ہوگی کہ جلالۃ الملک عبدالعزیز، مفتی مدینہ منورہ اور مولانا خلیل احمد صاحب مسجد نبوی میں ایک ساتھ بیٹھے تھے، اور درود شریف میں سیدنا کے استعمال کو اس وقت بڑی شد ومد سے بدعت کہہ کر روکا جارہا تھا۔ مولاناؒ نے حدیث انا سید ولد بنی آدم پیش کی تھی، اس پر جلالۃ الملک نے مفتی صاحب کو کہا کہ جب ایک جگہ ثابت ہوگیا اور دوسری کسی جگہ ممانعت نہیں آئی تو پھر اتنی سختی کیوں کی جارہی ہے؟ اس پر مفتی صاحب ونجدی علماء خاموش ہوگئے تھے لیکن اس زمانہ کے مفتی صاحب شیخ ابن باز کو اب بھی لفظِ سیدنا کے بدعت وممنوع ہونے پر اصرار ہے۔

ضرورت ہے کہ ملکِ معظم علماءِ نجد کے اس قسم کے تشدد وتعصب کو ختم کرائیں، علامہ ابن تیمیہؒ کی عظمت وجلالت قدر کو ہم بھی مانتے ہیں اور ان کی گراں قدر علمی خدمات بھی مسلم ہیں مگر ان کے سینکڑوں تفردات سے بھی قطعِ نظر نہیں کی جاسکتی۔ خصوصاً جب کہ ان کے تفردات اصول وعقائد کے اندر بھی ہیں اور بہت سے وہ مسائل بھی ہیں جن میں انہوں نے ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا بھی خلاف کیا ہے، جس طرح طلاقِ ثلاث کے مسئلہ میں ان کا تفرد جمہور کے خلاف تھا۔

تو کیا ملک موصوف کے سامنے ایسی کوئی تجویز نہیں ہے کہ جمہور سلف وخلف کے خلاف جتنے بھی مسائل ہیں، ان سب پر ہی بحث وتحقیق ہو اور جو مسلک کتاب وسنت وآثارِ صحابہ وتابعین کی روشنی میں سب سے زیادہ قوی ہو اور ظاہر ہے کہ وہ طلاقِ ثلاث کی طرح جمہور کا ہی مسلک ہوسکتا ہے، اس کو ہی راجح قرار دینے پر سب اتفاق کرلیں۔ پھر بھی اگر شیخ ابن باز ایسے متشدد نہ مانیں یا اختلاف کریں تو ان کو نظر انداز کیا جائے۔

ہم حنفی شافعی وغیرہ کے تعصب، تشدد وتنگ نظری کو پسند نہیں کرتے، اور ہمیں جلالۃ الملک عبدالعزیز مرحوم ومغفور کی اس رائے سے کلی اتفاق

ہے کہ جو حکم بھی کتاب وسنت کے لحاظ سے اقویٰ ہو صرف اسی کو قبول ونفاذ کا درجہ حاصل ہو۔اور اسی طرح وحدتِ امت اور جمع کلمہ کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ جس طرح علماء داعیانِ نجد وحجاز کی ہیئت علمیہ کے سامنے طلاقِ ثلاث کا مسئلہ آیا تھا، اس کے سامنے دوسرے بھی اہم مسائل ضرور ہونگے، اوران کے متفقہ یا کثرتِ رائے کے فیصلے جلد جلد ہمارے سامنے آتے رہیں گے۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز۔**

بظاہر علامہ شیخ سلیمان الصنیع مرحوم کی ۳۸ء کی پیش گوئی، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں پوری ہونے کا وقت آچکا ہے ورنہ سعودی علماء کی ہیئت علمیہ طلاقِ ثلاث کے بارے میں تقریباً اتفاق رائے سے (کہ صرف شیخ ابن باز نے خلاف کیا) جمہور کے مسلک کو جو علامہ ابن تیمیہؒ کے خلاف ہے، ہرگز ترجیح نہ دے سکتے۔اور ''بریں مژدہ گرجاں فشانم رواست''

ہیئت علمیہ سعودیہ کی خدمت میں ایک سوال

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ سفرِ زیارت نبویہ کے بارے میں سعودی علماء کا کیا موقف ہے؟ آیا وہ علامہ ابن تیمیہؒ کی وجہ سے سفرِ معصیت کہتے ہیں یا جمہور کے اتباع میں جائز مانتے ہیں، مسندِ امام احمدؒ میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے حدیث مروی ہے کہ ''شدرحال یعنی سفر کسی مسجد کی طرف نماز پڑھنے کے ارادہ سے نہ چاہئے، بجز مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور میری اس مسجد کے اس حدیث پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ'' یہ حدیث شدِ رحال والی دوسری مشہور حدیث کیلئے تفسیر بن سکتی ہے، جس سے بعض حضرات نے سفرِ زیارتِ نبویہ تک کو بھی ممنوع سمجھ لیا ہے لہٰذا اس حدیث سے مشاہدو مقابر کی طرف سفر کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی، خاص طور سے جبکہ اس میں کوئی دوسرا مفسدہ، اور خرابی بھی نہ ہو۔ (الطرائف والظرائف)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت امام احمدؒ تو خود اس حدیث کے راوی ہیں، جس سے صرف دوسری مساجد کی طرف سفر کی ممانعت ہے، اسی لئے ان سے یا دوسرے آئمہ مجتہدین ومحدثین وفقاءِ مذاہب اربعہ وغیرہم سے ممانعتِ سفرِ زیارۃ منقول نہیں ہے۔ بلکہ علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم سے قبل وبعد کے اکابر امت اور جمہور سلف وخلف سے بھی سفرِ زیارت کا معصیت ہونا ثابت نہیں ہے۔

لہٰذا جلالۃ الملک عبدالعزیز مرحوم ومغفور اور جلالۃ الملک فہد بن عبدالعزیز کی رائے کے مطابق ہیئت علمیہ سعودیہ کو طلاقِ ثلاث کی طرح اس مسئلہ کو بھی جمہور کے قوی مذہب کے مطابق طے کرا کر اعلان کر دینا چاہئے، تاکہ ایک بہت بڑی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ ولہم الاجر۔

نجد وحجاز کی یونیورسٹیاں

اس سفرِ زیارت طیبہ میں مدینہ طیبہ، مکہ معظمہ اور جدہ کی یونیورسٹیاں بھی دیکھنے کا موقع ملا اور خاص طور سے لائبریریاں دیکھیں، جو نہایت ہی شاندار ہیں عرصہ ہوا ترکی اور مصر کے کتب خانے دیکھے تھے، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مشہور آزاد لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، اور پٹنہ ورام پور کی لائبریریاں بھی دیکھیں مگر حکومتِ سعودیہ کی اس بارے میں پیش رفت لاجواب ہے دینی وعصری علوم کی یونیورسٹیوں پر اربوں روپے خرچ کئے جارہے ہیں۔ متعلمین ومعلمین وانتظامیہ وغیرہ پر بے دریغ رقوم صرف ہوتی ہیں۔ یہ سب دیکھ کر قدم قدم پر حکومتِ سعودیہ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، پھر سب سے بڑا کارنامہ جس کی نظیر ساری دنیائے اسلام میں نہیں ہے یہ کہ ہر یونیورسٹی میں لڑکوں اورلڑکیوں کے لئے بالکل الگ الگ انتظام ہے، مخلوط تعلیم کہیں نہیں ہے۔اس کی وجہ سے مصارف ڈبل ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ہر شعبہ میں اعلیٰ معیار کی معلمات کا مہیا کرنا بہت دشوار ہے۔ مگر اس دشواری کو بھی حل کر دیا گیا ہے اور اگر کہیں کسی شعبہ کے لئے معلّمہ نہیں مل سکی تو اس کا نہایت معقول انتظام یہ کیا ہے کہ مردانہ یونیورسٹی کا معلم ٹی وی پر درس دیتا ہے، جس کو زنانہ یونیورسٹی کی طالبات اسی طرح سنتی ہیں جس طرح سامنے معلم موجود ہو، اور ہر طالبہ کے پاس فون ہوتا ہے، جس کے ذریعہ وہ استاذ سے سوالات کرتی ہیں اور معلم وہاں سے جواب ٹی وی پر ہی دے دیتا ہے۔ کیا اس میں اربابِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لئے کوئی لمحۂ فکریہ ہے؟ کہ وہاں نہ صرف مخلوط تعلیم ہے بلکہ مخلوط اجتماعات

بھی کرائے جاتے ہیں۔ کیا اسلامی کردار یہی ہے؟

بجنور جیسی چھوٹی جگہ میں دو ڈگری کالج ہیں۔ ایک میں مخلوط تعلیم ہے۔ دوسرے میں صرف لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں اور معلمات بھی عورتیں ہیں۔ غیرت مند مسلمانوں کو اس سے سبق لینا چاہئے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے اقلیتی کردار کی مانگ کرنے والے سوچیں کہ وہ خود کس راہ پر چل رہے ہیں، کیونکہ بہت سے مسلمان بھی کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اور ایک جگہ پر تعلیم حاصل کرنا ہی ترقی کا زینہ ہے۔ یقیناً حکومتِ سعودیہ کا یہ کارنامہ قابلِ صد مبارکباد ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ حکومتِ سعودیہ کا عام نظم ونسق خاص طور سے سالانہ حج کے موقع پر عظیم تر وغیر معمولی انتظامات نہایت عالی شان یونیورسٹیاں نشر واشاعت کے علمی ادارے، طویل وعریض، اعلیٰ معیار کی سڑکوں کا جال، ٹریفک پر مکمل کنٹرول، ہر قسم کی ضروریات کی فراوانی و ارزانی، مسجد حرام اور مسجدِ نبوی کے خصوصی واعلیٰ انتظامات، ہر بات محیر العقول اور دادطلب ہے۔ **اللھم زد فزد۔**

ریاض وطائف دیکھنے کا ہر مرتبہ اشتیاق ہی رہا۔ حج وعمرے کے لئے سعودیہ جانے والوں کے واسطے دوسرے مقامات پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور کوشش پر بھی کامیابی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔

ایک بڑی تکلیف اس سے ہوتی ہے کہ حرمین شریفین کیلئے ہجرت کا دروازہ بند ہے۔ بعض لوگ بیس بیس سال سے وہاں اس امید پر وقت گزار رہے ہیں کہ حکومتِ سعودیہ ان کو مستقل اقامہ کی اجازت دے گی، دوسرے یہ کہ وہاں کے اعیان میں تو کم مگر علماء میں تشدد وتعصب زیادہ پایا جاتا ہے۔ خدا کرے اس سرزمینِ مقدس میں کوئی بات بھی کسی کے لئے تکلیف وشکایت کی باقی نہ رہے۔ **واللہ ولی الامور۔**

سفرِ پاک: ۱۱ دسمبر ۱۹۸۰ء کو لاہور پہنچا۔ اور ۲۷ جنوری ۱۹۸۱ء کو پاکستان سے واپسی ہوئی۔ اس سفر میں لاہور سرگودھا اور کراچی کے مقیم عزیزوں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں اور جن شہروں میں علماء واعیان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا، وہ حسب ذیل ہیں۔

لاہور کے طویل قیام میں حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب خلیفہ حضرت مدنیؒ وشیخ الحدیث جامعہ مدینہ، کریم پارک راوی روڈ کی علمی و روحانی مجالس سے اہم استفادات کا موقع میسر ہوا۔ بخاری شریف کا درس محققانہ محدثانہ رنگ میں دیتے ہیں، مطالعہ نہایت وسیع ہے اور نہایت گرانقدر علمی وحدیثی یادداشتیں جمع کی ہیں، جو طبع ہو جائیں تو اہلِ علم کو نفع عظیم حاصل ہوگا۔ نہایت متواضع خلقِ مجسم اور خمول وخلوت پسند ہیں۔

ان کے جامعہ میں دوسرے اساتذہ بھی اصحاب فضل وکمال جمع ہیں۔ لاہور کے جامعہ اشرفیہ میں حاضر ہوا، احقر کے استاذِ معظم مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالمالک صاحب اس کے شیخ الحدیث ہیں۔ یہ جامعہ بھی گرانقدر عظیم علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

گوجرانوالہ میں مدرسہ نصرۃ العلوم کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر دام فیضہم اور مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں بڑا علمی ادارہ قائم ہے۔ جس میں مکمل درسِ نظامی کے علاوہ شعبۂ تالیف ونشر واشاعت بھی عظیم الشان خدمات انجام دے رہا ہے اور مولانا صفدر صاحب کے درسِ حدیث اور علمی وحدیثی تالیفات کی شہرت ومقبولیت پورے پاکستان میں ہے۔

محترم مولانا محمد چراغ صاحب دام ظلہم مؤلف ''العرف الشذی'' کے مدرسہ عربیہ میں بھی حاضر ہوا، اور آپ کی نیز دوسرے ارکان و اساتذہ کی ملاقات واکرام سے مشرف ہوا۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ بخاری شریف کی مختصر عربی تقریر بھی عنایت فرمائی، جس سے مستفید ہوا۔ **جزاھم اللہ خیر الجزاء۔**

ساہیوال کے جامعہ رشیدیہ میں حاضر ہوا۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب شیخ الجامعہ، حضرت العلامہ مولانا غلام رسول صاحب صدر المدرسین دام ظلہم حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب ناظم اعلیٰ جامعہ ومدیر محترم ''الرشید'' اور دوسرے اساتذہ کی تشریف وشفقتوں سے ممنون ہوا اور علمی حدیثی وتالیفی خدمات سے دل نہایت متاثر ہوا **بارک اللہ فی مساعیھم۔**

فیصل آباد (لائلپور) میں محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ کے برادرِ مکرم مولانا محمد یحییٰ صاحب مہتمم مدرسہ اشرف المدارس کی خصوصی دعوت پر حاضر ہوا۔اور حضرت مولانا غلام محمد صاحب صدر مدرس ودیگر اساتذہ سے بھی نیاز حاصل ہوا۔

مدرسہ تعلیم الاسلام سنت پورہ میں حضرت مولانا محمد انوریؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن انوری مہتمم مدرسہ اور دوسرے صاحبزادگان واساتذہ سے ملاقاتیں رہیں۔

مدرسہ علوم عربیہ وتجوید وحفظ میں بھی حضرت مولانا نذیر احمد صاحب شیخ الحدیث جمال احمد صاحب صدر مدرس اور حضرت مولانا محمد ظریف صاحب ناظم تعلیمات کی دعوت پر حاضری ہوئی۔محترم جناب مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب نے نہایت پر تکلف کھانے کی دعوت دی،جس میں سب اساتذہ اور دوسرے اعیان شریک ہوئے۔

سرگودھا میں قیام عزیز قمرالحسن نقوی سلمہ کے پاس رہا،مولانا سیف اللہ صاحب پانی پتی۔خطیب جامع مسجد بلاک ۲۳ اور مولانا حکیم نیاز احمد صاحب کرنالی سے اکثر ملاقاتیں اور علمی مجالس رہیں،باوجود علمی ودرسی مشغلہ نہ ہونے کے دونوں حضرات اسلامی علوم وفنون کا بڑا مطالعہ رکھتے ہیں۔اور حکیم صاحب کی نظر حدیث ورجال پر بھی بہت وسیع ہے،مولانا موصوف نے ایک عصرانہ کا بھی اہتمام کیا،جس میں وہاں کے بہت سے اکابر اعیان وعلماء نے شرکت کی،گرانقدر علمی مذاکرات ہوئے،ان سب حضرات نے انوارالباری کے سلسلہ میں بھی حوصلہ افزائی کی اور توسیع اشاعت کے لئے مفید مشورے دیئے۔چند حضرات کے نام یہ ہیں۔

مولانا حکیم عبدالغفور صاحب مہتمم مدرسہ تعلیم القرآن سٹی گراؤنڈ سرگودھا،مولانا قاری جلیل الرحمٰن صاحب خطیب جامع مسجد گول چوک،مولانا صالح محمد صاحب مدرس جامعہ سراج العلوم بلاک ا،مولانا سید محمد حسین شاہ صاحب صدر مدرس ضیاء العلوم۔مولانا قاری شہاب الدین صاحب مہتمم مدرسہ امینیہ مولانا برکت علی صاحب،مولانا محمد یوسف صاحب خطیب جامع مسجد نیو پنجاب سوپ فیکٹری،مولانا قاری عطاء الرحمٰن صاحب مدرسہ اشرف العلوم۔مولانا وقاراللہ صاحب ناظم مدرسہ انوار العلوم مولانا عبداللطیف صاحب خطیب جامع مسجد چوک، مولانا پیر محمد صاحب خطیب بی اے ایف کالج،مولانا ضیاء الحق ناظم ضیاء العلوم میاں محمد عارف صاحب مسلم بازار،کراچی میں عزیزوں سے ملاقاتیں رہیں اور قیام حضرت مولانا بنوریؒ کے دارالعلوم نیو ٹاؤن میں عزیز مکرم مولانا سید محمد میاں خلفِ ارشد علامہ بنوریؒ کے پاس رہا۔ دارالعلوم کوتو مولانا بنوریؒ کی زندگی میں بھی ۱۹۷۵ء کے ایک روزہ قیام میں دیکھا تھا،اب اکابر اساتذہ،مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی صدر مدرس،مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی،مولانا مفتی احمد الرحمٰن صاحب،مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی،مولانا محمد حبیب اللہ مختار،مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی مدیر بینات ودیگر اساتذہ کرام سے ملاقاتیں رہیں،مولانا محمد طاسین صاحب ناظم مجلس علمی،کراچی سے بھی نیاز حاصل ہوا۔سب حضرات کی پرخلوص پذیرائی اور شفقتوں کا ممنون ہوں۔

تدریس وتربیت کا معیار بہت بلند ہے،درجۂ تخصص بھی قائم ہے۔جس میں نوطلبہ فقہ میں اور ایک حدیث میں تخصص کررہے ہیں۔ محترم مولانا نعمانی عم فیضہم اسی درجہ کے استاذ ونگراں ہیں۔میں نے گزارش کی کہ مولانا بنوریؒ کے جامعہ میں صرف ایک طالب علم کا درجۂ تخصص حدیث میں ہونا موجب تعجب ہے،یہاں تو کم سے کم دس طالب علم اس میں ہوتے،کیونکہ حدیث کا تخصص تمام دوسرے تخصصات سے زیادہ اہم اور مشکل بھی ہے،پھر یہ کہ کچھ دنوں کے بعد تخصص کرانے والے کامل الفن محدثین بھی نہ رہیں گے۔

جامعہ مدینۃ لاہور،جامعہ ساہیوال اور دوسرے جامعات کے اکابر کو بھی میں نے توجہ دلائی کہ اس فنِ حدیث کا بقاء صحیح معنے میں بغیر تخصص کا درجہ قائم کئے نہ ہو سکے گا،جس کے لئے بہت وسیع مطالعہ اور فنِ رجال وغیرہ سے پوری واقفیت ضروری ہے۔صرف دورہ کے سال کی رواں دواں تعلیم محدث بننے کے لئے کافی نہیں ہے۔

پہلے علماءِ دیوبند کے درس میں بھی تفقہ فی الحدیث اور نصرتِ فقہ حنفی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی، رجال وطبقاتِ رواۃ، عللِ حدیث وطرقِ حدیث کی تحقیق کا اعتناء کم تھا، حالانکہ قدماء محدثین کے یہاں ان سب امور کی بھی مزاولت اور بحث وتمحیص ضروری تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے دیکھا کہ اب قدماء کے ہی طریقہ کو اختیار کرنا پڑے گا، ورنہ معاندینِ حنفیہ غیر مقلدین وغیرہم کے جا وبے جا اعتراضات کی جواب دہی نہ ہو سکے گی۔

یہ وہ وقت تھا کہ غیر مقلدین کے سرخیل نواب صدیق حسن خاں اور میاں نذیر حسین صاحب دہلوی اور ان کے تلامذہ نے مشہور اختلافی فروعی مسائل کا فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین وغیرہ پر رسائل لکھ کر حنفیہ کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا تھا اور ان کے ذیل میں رواۃ ورجال اور طرقِ روایت وطبقات کی بحثیں زندہ کر دی تھیں۔ اس وقت مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ ان کے پاس قدماء کی بھی کتابیں تھیں، بڑا کتب خانہ تھا، مگر بقول علامہ کوثریؒ انہوں نے غیر مقلدین کی درازلسانیوں اور مغالطہ آمیزیوں سے مرعوب ومتاثر ہو کر بعض مسائلِ حنفیہ کا ضعف تسلیم کر لیا تھا جس سے غیر مقلدین کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان سب حالات کے پیشِ نظر درسِ حدیث کا طریقہ بدلا اور احادیثِ احکام پر رواۃ کی جرح وتعدیل اور طرق ومتونِ حدیث کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی، تاکہ جھوٹوں کو گھر تک پہنچایا جا سکے اور آپ کا درس قدیم محدثین کے طرز پر شروع ہو گیا جس میں بال کی کھال نکالی جاتی تھی، حضرتؒ کا مطالعہ بہت وسیع اور حافظہ بے نظیر تھا۔

بقول علامہ بنوریؒ امام طحاوی حنفی بڑے ہی وسیع النظر محدث ہیں، ہر موضوع پر اتنا مواد اور ذخیرہ احادیث وآثار کا پیش کر دیتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے، اور انہوں نے اتنا سامان دلائل حنفیہ کا جمع کر دیا ہے کہ وہ بہت کافی ووافی ہے تاہم چند مباحث میں جو کمی نظر آتی ہے، اس کی تکمیل حضرت شاہ صاحبؒ نے فرما دی ہے۔ اس لئے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ امام طحاوی کے بعد ایک ہزار سال تک کوئی ان کے درجے کا محدث حنفی نہیں آیا جس نے ان کے علوم پر اضافہ کیا ہو بجز حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے ان کے یہاں بہت سے اضافے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اصولِ حدیث میں بھی اضافے کئے ہیں۔

غرض حضرتؒ کا محققانہ محدثانہ رنگ قدماءِ محدثین سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، مجھے یاد ہے کہ مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند جو خود بھی بڑے محدث وشارح کتبِ حدیث ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کا محدثانہ محققانہ رنگ دوسرے اکابرِ دیوبند وسہارنپور کی حدیثی تالیفات وشروح سے ممتاز ہے۔ اور آپ کے رسائل فاتحہ خلف الامام، نیل الفرقدین، کشف الستر وغیرہ اس پر گواہ ہیں۔

بات لمبی ہو گئی، کہنا یہ تھا کہ اب حضرت شاہ صاحب ایسے محقق تو درسِ حدیث دینے والے ملنے بہت مشکل ہیں، اور ان کا محققانہ طریق درس حدیث اختیار کئے بغیر کام چلے گا بھی نہیں، اس لئے اس کمی کی تلافی صرف درجہ تخصصِ حدیث قائم کرنے سے ہی ہو سکے گی۔ پھر یہ کام صرف مطالعہ سے اور بغیر کامل الفن استاذِ حدیث کی تربیت ونگرانی کے بھی نہیں ہو سکتا اس لئے جلد سے جلد اس کی طرف توجہ ضروری ہے۔

دارالعلوم کورنگی کراچی میں بھی حاضری ہوئی۔ یہ بھی بہت بڑا جامعہ عربیہ اسلامیہ ہے، جو حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کا قائم کردہ ہے۔ آپ کے دو جلیل القدر صاحبزادے مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی استاذِ حدیث اور مولانا محمد تقی عثمانی استاذِ حدیث ورکنِ اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان اس کے سرپرست ومنتظم ہیں۔

اس جامعہ کا رقبہ ۱۵۶ ایکڑ ہے۔ اساتذہ کے لئے بیس مکانات تعمیر کئے گئے ہیں، کتب خانہ کی بہت عالی شان عمارت زیرِ تعمیر ہے، اور کتب خانہ کے لئے نہ صرف مطبوعہ کتابیں بلکہ قلمی کتابیں بھی ضخیم جلدوں کی فوٹو آفسٹ کے ذریعہ حاصل کر کے منگوا رہے ہیں۔ طلبہ کی رہائش وآسائش کا نہایت معقول انتظام ہے۔ ان کے کمروں میں بجلی کے پنکھے بھی ہیں، ان کو اجتماعی طور سے کھانا کھلانے کا نظم ہے اور صبح کو

ناشتہ بھی دیا جاتا ہے، مطعم کا بڑا ہال بھی زیر تعمیر ہے۔

تخصص فی الفقہ والافتاء کا درجہ قائم ہے، کاش اس کے ساتھ تخصص فی الحدیث کی طرف بھی جلد توجہ ہو، ماشاء اللہ مولانا تقی عثمانی دام فضلہم خود فن حدیث کے بہت اچھے متخصص ہیں، ''درسِ ترمذی'' اس پر شاہد ہے۔ اور وہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم علامہ عثمانیؒ کا تکملہ بھی فتح المنعم کے نام سے تیار کر رہے ہیں۔ زادھم اللہ بسطۃ فی العلم و الفضل۔

اس جامعہ میں بڑے پیمانہ پر دارالتربیت، اور مدرسۃ البنات بھی قائم ہے، دارالتصنیف کا شعبہ بڑا کام کر رہا ہے۔ مولانا تقی عثمانی کی ادارت میں ماہوار ''البلاغ'' بھی بڑی شان سے نکل رہا ہے۔ یہ سب بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں جبکہ حیرت در حیرت ہے کہ ۱۳۹۷ء میں بجٹ صرف ۱۳ لاکھ کا تھا۔ حال کا حال معلوم نہیں، کچھ البرکۃ فی مال الغازی جیسی بات معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

کراچی میں حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحیٰ صاحب عارفی مدظلہم خلیفۂ حضرت تھانویؒ کی خدمتِ اقدس میں بھی کئی بار حاضری ہوئی، اور زمانۂ قیام کراچی میں میرے ایک نہایت مخلص کرم فرما رفعت احمد خاں صاحب بجنوری بھی برابر ملتے اور عنایات فرماتے رہے۔ یہ آج کل ''بیگم عائشہ باوانی وقف کراچی'' کے شعبۂ نشر و اشاعت کے ڈائریکٹر ہیں۔

قیامِ پاکستان کے زمانہ میں خانقاہِ سراجیہ کندیاں (میاں والی) حاضری کا شرف بھی ضرور قابلِ ذکر ہے، جس کی تقریب یہ ہوئی کہ راقم الحروف واپسی ہند کا عزم کر چکا تھا۔ اچانک معلوم ہوا کہ حضرت اقدس مرشدی مولانا خان محمد صاحب نقشبندی مجددی لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں، فوراً ہی جامعہ مدنیہ کی گاڑی میں وہاں کا رخ کیا اور حضرت کی خدمت میں حاضری دی، حضرت نے فرمایا کیا خانقاہِ سراجیہ دیکھے بغیر ہی واپس ہو جاؤ گے؟ عرض کیا، نہیں، اب ارادہ کر لیا ہے، حضرت نے فرمایا کہ میں کل پہنچ جاؤں گا، تم بھی آ جانا۔

لہٰذا پروگرام بنا کر مولانا حبیب احمد صاحب مدرس مدرسہ اسلامیہ چوہڑ کانہ منڈی، ضلع شیخوپورہ کی ہمراہی میں خانقاہ شریف حاضر ہوا اور کئی روز قیام کیا، حضرت قبلہ دام فیضھم کے فیضِ صحبت اور مجالس علم و معرفت سے بقدرِ ظرف استفاضہ کیا و للہ الحمد۔ حضرت الشیخ المعظم مولانا احمد خاں صاحب قدس سرہ کے عالی شان کتب خانہ سے بھی مستفید ہوا۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی حضرت کے گراں قدر علم و فضل و تبحر اور فیوض روحانیہ، نیز نوادرِ کتب خانہ مذکور کا ذکر فرمایا کرتے تھے، اور خود بھی ایک مرتبہ وہاں حضرتؒ کی حیات میں تشریف لے گئے تھے۔ حضرت مرشدی دام ظلہم نے خاص شفقتوں سے نوازا۔ اور رخصت کے وقت ایک قلم، چادر اور رومال مرحمت فرمایا۔ الحمد للہ حضرت کی توجہ بھی انوار الباری کی تکمیل و اشاعت کی طرف مبذول ہے۔ حق تعالیٰ ان کے فیوضِ عالیہ سے تمام مسترشدین کو دیر تک مستفید فرماتا رہے۔ آمین۔

یہ تذکرہ سفر پاک ناقص رہے گا اگر میں اپنے نہایت ہی محترم و مخلص مولانا عبیداللہ انور خلفِ ارشد حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ کا ذکر نہ کروں، جو قیام لاہور میں برابر اپنی شفقتوں سے نوازتے رہے۔ اور آخر میں اپنے نہایت ہی محترم و مکرم میزبان حضرت مولانا حامد میاں صاحب دام فیضہم و فضلہم اور ان کے عالی قدر صاحبزادوں کے ذکرِ خیر پر اس کو ختم کرتا ہوں۔ جن کی وجہ سے مجھے بہت ہی راحتیں میسر ہوئیں، اور ان کی شبانہ خاص علمی و روحانی مجالس کا لطف و سرور تو ہمیشہ یاد رہے گا، الحال اللہ بقاء و تمد الدین و العلم۔ مولانا دام ظلہم نے از راہ شفقت یہ بھی فرمایا کہ ہم رائے ونڈ میں بڑی جگہ حاصل کر کے اپنے جامعہ کو منتقل کرنیوالے ہیں، تم بھی آ جاؤ اور تخصصِ حدیث کی خدمت اپنی نگرانی میں کراؤ۔ مولانا بنوریؒ بھی لکھا کرتے تھے کہ انوار الباری کا کام میرے پاس رہ کر کرو۔ ان کے حکم کی بھی تعمیل نہ ہو سکی تھی۔ محترم مولانا حامد میاں صاحب بھی ضرور ایسے ہیں کہ ان کے پاس رہ کر بہت سے علمی، حدیثی تالیفی کام اعلیٰ پیمانہ پر انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اور ان سے بہت بڑا علمی تعاون مل سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ اب باہر کے مختصر سفروں کی بھی ہمت باقی نہ رہی، طویل قیام یا ہجرت کی ہمت و حوصلہ تو بڑی چیز ہے۔

سفرِ افریقہ: جامعہ اسلامیہ عربیہ ڈابھیل (سورت) مشہور علمی ادارہ ہے، جس میں عالمی شہرت کے مالک علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی اور حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے قیام فرما کر علوم وحقائق کے دریا بہائے ہیں۔

خطۂ گجرات کے مسلمان کتنے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے ان حضرات کی قدر جانی اور پہچانی، ان کی وجہ سے ایک چھوٹے سے مدرسہ تعلیم الدین کو عظیم الشان جامعہ کی صورت میں بدلنے کے لئے لاکھوں روپے بے دریغ صرف کر دیئے اور اس کو اوج کمال تک پہنچانے میں تن من دھن کی بازی لگادی، تو حق تعالیٰ نے بھی ان کی مالی قربانیوں کو اعلیٰ شرف قبول سے نوازا۔ ضلع سورت اور اطراف کے یہی لوگ افریقہ میں تجارتی کاروبار کرتے ہیں، اور ان کو وہاں اس کے صلہ میں نیز حضرت شاہ صاحبؒ وغیرہ ایسے اہل اللہ کی دعاؤں کی برکت سے ہر قسم کی عزت و دولت میسر ہوئی ہے اور وہاں کے دولت مندوں میں یہ بات خاص طور سے دیکھی گئی کہ دنیا کے ساتھ دین وعلم کا دامن بھی نہایت مضبوط ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں مساجد آباد ان کے ساتھ دینی تعلیم کے مکاتب کا اہتمام، ہر نماز کے وقت ہر مسجد کے پاس کاروں کی قطاریں، جن میں جوان، بوڑھے، سب ہی ٹھیک وقت پر نمازیں ادا کرنے کے لئے موجود، ہر مسجد کے ساتھ نہایت صاف ستھرے وضو خانے، گرم وسرد پانی تولیے، صابن موجود، جماعت خانہ میں عمدہ قیمتی قالینوں کا فرش، ہر بات قرینے قاعدے کی دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔

میں نے ان لوگوں سے کہا کہ یہ سب نعمتیں حضرت شاہ صاحب وغیرہ اکابر اہل اللہ کی دعاؤں کا ثمرہ ہیں، جو آپ لوگوں کو بڑی فراوانی سے میسر ہوگئی ہیں۔ ورنہ ہم دنیا کے اور خطوں میں بھی گئے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اس طرح دین ودنیا کو جمع ہوتے نہیں دیکھا۔

اعلیٰ قسم کی ضیافتوں کا اتنا اہتمام کہ ہر کھانے پر انواع واقسام کے ماکولات ومشروبات اور اعلیٰ قسم کے پھل موجود، اتفاق سے احقر اور رفیقِ محترم مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی دونوں اکل وشرب کے میدان میں تھانوی المشرب، چند لقیمات کو اقامتِ صلب کے لئے کافی سمجھنے والے، اور کھانے سے زیادہ صرف دیکھ کر سیراب ہونے والے، بہرحال! وہاں کے احباب ومخلصین کی سیر چشمی، محبت وخلوص، قدر دانی وقدر افزائیاں لائقِ صد قدر ومنزلت ہیں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ اس جامعہ ڈابھیل کے بہت سے علماء وفضلاء نے افریقہ پہنچ کر علمی درس گاہیں بھی قائم کی ہیں۔ اور مولانا قاسم محمد سیما صاحب افریقی فاضلِ جامعہ نیوکاسل (ناٹال) میں ایک بہت بڑا دار العلوم چلا رہے ہیں۔ وہ خود ماشاء اللہ علوم اسلامیہ عربیہ کے بڑے فاضل اور انگریزی زبان کے بھی عالم ہیں، خوب بولتے اور لکھتے ہیں۔ انتظامی صلاحیتوں کا تو کہنا ہی کیا کہ انہوں نے اپنے مخلص دوستوں کی مدد سے ایک بڑے عظیم الشان جامعہ کی بنیاد ڈال دی۔ جس کے لئے ایک مشن کالج کی عالیشان دو منزلی عمارت مع باغ ووسیع اراضی کے خریدی گئی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں جب راقم الحروف مولانا ہی کی دعوت پر وہاں حاضر ہوا تھا، تو اس دار العلوم کا ابتدائی دور تھا، اب سال گزشتہ تک اتنی ترقی دے دی کہ دورۂ حدیث کا بھی ایک سال بڑی کامیابی سے پورا کرا دیا۔ خود مولانا نے باوجود گوناگوں انتظامی مصروفیات کے بخاری شریف کا درس دیا اور دوسرے اساتذہ حدیث نے باقی کتب صحاح پڑھائیں، جن میں مولانا منصور الحق اور مولانا ممتاز الحق پاکستانی فاضلان دار العلوم نیوٹاؤن کراچی اعلیٰ درجے کے اساتذہ قابلِ ذکر ہیں۔ جو حضرت مولانا بنوریؒ فاضل جامعہ ڈابھیل کے تلمیذِ رشید ہیں۔ اس طرح یہ سب فیض جامعہ ڈابھیل کا ہے، اور اہلِ گجرات کے لئے قابلِ فخر۔

گزشتہ سال دورۂ حدیث سے سات طلبہ فارغ ہوئے تھے، جن کی دستار بندی وتقسیم اسناد وانعامات کے لئے پورے جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کا بڑا جلسہ کیا گیا تھا، اور اس میں شرکت کے لئے مولانا سیما نے ہندوستان سے مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اور راقم الحروف کو مدعو کیا تھا۔

یہاں سے افریقہ کے لئے انڈورسمنٹ ملنا اور وہاں سے ویزا کا حصول نہایت دشوار ہے۔ تاہم بڑی کوشش کے بعد ہم دونوں کو پہلے افریقہ جاچکنے کی بنیاد پر انڈورسمنٹ اور وہاں سے مولانا کی مساعی سے ویزا حاصل ہوگیا۔ چنانچہ ہم دونوں ۸ دسمبر ۱۹۸۳ء کی شام کو دہلی سے

بمبئی و نیروبی ہو کر ۹ دسمبر کو ۳ بجے جوہانسبرگ پہنچ گئے، ایئر پورٹ پر مولانا سیما صاحب مع رفقاء بابا صاحب و یوسف صاحب موجود تھے۔

وہ ہمیں وہیں سے اپنی گاڑی میں نیوکاسل لے گئے، ٹھیک مغرب کے وقت ہم ان کے دارالعلوم میں داخل ہوئے اور مغرب کی جماعت میں شریک ہو گئے، بعد نماز تمام ارکان و اساتذہ اور طلبہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا جلسہ کی تیاری اور انتظامات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوئے اور ہم نے کچھ آرام کیا۔ ۱۱ دسمبر کو وہ بڑا جلسہ ہوا جس میں صوبہ ٹرانسوال اور ناٹال و کیپ ٹاؤن سے بہت بڑی تعداد میں مسلمانوں نے شرکت کی۔

جلسہ کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید اور نعتیہ نظموں سے ہوا۔ پھر جنوبی افریقہ کے ممتاز علماء نے تقریریں کیں۔ احقر نے بھی دارالعلوم نیوکاسل کی اہمیت و افادیت، غرض و غایت اور خاص طور سے علمِ حدیث کی فضیلت و برتری، اکابر کی علمی و دینی خدمات پر روشنی ڈالی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے انگریزی میں دین و علم کی عظمت اور بلند مقاصد پر نہایت بصیرت افروز تقریر فرمائی۔

جنوبی افریقہ کے مشہور و معروف فاضل مولانا عبدالحق صالح عمر جی چیئر مین دارالعلوم ٹرسٹ نے بھی اپنے عالمانہ فصیح و بلیغ ارشادات سے اہلِ جلسہ کو محفوظ فرمایا۔

مولانا قاسم محمد سیما صاحب پرنسپل دارالعلوم نے اپنی مفصل و جامع رپورٹ میں دارالعلوم کے تمام حالات و اطوار و تدریجی ترقیات کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اپنے آئندہ اعلیٰ عزائم سے بھی واقف کیا۔

طلبہ نے بھی عربی و انگریزی میں مکالمے اور تقریریں کیں۔ آخر میں ختمِ بخاری شریف، تقسیم اسناد و انعامات اور دعا پر بخیر و خوبی جلسہ ختم ہوا۔

اس کے بعد ظہر کی نماز با جماعت اور دارالعلوم کی طرف سے تمام شرکاء اجلاس کے لئے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تمام انتظامات میں دارالعلوم سے تعلق و خلوص کی بنا پر اہلِ شہر نے بھی مولانا سیما صاحب اساتذہ و عملہ کے ساتھ مکمل تعاون کیا جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

یہ بات بھی بڑے شکر و اطمینان کی ہے کہ مولانا سیما کو دارالعلوم میں درس و نظم کے سلسلہ میں معتمد و قابل اساتذہ اور باصلاحیت کارکنان میسر ہو گئے ہیں۔ جس سے آئندہ ترقیات کی بجا امید کی جاسکتی ہے۔ وللہ الامر من قبل و من بعد۔

دارالعلوم میں ۲۔۳ روز قیام کر کے ہم دونوں ڈربن چلے گئے، وہاں مخلص محترم الحاج موسیٰ پارک کے پاس قیام ہوا انہوں نے اپنے سارے پروگرام اور ضروری کاموں کو مؤخر کر کے ۱۰۔۱۱ روز تک ہم دونوں کے ساتھ ایسے خلوص و محبت و یگانگت کا برتاؤ کیا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ وہاں کے بہت بڑے اہلِ ثروت ہیں، مگر اتنے طویل قیام کے کسی ایک لمحہ میں بھی ہم نے تمول کا غرور و تمکنت ان میں نہیں دیکھا، اور کم و بیش یہی بات پورے جنوبی افریقہ کے اہلِ ثروت میں پائی گئی، یہ خدا کا بڑا انعام ہے۔ ان ہی کے قریبی عزیز موسیٰ درسوت بھی برابر ملتے رہے۔

دورانِ قیام ڈربن ہمارے قدیم کرم فرما مولانا عبدالحق صالح عمر جی نے بھی اپنی مخلصانہ شفقتوں سے ہمیں خوب خوب نوازا اعلیٰ درجہ کی دعوتِ طعام کے علاوہ برابر وقت نکال کر ہماری قیام گاہ پر تشریف لاتے رہے، اور اہم مسائل حاضرہ پر علمی مذاکرات ہوتے رہے۔ خاص طور سے انوارالباری کی تکمیل و اشاعت کے بارے میں بھی تعلقِ خاطر ظاہر فرما کر مفید مشورے دیئے۔

ڈربن ہی میں ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ حدیث، جامعہ ڈابھیل کے فارغ مولانا عبدالقادر صاحب ملے بڑے فاضل مقرر و خطیب، حضرت شاہ صاحبؒ کے عاشق اور انوارالباری کے مداح و قدردان، بہت ہی محبت و خلوص کے ساتھ بار بار ملتے رہے۔

دوسرے ایک بہت بڑے فاضل و عارف باللہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ مولانا موسیٰ یعقوب صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے جو شہر سے کافی دور ایک زاویۂ خمول میں مقیم ہیں۔ ہمارے جانے سے نہایت مسرور ہوئے، ہم سب کے لئے پر تکلف عصرانہ کا انتظام کرایا۔ ۱۹۳۰ء زمانۂ دیوبند کا ایک واقعہ سنایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ رنگون تشریف لے گئے تھے، وہاں آپ نے ایک گھنٹہ تقریر جنت کے وجود پر ایسی فرمائی کہ جس سے جنت کی تمام چیزوں کا ایسا استحضار ہوا کہ جیسے لوگ جنت کو اپنی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

ڈربن ہی میں ایک مخلص دیندار نوجوان تاجر سے تعارف وتعلق ہوا۔ جنہوں نے راقم الحروف کے ساتھ کافی وقت گزارا اور کئی جگہ کی سیر وسیاحت بھی اپنی گاڑی میں لے جاکر کرائی، ان کے خلوص، تعلق، واصرار کی وجہ سے دوروز ان کے مکان پر قیام بھی کیا ان کا نام عمر فاروق امود ہے، اور ان کے بھائی مولانا مفتی بشیر احمد امود صاحب ہیں جو اس وقت باہر تھے، ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ ان ہی کے دوست محمد اسحاق قدرت بھی بڑے خلوص ومحبت سے ملتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے اور ترقیات سے نوازے۔

ڈربن سے ہم جوہانسبرگ آئے، ایئرپورٹ پر الحاج ابراہیم دادا بھائی اور ایم ایم گارڈی صاحب ملے، اور کھلوڑ ہاؤس میں قیام کرایا، قیام مختصر رہا، اسی میں مولانا گارڈی صاحب کی عیادت کی، جو صاحب فراش اور نہایت ضعیف وناتواں تھے، اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے، ۱۹۷۵ء میں جب راقم الحروف افریقہ گیا تھا، تو جوہانسبرگ میں قیام ان ہی کے پاس کیا تھا۔ انوارالباری کے لئے تکمیل واشاعت کے بہت ہی حریص تھے۔ ذاتی طور سے بھی نہایت محبت وخلوص رکھتے ہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ مارچ ۸۴ء میں ان کے انتقال کی خبر آئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ میاں فارم پر بھی دوبار حاضری ہوئی۔ محترم مولانا ابراہیم میاں اس وقت وہاں نہیں تھے، ان کے دوسرے بھائیوں، اور حافظ عبدالرحمٰن میاں صاحب سے ملاقات ہوئی، ایک روز بہت پرتکلف ناشتہ پر بھی مدعو کیا گیا۔ ایک مدت تک مولانا محمد بن موسیٰ میاں صاحب سے میرا بہت ہی قریبی تعلق مجلس علمی، اور حضرت شاہ صاحب کی وجہ سے رہا ہے۔ مجلس علمی کراچی منتقل ہوئی، تو وہاں بھی بلانے پر بہت مصر رہے، آخر وقت تک خط وکتابت رکھی، اور مجلس کے ترکِ تعلق پر بہت تاسف کا اظہار فرمایا کرتے تھے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

زمانۂ قیام جوہانسبرگ میں مولانا عبدالقادر صاحب ملکپوری، مولانا یوسف بھولا، مولانا یوسف عمرواڑی سے ملاقات ہوئی۔ افسوس ہے کہ تنگی وقت کی وجہ سے محترم الحاج عبدالحق صاحب مفتی، الحاج موسیٰ پوڈھانہ، مولانا احمد محمد گرداا اور محترم ڈوگرات صاحب الحاج یوسف میاں صاحب اور بہت سے دوسرے احباب ومخلصین سے نہ مل سکا۔ محترم دادا بھائی اور ایم ایم گارڈی صاحب نے ہماری قدرافزائی اور راحت رسانی کے لئے جس قدر اہتمام کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ جزاهم اللہ خیر الجزاء۔

جوہانسبرگ سے ہم دونوں لوساکہ (زمبیا) آئے، جہاں محترم ابراہیم حسین لمبات کی سعی سے سعودیہ کا ویزا حاصل کیا گیا۔ اور سہ روزہ قیام میں مولانا عبداللہ منصور صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ، ودیگر اساتذہ، نیز دوسرے اعیانِ شہر الحاج محمد جی راوت، وغیرہ سے ملاقاتیں رہیں۔ قیام محترم فاروق تو سارکہ صاحب کے فارم پر رہا جو ہمیں لینے کے لئے ایئرپورٹ آگئے تھے۔ شہر سے ۹۔۱۰ کلومیٹر کئی سو بیگھ کا فارم ہے۔ جس کا کام وہ بڑے اعلیٰ پیمانہ پر چلا رہے ہیں۔ اصلی ساکن ضلع سورت کے ہیں۔ انہوں نے میزبانی وقدرافزائی کا حق ادا کردیا اور اپنی گاڑی میں صبح وشام شہر لے جاکر سب احباب سے ملاقاتیں کراتے رہے۔ جزاهم اللہ خیر الجزاء۔

لوساکہ سے ہم دونوں نیروبی گئے، وہاں سے الحاج سلیمان حسین صاحب کے پاس ایک روز قیام کیا، جن کا موٹر پارٹس کا بزنس ہے وہاں سے جدہ آکر پہلے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے، پھر مکہ معظمہ، اور وہاں سے ۱۱ جنوری کو دہلی واپس آگئے۔ وللہ الحمد۔

مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ اور جدہ میں جن حضرات علماء واعیان سے ملاقاتیں ہوئیں، ان کا ذکر طویل ہے اور کسی دوسری فرصت کا محتاج۔ ان سب کے لئے دلی تشکر وامتنان اور مخلصانہ غائبانہ دعائیں۔

دارالاسلام اور دارالحرب کا مسئلہ

افریقہ کے قیام میں کئی جگہ یہ سوال ہوا کہ ان دونوں دیار کی اصل حقیقت اور متعلقہ شرعی مسائل کی کیا صورت ہے؟ مسائل دوسرے بھی زیر بحث آتے رہے، مگر اس مسئلہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اس لئے مختصراً کچھ لکھا جاتا ہے، کہ مسائل مہمہ کی تحقیق وتنقیح بھی انوارالباری

کے مقاصد میں سے ہے۔اور خاص طور سے اس بارے میں حقائق کا اظہار بھی کم ہوا ہے۔

چونکہ اس مسئلہ کے تمام اطراف اور فقہاء ومحدثین کی ابحاث پر بہت سے علماء کی نظر بھی نہیں ہے، وہ محض سرسری معلومات پر اکتفا کر لیتے ہیں اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ دیتے ہیں۔اس کا زیادہ احساس بھی افریقہ کے سفر میں ہوا۔اس لئے یہ بحث تو کتاب الجہاد سے متعلق ہونے کی وجہ سے انوارالباری کی آخری جلدوں میں آنی تھی مگر مناسب خیال کیا گیا کہ اس کی ضروری بحث وتحقیق اب ہی کردی جائے، حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء نے دارالحرب کے مسائل بہت کم لکھے ہیں۔اس لئے ضرورت ہے کہ دورِ حاضر کے علماء ان کی تحقیق وتفصیل کی طرف توجہ کریں۔ یہاں جزئیات کی تفصیل کا تو موقع نہیں ہے۔اصولی وکلی امور پر ضروری بحث پیش کی جائے گی۔و بہ نستعین.

سب سے پہلے یہ امر منقح کرنا ہے کہ دارالحرب ودارالاسلام کی حدود وامارات کیا ہیں۔اس کیلئے ہم حضرت الاستاذ العلام شاہ صاحبؒ کی قلمی تحریر کو بھی پیش کریں گے، جو عرصہ ہوا کہ محترم حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت بہار وجنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء نے دارالاشاعت خانقاہ رحمانی مونگیر سے شائع کی تھی۔اس میں حضرتؒ نے پورے دلائل کے ساتھ دونوں دار کی تشریح مماللامزید علیہ فرمادی ہے۔

دوسری اہم بات ان دونوں دار کے احکامِ شرعیہ کی ہے،اس کے لئے یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ دارالحرب کے مسائل میں سے خاص طور سے ربا اور عقودِ فاسدہ وباطلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے۔کیونکہ اس بارے میں کچھ ائمہ فقہ ایک طرف ہیں اور دوسرے دوسری طرف۔دونوں کے پاس نقلی وعقلی دلائل بھی ہیں،ان دلائل کی بہت اچھی تفصیل ووضاحت ہمارے مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے اعلاء السنن ص۱۴/۲۵۴ تا ص۱۴/۲۷۴ میں کردی ہے،اور مفصل دلائل ذکر کرکے آخر میں لکھا کہ امام اعظم ابوحنیفہ وامام محمدؒ کا فیصلہ در بارہ جوازِ ربا دارالحرب درایت وروایت کی رو سے اتنا قوی ہے جتنا کہ ہوسکتا ہے اور اس کا مبنیٰ صرف مرسل مکحول پر نہیں ہے جیسا کہ اکثر علماء ومصنفین نے خیال کرلیا ہے بلکہ اس کی صحت پر ان کے پاس بہت سے قوی وواضح الدلالۃ دلائل ہیں اور وہ دونوں امام اس مسئلہ میں تنہا بھی نہیں ہیں۔کیونکہ حضرت ابراہیم نخعیؒ بھی دارالحرب میں جوازِ ربا کے قائل ہیں اور حضرت ابن عباسؓ بھی مولیٰ وغلام کے اندر جوازِ ربا کے قائل ہیں اور ان دونوں اماموں کی تائید وموافقت میں اپنے زمانہ کے سید المحدثین حضرت سفیان ثوری بھی ہیں اور اگر امام اعظم وامام محمدؒ کے اس مسئلہ کا ثبوت آثار واقوالِ صحابہ وتابعین سے نہ ہوتا تو حضرت سفیان اس کی تائید ہرگز نہ کرتے۔

اس کے بعد مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت تھانویؒ کے احتیاطی مسلک عدمِ جوازِ ربا دارالحرب کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی حمایت میں غیر ضروری حد تک بھی لکھ گئے ہیں، حتیٰ کہ ہندوستان کے دارالحرب یا دارالکفر ہونے کو بھی مشکوک سا کردیا ہے، اس کا ازالہ حضرت شاہؒ کے ارشادات سے بخوبی ہوجاتا ہے،اور اسی لئے راقم الحروف نے پہلے لکھا تھا کہ جہاں تک حضرت شاہ صاحب کی نظر جاتی ہے دوسروں کی نہیں جاتی۔اور اس کا اعتراف خود حضرت تھانویؒ کو بھی تھا۔و للہ درہ۔

افادۂ انور: موقع کی مناسبت سے یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ بات بھی عرض کردینا مناسب ہے کہ وہ شرعی احکام میں کتر بیونت یا اپنی طرف سے کسی مصلحت کو سوچ کر مسائل بتانے کو پسند نہ فرماتے تھے، یعنی جو شرعی حکم جس طرح بھی وارد ہے، اس کو گھٹانے بڑھانے کا حق ہمیں حاصل نہیں ہے، مثلاً ہم کسی وقتی یا زمانے کی مصلحت سے کسی مکروہ شرعی کو حرام بتانے لگیں (جیسے غیر مقلدین تمباکو کھانے یا پینے کو بجائے مکروہ کے حرام کہتے ہیں) یا کسی مکروہ یا جائز تعظیم کو شرک کے درجے میں قرار دیں۔ یا کچھ لوگ اولیاء وانبیاء علیہم السلام کی تعظیم میں افراط کرنے لگیں تو ہم ان کی اصلاح کے خیال سے ان حضرات کے لئے ایسے کلمات استعمال کریں، جن سے ان کی توہین وتنقیص ہو، مقابر کی حد سے زیادہ تعظیم کرنے والوں کے مقابلہ میں ہم مقابر کی توہین پر اتر آئیں، حتیٰ کہ قبر مقدس نبوی علی صاحبھا الف الف تحیات مبارکہ کا عظیم ترین فضل وشرف بھی ہمیں ایک آنکھ نہ بھائے، اور ساری امت کے متفقہ فیصلہ کو بھی ہم رد کردیں، غرض اسی طرح صرف اپنی

عقل وفہم ناقص پر بھروسہ کر کے ہم سینکڑوں شرعی مسائل میں ترمیم کردیں، یہ منصب کسی بھی بڑے سے بڑے امتی کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ حد ہے کہ حضرت عمرؓ جو اس امت کے محدث تھے اور اس کا مرتبہ نبی کے بعد سب سے بڑا ہے، ان کی یہ رائے قبول نہ ہوسکی کہ عورتوں پر حجاب شخصی فرض ہو جائے۔ اور شارع علیہ السلام نے حرج امت کا لحاظ فرما کر ضرورتوں کے تحت حجاب وپردہ کی رعایت کے ساتھ گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ شرعی مسئلہ بے کم وکاست بتاؤ، خرابیوں کی اصلاح کے لئے جدوجہد الگ سے کرو۔ اور بعض اوقات حافظ ابن تیمیہ کی سخت گیری اوران کے تفردات پر بڑا افسوس ظاہر کر کے فرمادیا کرتے تھے کہ شاید انہوں نے یہ خیال کرلیا تھا کہ دین میری ہی سمجھ کے مطابق اترا ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور سے لکھنی ہے کہ دارالحرب ودارالاسلام کی الگ الگ حقیقت اوران کے احکام جاننے کی تکلیف بھی اکثر علماء گوارا نہیں کرتے، نہ قدیم بڑی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں نہ یہ دیکھتے ہیں کہ امام اعظم اور امام محمد کا مذہب درایت وروایت کے لحاظ سے کتنا قوی ہے۔ صاحب اعلاء السنن کا بڑا احسان ہے کہ کافی تعداد میں نہ صرف دلائل ایک جگہ پیش کردیئے۔ بلکہ دوسروں کے جوابات بھی مدلل لکھے۔ مگر آخر میں وہ بھی چوک گئے کہ صاحبین اور امام ابوحنیفہ میں بونِ بعید ثابت کرنے کی سعی کی جبکہ دونوں کی شرائطِ دارالحرب میں زیادہ فرق نہیں ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے اس بات کو اچھی طرح واضح کردیا ہے۔

پھر یہ کہ حضرت تھانویؒ کے احتیاطی مسلک کی حمایت میں صرف امام ابو یوسف کی وجہ سے ترجیح پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ چونکہ امام شافعی وغیرہ دوسری طرف ہیں، لہٰذا خروج عن الخلاف کے لئے احسن و احوط دارالحرب میں عدمِ جواز ہی ہے۔

حالانکہ اس طرح تو ہمیں سینکڑوں دوسرے مسائل حنفیہ میں بھی امام اعظم کا اتباع ترک کر کے خروج عن الخلاف کے لئے شافعی مالکی وحنبلی مسلک اختیار کرنا احوط واحسن اور احری واذکی قرار پائے گا۔ وفیہ مافیہ۔

صاحب اعلاء السنن نے ص۱۴/۳۷۲ میں ایک دلیل کے تحت یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ہمارے بعض اکابر نے فتویٰ دیا ہے کہ دارالحرب کے بینکوں سے مسلمانوں کا سود لینا جائز ہے۔ تاہم وہ اس کو اپنی ضرورتوں میں صرف نہ کریں اور فقراء پر صدقہ کردیں۔

مولاناؒ نے یہاں یہ نہیں لکھا کہ ایسے مال کا صدقہ کردینا کیا فرض کے درجہ میں ہے اور اپنی ضرورتوں میں صرف کرنا ناجائز ہے یا مکروہ؟ جب کہ وہ ص۱۴/۳۶۲ میں مبسوط وبدائع کے حوالہ سے یہ بھی ثابت کرچکے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمدؒ کے نزدیک دارالحرب میں جو اموال وہاں کے کفار سے حاصل ہوں وہ جائز وحلال بلا کراہت ہیں، خواہ وہ معاملات فاسدہ ہی کے ذریعے حاصل ہوں۔ تو ایسے اموال کا صدقہ ضروری کیوں ہوگا، اور اپنی ضرورتوں میں صرف کرنا ناجائز کیوں ہوگا؟ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی فتاویٰ میں یہ بھی آچکا ہے کہ دارالحرب کے بینکوں سے حاصل شدہ رقم سے ملازمین کی تنخواہ بھی دینا جائز ہے اور اپنے صرف میں بھی لاسکتا ہے، اور ہندوستان مفتی صاحب کے نزدیک دارالحرب ہے، وغیرہ ملاحظہ ہو کفایت المفتی جلد ہفتم۔

ہم حضرت مفتی صاحبؒ کے بعض فتاویٰ بھی آگے درج کریں گے ان شاء اللہ۔ اب ہم پہلے حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری تحقیق ان ہی کے الفاظ میں مع ترجمہ کے درج کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ بہت ہی اہم دستاویز ہے، جس کے علماء بھی محتاج ہیں راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر یہ مکمل تحقیق حضرت تھانویؒ اور مولانا ظفر احمد صاحبؒ کے سامنے ہوتی تو وہ بھی اپنی رائے میں ضرور تبدیلی لاتے۔

دارالاسلام اوردارالحرب کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی نہایت گرانقدر تحقیق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باید دانست کہ مدار بودنِ بلدۂ وملکے دارالاسلام یادارالحرب برغلبۂ مسلماناں وکفار است وبس، لہٰذا ہر موضعیکہ مقہور تحت حکم مسلمین است آں رابلادِ اسلام گفتہ خواہد شد وہر محلیکہ مقہور حکم کفار است دارالحرب نامیدہ خواہد شد۔

قال فی جامع الرموز دارالاسلام ما یجری فیہ حکم امام المسلمین و کانوا فیہ آمنین ودارالحرب ما خافوا فیہ من الکافرین، احد وقال فی الدرالمختار سُئل قاریالہدایۃ عن البحرالملح امن دارالحرب اودارالاسلام؟ اجاب انہ لیس من احدالقبیلتین لانہ لاقہر لاحد علیہ آہ۔

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار مسلمانوں یا کفار کے غلبہ پر ہے۔ لہٰذا جو خطہ مسلمانوں کے غلبہ وتسلط میں ہوگا اس کو دارالاسلام کہیں گے اور جو کفار کے تسلط وغلبہ کے تحت ہوگا وہ دارالحرب کہلائے گا۔

جامع الرموز میں ہے کہ دارالاسلام وہ ہے جہاں امام المسلمین کا حکم جاری ونافذ ہو اور مسلمان وہاں مامون ومحفوظ ہوں۔ اور دارالحرب وہ ہے جہاں کے مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں۔ درمختار میں ہے کہ بحرِ ملح (دریائے شور) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ وہ دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ جواب ملا کہ وہ دونوں میں سے نہیں ہے کیونکہ اس پر کسی کا بھی تسلط وغلبہ نہیں ہے۔

غرض ازنقلِ ایں عبارت آن است کہ مدار بودنِ دارِکفر د اسلام پر غلبۂ کفر واسلام است وبس، اگر در بحرِ ملح قولِ راجح بودن دارِحرب باشد لکن بوجہے دیگر وہر مقامیکہ مقہور ہردوفریق باشد آں را بحکم الاسلام یعلو ولا یعلیٰ ہم دارالاسلام خواہند گفت، مگر ہمیں شرطِ مذکور کہ غلبہ بہ بعض وجوہ اہلِ اسلام درانجا باشد نہ آنکہ نفس مقامِ مسلمین درانجا بود یا اظہار بعض شعائرِ سلام بحکم کفار درانجا بودہ باشد چنانکہ غلبۂ اسلام دردارے واظہارِ شعائرِ کفر باذنِ حکام اسلام بودن راضرر نمی کند، چہ درہردوشق غلبہ یافتہ نے شود، وحکمِ غلبہ را است نہ نفسِ وجودوظہوررا، ازینکہ اہلِ ذمہ دردارالاسلام قیام باذنِ اہلِ اسلام مے کنند وشعائرخودرا۔

عبارتِ مذکور نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دارِکفر واسلام ہونے کا تمام تر دارومدار کفر یا اسلام کے غلبہ پر ہے، پھر بالفرض اگر بحرِ ملح کے بارے میں غلبۂ اسلام وکفر دونوں کے ساتھ راجح شکل دارِحرب ہونے کی بھی ہے اور اسی طرح ہر وہ خطہ بھی جس پر دونوں فریق کا تسلط وغلبہ برابر کا ہو تو اس کو بھی دارالاسلام ہی کہیں گے، کیونکہ اسلام کا بول بالا ہی ہوتا ہے۔ نیچا نہیں ہوتا مگر ہر جگہ یہ شرط ضرور ملحوظ رہے گی بعض وجوہ سے اہلِ اسلام کا غلبہ وہاں ضرور ہو۔ صرف یہ بات کافی نہ ہوگی کہ وہاں مسلمان رہتے ہیں یا کفار کی اجازت سے وہاں بعض شعائرِ اسلام ادا کر لیتے ہیں، جس طرح کسی خطہ میں اسلام کا غلبہ وتسلط ہو اور مسلمان حاکموں کی اجازت یا غفلت سے وہاں کے کفار واہلِ ذمہ شعائرِ کفر بجا لائیں تو وہ اس خطہ کے دارالاسلام ہونے سے مانع نہیں ہوتا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں غلبہ نہیں پایا گیا۔ جبکہ مدار غلبہ پر ہی ہے۔

ظاہر ہے نمایند مگر دارالاسلام بحالِ خود مے ماند ومسلمین در دارالحرب وکفر بامن مے روند وشعائرخود آنجا ظاہر مے کنند وایں امر دارکفر را رفع نمی کند۔

ظاہر ہے کہ اہلِ ذمہ کفار ومشرکین دارالاسلام میں قیام وبجا آوری شعائرِ کفر اہلِ اسلام کی اجازت سے کرتے ہیں، اور مسلمان دارالحرب میں امن وامان کی گارنٹی پر قیام وبجا آوری شعائرِ اسلام کفار کی اجازت سے کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی جگہ دارالاسلام اور یہ دارالحرب ودارالکفر ہی رہتا ہے۔

نہ بینی کہ فخرِ عالم علیہ السلام بجمع کثیر در عمرۃ القضا بمکہ تشریف بروند و جماعت و نماز وغیرہ شعائرِ اسلام و عمرہ باعلان بجا آوردند و ایں قدر جمع داشتند کہ کفار را مقہور فرمانید چنانچہ بہمیں قدر لشکر در حدیبیہ عزمِ تاراج کردنِ مکہ میسر مودند، مگر چوں ایں ہمہ اظہار باذنِ کفار بود دراں یوم مکہ دارالاسلام نگشت بلکہ دارالحرب ماند چرا کہ ایں قیام و اظہارِ اسلام باذن بود نہ بغلبہ۔

تم نہیں دیکھتے کہ فخرِ عالم سید المرسلین علیہ السلام صحابۂ کرام کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ عمرۃ القضا کے لئے مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ تشریف لے گئے وہاں جماعت و نماز وغیرہ شعائرِ اسلام اور عمرہ علی الاعلان سب کام کئے اور اتنی تعداد بھی تھی کہ کفار مکہ کو مقہور و مغلوب کر سکتے تھے کہ اتنے ہی لشکر سے حدیبیہ کے موقع پر مکہ معظمہ کو فتح کرنے کا عزم بھی پہلے کر چکے تھے، مگر چونکہ یہ سب شعائرِ اسلام کی ادائیگی کفار کی اجازت سے ہو رہی تھی، اس لئے اس دن مکہ معظمہ دارالاسلام نہ بن سکا اور دارالحرب ہی رہا، کیونکہ یہ قیام و اظہارِ شعائرِ اسلام اجازت پر مبنی تھا غلبہ پر نہ تھا۔

الحاصل ایں اصلِ کلی و قاعدۂ کلیہ است کہ دارالحرب مقہورِ کفار است و دارالاسلام مقہورِ اہلِ اسلام، اگر چہ در یک دار دیگر فریق ہم موجود باشد بلا غلبہ و قہر۔

الحاصل! اس اصلِ کلی و قاعدہ کلیہ کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ دارالحرب مقہور و زیر تسلط کفار کے ہوتا ہے اور دارالاسلام مقہور و زیر تسلط اہلِ اسلام کے ہوتا ہے۔ اگر چہ کسی ایک میں دوسرے فریق کے لوگ بھی بلا غلبہ و قہر کے موجود ہوں۔

و آں جا کہ قہر ہر دو فریق باشد آں ہم دارالاسلام خواہد بود۔

البتہ جہاں دونوں فریق کا فی الجملہ غلبہ و تسلط موجود ہو تو اس کو بھی ہم دارالاسلام ہی مانتے ہیں۔

ایں اصل را خوب ذہن نشیں باید کرد کہ جملہ مسائل از ہمیں اصل برے آیند و ہمہ جزئیاتِ ایں باب دائر میں ہمیں اصل ہستند۔

اس اصل کو خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے، کیونکہ تمام مسائل اسی ایک اصل سے نکلتے ہیں اور اس بارے میں ساری جزئیات اس باب دائر میں بھی اصل ہستند۔

بعد ازیں امرِ دیگر باید شنید کہ ہر موضعیکہ دارِ کفر بود و اہلِ اسلام براں غلبہ کردند و حکمِ اسلام دراں جاری ساختند آں را جملہ علماء سے فرمانید کہ دارالاسلام گشت چرا کہ غلبہ و قہرِ مسلماناں یافتہ شد اگر چہ بہ بعض وجوہ غلبۂ کفار ہم دراں جا باقی باشد تا ہم بحکم الاسلام یعلو الخ باتفاق دارِ اسلام شد کما وضح سابقا

اس کے بعد دوسری بات سمجھنی چاہئے کہ جو خطہ دارِ کفر تھا پھر اس پر اہلِ اسلام کا غلبہ ہو گیا اور احکامِ اسلام وہاں جاری ہو گئے تو اس کو تمام علماء دارالاسلام کہتے ہیں۔ اگر چہ وہاں ابھی کچھ وجوہ غلبۂ کفر کی بھی موجود ہوں، کیونکہ غلبہ و تسلط مسلمانوں کا ہو چکا اور بحکم '' الاسلام یعلوا و لا یعلیٰ '' وہ خطہ بالاتفاق دارالاسلام ہو گیا۔

باز واضح کردہ می شود کہ اگر ایں دخول و اظہارِ اسلام بغلبہ نشدہ باشد ہیچ تغیرے در دارِ حرب نخواہد افتاد ورنہ جرمن و روس و فرانس و چین و جملہ ممالکِ نصاریٰ دارِ السلام میشوند و نشانے از دارِ حرب در دنیا پیدا نخواہد شد چرا کہ در جملہ ممالکِ کفار اہلِ اسلام باذنِ کفار احکامِ اسلام جاری مے نمایند و ہذا ظاہر البطلان۔

پھر یہ بات بھی قابلِ وضاحت ہے کہ اگر مسلمانوں کا کسی ملک میں داخلہ و قیام اور اظہارِ احکامِ اسلام غلبہ کی صورت میں نہ ہو تو وہ بدستور دارِ حرب ہی رہے گا۔ ورنہ جرمنی روس، فرانس و چین اور دوسرے تمام ممالک نصاریٰ بھی سب دارِ اسلام بن جائیں گے اور دنیا میں کوئی ملک بھی دارِ حرب نہ رہے گا، کیونکہ تمام ممالک کفار میں اہلِ اسلام کفار کی اجازت سے احکامِ اسلام بجا لاتے ہیں، لہٰذا یہ بات جتنی غلط ہے وہ ظاہر ہے۔

وہر مقامیکہ دارِ اسلام بود و کفار براں غلبہ کردند اگر غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع شد آں راحکمِ دارالحرب باشد و اگر غلبہ کفار محقق گردید مگر بہ بعض وجوہ غلبۂ اسلام ہم باقی ماندہ باشد آں رادارالاسلام خواہند داشت نہ دارالحرب۔

جس مقام میں کہ وہ پہلے سے دارالاسلام ہو اور وہاں کفار کا غلبہ ہوجائے تو اگر اسلام کا غلبہ بالکلیہ رفع ہوجائے۔ اس کو دارالحرب کا حکم دے دیا جائے گا۔ اور اگر غلبۂ کفار کے ساتھ بعض وجوہ سے غلبۂ اسلام بھی باقی ہو تو اس کو ابھی دارالاسلام ہی کہیں گے دارالحرب نہیں۔

دریں مسئلہ اتفاق است، اما اینکہ غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع شدن راچہ حد است دراں خلاف شد درمیانِ آئمۂ ما صاحبین علیہما الرحمۃ مے فرمایند کہ اجراء احکام کفر علے الاعلان والاشتہار غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع مے کند البتہ اگر ہر دو فریق احکامِ خود را باعلان جاری کردہ باشند غلبۂ اسلام ہم باقی است ورنہ درصورتِ اعلان احکامِ کفار وعدمِ قدرت براجراء احکام خود بغلبۂ خود الا باذنِ کفار غلبۂ اسلام ہیچ قدر باقی نے ماند وہوالقیاس، چراکہ ہرگاہ کہ کفار چناں مسلط گشتند کہ احکامِ کفر علے الاعلان والغلبہ جاری کردند واہلِ اسلام آں قدر عاجز ومغلوب شدند کہ احکامِ خود جاری کردن نمیتوانند وردحکمِ کفر راکہ شین وعارِ اسلام است قدرت ندارند بس کدام درجۂ اسلام باقی است کہ آں رادارالاسلام گفتہ خواہد شد بلکہ تسلط وغلبہ بکمال کفار راشد و دارِحرب گشت بالفعل۔

یہاں تک تو اتفاق ہے، پھر یہ کہ غلبۂ اسلام بالکلیہ رفع ہوجانے کی کیا حد ہے اس بارے میں امام ابو یوسف و امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ صرف علی الاعلان اجراءِ احکامِ کفر ہوجانے سے ہی غلبۂ کفر مان لیا جائے گا اور غلبۂ اسلام بالکلیہ ختم سمجھا جائے گا، البتہ اگر دونوں فریق کے احکام اعلان واشتہار کے ساتھ جاری رہیں تو غلبۂ اسلام بھی باقی رہے گا۔ لیکن اگر احکامِ کفر تو اعلان وغلبہ کے ساتھ جاری ہوجائیں اور اسلامی احکام غلبہ کے ساتھ نہیں بلکہ کفار کی اجازت سے جاری رہیں اور مسلمان احکامِ کفر کو رد کرنے سے عاجز ہوجائیں تو ایسی صورت میں اس ملک کو دارالاسلام قرار دینا صحیح نہ ہوگا اور غلبہ وتسلط کفار مکمل ہوجانے کی وجہ سے اس کو دارِحرب ہی کہا جائے گا۔

البتہ اس معاملے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس کو دارِحرب قرار دینے میں احتیاط برتی ہے، اور دو شرطوں کا اضافہ فرمایا ہے تاآں کہ غلبۂ کفار کے مزید آثار ظاہر ہوں، یا ان کے تسلط وغلبہ میں کچھ کمزوری ایسی آجائے، جس کی وجہ سے مسلمان ان کے غلبہ کو آسانی سے ختم کرسکیں۔

بعدازاں ہرچہ خواہد شد خواہد شد مگر الحال در دارِحرب بودن ومغلوبِ کفار شدن بظاہر ہیچ دقیقہ باقی نماندہ ومثالِ دارِقدیم مسلط علیہ کفار شدہ کما ہوالظاہر

چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ جب تک دو شرطیں مزید نہ متحقق ہوں۔ قدیم دارالاسلام کو دارالحرب قرار نہ دیں گے

وامام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بنظرِ خفی استحسان فرمود وراین کہ دارِ اسلام بحکمِ دارِکفر دہدا احتیاط کردہ تاچیزے ازآثار غلبہ یافتہ شود و یادراستیلاءِ کفار دہنے محسوس گردد کہ رفع ہر مسلمانان سخت دشوار نیاید حکم بدارِحرب وکفر نباید کرد پس دو شرط زائد دیگر فرمود، یکے آنکہ آں دیہ وبلد مستوئی علیہ الکفار متصل بدارِکفر گردد چناں کہ درمیانِ ایں قریۂ مستولی علیہا ودارِحرب موضع ازدارِ اسلام حائل نماند کہ بایں اتصال انقطاع از دارِ اسلام پیدا مے شود کہ باحرازِ کفار درآید وغلبہ و قہرِ کفار بقوت شد واستخلاص از دست کفرہ دشوار گرد ومقہوریت مسلمین سکان آنجا بکمال رسید۔

ایک شرط یہ ہے کہ جس اسلامی شہر یا ملک پر کفار کا غلبہ ہوا ہے وہ دوسرے دارِحرب وکفر سے متصل ہو کہ دونوں کے درمیان مسلمانوں کی حکومت کا کوئی شہر یا ملک حائل نہ ہو۔

کیوں کہ اس طرح دونوں دیارِ کفر کے اتصال سے معلوم ہوگا کہ کفار کا غلبہ وتسلط اتنا زیادہ قوی ومستحکم ہوگیا کہ مسلمانوں کے لئے اس کو ہٹا دینا اور ان کے تسلط کو زائل کرنا بہت زیادہ دشوار ہوگا۔

اور یہ اس صورت کی طرح ہوگا کہ کفار کے قبضہ میں مسلمانوں کا کچھ مال چلا جائے، تو وہ اگر اس مال کو اپنے ملک میں لے جائیں تو مسلمانوں کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے، اور جب تک وہ اپنے ملک میں نہ پہنچا سکیں تو مسلمانوں کی ملکیت باقی رہتی ہے، وہ اس کو ان سے چھین سکتے ہیں۔

وایں مشابہ آں است کہ اگر کفار بر حالِ مسلماناں استیلاء یافتند، اگر باحرازِ شاں برسید تملکِ اوشاں میدر آید واگر احرازِ ایشاں بدار خود نشدہ وانقطاع ملک مالک مسلم نے شود، کما ہو مقرر فی سائر الکتب۔

قال فی الہدایۃ: واذا غلبوا علی اموالنا واحرزوہا بدارہم ملکوہا اھ وقال انما غیران الاستیلاء لایتحقق الا بالاحراز بالدار لانہ عبارۃ عن الاقتدار علی المحل حالاً ومآلاً اھ

ہدایہ فقہ حنفی کی کتاب میں ہے کہ کفار مسلمانوں کا مال غصب کرلیں تو وہ اپنے ملک میں لے جاکر ہی مالک قرار دیئے جاسکیں گے اس کے بغیر نہیں۔

اسی طرح اسلامی شہر یا ملک بھی ہوگا کہ اگر اس پر کفار کا تسلط و غلبہ مکمل ہوگیا، جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ خطہ دوسرے دارِ کفر سابق کے ساتھ متصل ہوگیا تو غلبۂ کفار کو مکمل کہیں گے، ورنہ وہ ابھی دار اسلام ہی کہلائے گا۔ اگرچہ اسلام کا تسلط کمزور ہی ہو چکا ہے۔ کیونکہ اسلام کا بول بالا ہی ہونا چاہئے۔ نیچا نہیں۔

پس ہم چناں اگر ارض وعقار بلدے مثلاً مستوئی علیہ کفار شد اگر استیلاء تام گشت کہ محرز بہ بلد کفر گشت وآں احراز باتصال اوست بدار کفر وانقطاع اواز دار اسلام پس مقہور راید ی کفرہ گشت، ورنہ ہنوز استیلاءِ اہلِ اسلام باقی است واگرچہ ضعیف باشد بحکمِ الاسلام آہ باید کہ دار اسلام بماند۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کی اس شرط کا منشا بھی وہی اصلِ کلی ہے کہ جہاں کفار کو غلبہ اور مسلمانوں کو مغلوبیت ہو جائے گی، وہ دار حرب بن جائے گا دوسری شرط یہ ہے کہ جو امان حاکم اسلام نے اپنی حکومت کے غلبہ کے زمانے میں مسلمانوں کو اسلام کی وجہ سے اور رعایا کفار کو ذمی ہونے کی وجہ سے دیا تھا، وہ باقی نہ رہے۔ کہ اس کو امان دینے کے سبب سے وہ اپنی جان و مال کو محفوظ سمجھتے تھے اور کسی کی ہمت نہ تھی کہ وہ مسلمان یا ذمی کافر کی جان و مال کسی قسم کا بھی گزند پہنچا سکے۔

پس حاصل ایں شرط ہم ہموں غلبۂ کفار ومغلوبیۃ اہلِ اسلام است کہ اصلِ کلی اولاً بیاں کردہ شد، غلبۂ حکومت خود مسلماناں رابسبب اسلام وکفار رعایا رابوجہ عقدِ ذمہ دادہ بود مرتفع گردد کہ باں اماں کسے برنفس وجاں ومالِ خود مامون نماند

جبکہ یہ بات صرف غلبۂ قوت وشوکتِ حاکمِ اسلام کی وجہ سے تھی اور پھر وہ ختم ہوگئی اور دوسرے غلبہ کرنے والے کفار ومشرکین کی امان دہی پر موقوف ہوگئی۔

یعنی چناں کہ بسبب امن دادن حاکمِ اسلام ہمہ ماموں شدہ بودند کہ کسے رابسبب خوف حاکم آں مجال نبود کہ تعرض جان و مال مسلم وذمی نماید وایں نبود مگر بسبب غلبۂ قوت وشوکتِ حاکم مسلم۔

پس ظاہر ہے کہ حاکمِ مسلم کے امن دینے کی وجہ سے جب تک ایذا دینے والوں پر رعب و دہشت طاری رہے گی۔ کسی حد تک مسلمانوں کی شوکت وغلبہ کا وجود رہے گا، اور جب وہ چیز باقی نہ رہے گی، اور کفار ومشرکین کا پورا تسلط ہوجائے گا، تو پہلا امان مسلم حاکم کا بالکل ختم ہوجائے گا۔

پس ایں امان باقی نماند کہ کسے بوجہ ایں امان بے خدشہ از تعرضِ جاں ومالِ خود مامون نبود بلکہ ایں امان بے کار محض گردد، وامانیکہ مشرکین مستومین دادند آں موجب امن گردد۔

لہٰذا امام اعظمؒ کے نزدیک بھی اجراء احکام کفر علی الاشتہار کے بعد یہ دو شرطیں پائی جانے پر کفر کا غلبہ مکمل طور سے ثابت ہوجائے گا۔ اور غلبۂ اسلام بالکلیہ ختم ہوجائے گا تو اب ضرور ہی اس خطہ کو دارالحرب ماننا پڑے گا۔

پس ظاہر است کہ تا بسبب امنِ حاکم مسلم خوف موذی را خواہد بود غلبہ وشوکت امنِ مسلم بنوعے باقی خواہد ماند و ہرگاہ کہ آں چیزے نماند بلکہ امنِ مشرک متسلط محل نظر گردد، امانِ اول رفع خواہد شد۔

پس نزد امام علیہ الرحمۃ ہرگاہ بعد اجراء حکم علی الاشتہار ایں دو شرط یافتہ شود غلبۂ کفر من کل الوجوہ ثابت شد و غلبۂ اسلام من کل الوجوہ رفع گردید، اکنوں بدارِ حرب ناچار حکم خواہد شد۔

اہلِ دانش برازیں معلوم مے شود کہ مدار ایں قول ہم بر قہر وغلبہ است وبس کہ اول در اصل کلی واضح کردہ شد۔

اہل دانش جانتے ہیں کہ امام صاحب کے اس قول کا بھی دارو مدار قہر وغلبہ اور تسلط کامل ہی کی صورت بتا رہا ہے جو صاحبین کی بیان کردہ اصل کلی کا بھی منشا ہے۔

اس کے بعد روایات فقہا دیکھی جائیں تو ان سے بھی تحقیق مذکور کی ہی تائید ووضاحت حاصل ہوگی۔

بعد ازیں تقریر روایاتِ فقہاء را باید شنید کہ بنقل بعض آں سندِ تقریر ایں بندہ حاصل خواہد شد و بداں بعض حال کل روایات ایں باب واضح گردد،

قال فی العالمگیریۃ قال محمد فی الزیادات انما یصیر دار الاسلام دارالحرب عند ابی حنیفۃؒ بشروط احدہا اجراء احکام الکفر علی سبیل الاشتہار وان لا یحکم فیہا بحکم الاسلام، الثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینہما بلدۃ من بلاد الاسلام، الثالث ان لا یبقی مسلم او ذمی آمنا بامانہ الاول الذی کان ثابت قبل استیلاء الکفار للمسلم باسلامہ والذمی بعقد الذمۃ۔

فتاوے عالمگیری میں ہے: امام محمدؒ نے زیادات میں فرمایا کہ امام صاحب کے نزدیک دارالاسلام اس وقت دارالحرب بن جائے گا کہ چند شرطیں پائی جائیں۔

ایک اجراءِ احکام کفر علی الاشتہار اور یہ کہ وہاں اسلامی احکام نافذ نہ رہیں۔

دوسری یہ کہ وہ شہر یا ملک کسی دارالحرب (ملکِ کفار) سے متصل ہو کہ دونوں میں کوئی اسلامی شہر یا ملک حائل نہ ہو۔

تیسری یہ کہ دار اسلام کے زمانۂ حکومت اسلامی کا امان وعہد جو تسلطِ کفار سے قبل کا تھا، وہ باقی نہ رہے اور اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اہلِ حرب باہر کے آکر ہمارے دار اسلام پر غالب ومسلط ہو جائیں۔

یا خود اسی شہر یا ملک کے لوگ مرتد ہو کر تسلط حاصل کر لیں اور احکام کفر جاری کر دیں۔

وصورۃ المسئلۃ علی ثلثۃ اوجہ اما ان یغلب اہل الحرب علی دار من دورنا او یارتد اہل مصر وغلبوا واجروا احکام الکفر او ینقض اہل الذمۃ العہد وتغلبوا علی دارہم، ففی کل ہذہ الصور لا یصیر دار الحرب الا بثلاث شرائط وقال ابو یوسفؒ ومحمدؒ بشرط واحد وہو اظہار احکام الکفر وہو القیاس اھ

قال فی جامع الرموز فاما صیرورتہا دار الحرب فعندہٗ بشرائط احدہا اجراء احکام الکفر اشتہارا بان یحکم الحاکم بحکمہم ولا یرجعون الی قضاۃ المسلمین کما فی الحرۃ والثانی الاتصال بدار الحرب بحیث لا یکون بینہما بلدۃ من بلاد الاسلام ما یلحقہ المدد منہا الخ

یا اہلِ ذمہ کفار بدعہدی کر کے اس ملک پر غالب ہو جائیں۔ ان تمام صورتوں میں امام صاحب کی رائے تو یہ ہے کہ وہ ملک بغیر مذکورہ تینوں شرطوں کے دارالحرب نہ بنے گا اور امام ابو یوسف وامام محمدؒ صرف ایک شرط مذکور پر ہی دارالحرب بن جانے کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہی بات قرین قیاس ہے۔

''جامع الرموز'' میں اس طرح لکھا ہے کہ سابق دارالاسلام کو دارالحرب جب کہیں گے کہ تین شرطیں پائی جائیں ایک اجراءِ حکمِ کفر اشتہاراً کہ وہاں صرف کفار کا حکم چلے اور قضاۃِ مسلمین کی طرف لوگ رجوع نہ کریں جیسا کہ حرہ میں ہے، دوسرے دارالحرب سے اتصال، کہ دونوں کے درمیان کوئی شہر بلادِ اسلام کی حکومت والا نہ ہو، جس سے مسلمانوں کو مدد ونصرت مل سکے۔ الخ

ازیں روایتِ جامع الرموز دوامر معلوم و واضح شد یکے آنکہ مراد از اجراء احکامِ اسلام اظہار حکم اسلام است علی سبیل الغلبۃ نہ مطلق اداء جماعت و جمعہ مثلاً چرا کہ ے گوید بحکم بحکم ولا ی رجعون الی قضاۃ المسلمین، یعنی قضاۃِ مسلمین را ہیچ شوکت و وقعت نماند کہ بایشاں رجوع کردہ شود۔

''جامع الرموز کی عبارتِ مذکور سے دو امر واضح ہوئے، ایک یہ کہ اجراءِ احکامِ اسلام سے مراد اظہارِ احکامِ اسلام بطور غلبہ ہے، نہ صرف اداءِ جماعت و جمعہ مثلاً کیونکہ اس میں احکامِ کفر جاری ہونے اور قضاۃ کی طرف رجوع نہ کرنے کی بات کہی گئی، یعنی قضاۃ مسلمین کی کوئی شوکت و وقعت باقی نہ رہے جس کی وجہ سے لوگ انکی طرف رجوع کرتے اور احکامِ اسلام کے مطابق قضاءِ شرعی چاہتے۔

ہمچناں از حکم مسلمین و دارالحرب حکم بغلبہ کردن مراد است کما ہو لظاہر بہر حال حکمِ اسلام و حکم کفر ہر دو علی سبیل القوۃ والغلبۃ مراد است نہ محض اداء با ظہار

اسی طرح دارالحرب میں بھی حاکمِ مسلمین سے مراد حکم بطور غلبہ و شوکت کے ہی مراد ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔ یعنی دونوں جگہ قوت و غلبہ ہی مراد ہے۔ محض ادائیگیِ احکام مقصود نہیں ہے

دوم اینکہ غرض از شرطِ اتصال و انقطاع ہموں قوۃ است کہ در صورتِ اتصال بدارے مدد بقریۂ معلومہ نمی رسد بخلاف صورتِ انقطاع از دار حرب کہ طوقِ مدد مے تواند۔ پس ہنوز قوۃِ اسلام باقی است

دوسرے یہ کہ شرطِ اتصال و انقطاع سے بھی وہی قوت مقصود ہے کہ بہ صورتِ اتصال دارالحرب، تسلط شدہ خط کو کوئی مدد نہیں مل سکتی، جس سے معلوم ہوا کہ ابھی ایک حد تک قوتِ اسلام باقی ہے۔

وفی خزانۃ المفتیین دارالاسلام لایصیر دارالحرب الا باجراء احکام الشرک فیہا وان تکون متصلا بدارالحرب لا یکون بینہا و بین دارالحرب مصر آخر للمسلمین وان لا یبقی فیہا مسلم اوذمی آمنا علے نفسہ الا باماں المشرکین اھ

خزانۃ المفتیین میں ہے کہ دارالاسلام دارالحرب نہ بنے گا مگر بسبب اجراء احکام شرک کے، اور بوجہ اتصالِ دارالحرب کے، کہ دونوں میں مسلمانوں کا کوئی شہر فاصل نہ ہو، اور اس وجہ سے کہ وہاں کوئی مسلمان یا ذمی بغیر امان مشرکین کے مامون نہ ہو۔

وفی البزازیۃ قال السید الامام البلاد التی فی ایدی الکفرۃ الیوم لاشک انہا بلاد الاسلام بعد لانہ لم یظہر فیہا احکام الکفرۃ بل القضاۃ مسلمون اھ

''بزازیہ'' میں ہے کہ سیدنا الامام الاعظمؒ نے فرمایا: جو بلاد آج کفار کے قبضہ و تسلط میں ہیں، وہ سب اب بھی بلاشک بلادِ اسلام ہی ہیں کیونکہ ان میں کفار کے احکام نافذ نہیں ہیں بلکہ فیصلہ کرنے والے قاضی سب مسلمان ہیں۔

پس باید دید کہ دلیل بودن آں بلاد بلادِ اسلام ے آرد بقولہ بل القضاۃ مسلمون کہ حکمِ حکامِ اسلام بر طورِ اول باقی است و نمی گوید کہ لان الناس یصلون و یجمعون، چرا کہ مراد از اجراء حکم، اجراء حکم بطور شوکۃ و غلبہ است نہ اداءِ مراسم دین خود برضاء حاکم غالب۔

لہٰذا دیکھنا چاہئے کہ ان شہروں کے بلادِ اسلام ہونے کی دلیل یہی دی ہے کہ وہاں مسلمان قاضیوں کے فیصلے چلتے ہیں۔ گویا مسلمان حاکموں کے حکم سابقہ طریقہ پر ہی باقی ہیں، یہ نہیں کہا کہ وہاں لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور جمعہ قائم کرتے ہیں کیونکہ اجراء حکم سے مراد اجراء احکام بطور شوکت اور غلبہ کے ہے، صرف اداء مراسم دین، حاکم غالب کافر کی رضا و اجازت سے مراد نہیں ہے۔

در درِ مختار ے گوید فی معراج الدرایۃ عن المبسوط البلاد التی فی ایدی الکفار بلاد الاسلام لا بلاد الحرب، لانہم لم یظہروا فیہا حکم الکفر بل القضاۃ والولاۃ مسلمون یطیعونہم عن ضرورۃ او بدونہا۔

''درمختار'' میں ہے کہ معراج الدرایہ میں مبسوط سے نقل کیا گیا جو بلادِ کفار کے قبضہ میں چلے گئے ہیں وہ اب بھی بلادِ اسلام ہی ہیں بلادِ حرب نہیں، کیونکہ ان میں حکم کفر غالب نہیں ہوا بلکہ قاضی و والی مسلمان ہی ہیں جن کی اطاعت وہ تسلط کرنے والے کفار بھی کرتے ہیں ضرورت سے یا بلا ضرورت کے۔

وکل مصر فیہ وال من جہتہم یجوزلہ اقامۃ الجمع والاعیاد والحد ودو تقلید القضاۃ لاستیلاء المسلم علیہم۔
فلوالولاۃ کفار ایجوز للمسلمین اقامۃ الجمعۃ ویصیر القاضی قاضیا براضی المسلمین ویجب علیہم ان یلتمسوا والیا مسلما اھ

اور ہر شہر میں ان کی طرف سے والی مقرر ہوتا ہے جو جمعہ عید و حدود قائم کرے اور لوگ قضاء کی بات بھی اسی لئے مانتے ہیں کہ ان پر والی مسلمان ہوتا ہے، اور بالفرض کہیں والی بھی کفار ہوں تب بھی مسلمانوں کو اقامت جمعہ کی اجازت ہوتی ہے اور قاضی کا تقرر بھی مسلمانوں کی رائے سے ہوتا ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنا والی بھی مسلمان ہی تلاش کریں۔

وفیہ ایضا قلت وبہٰذا یظہر ان مافی الشام من جبل تیم اللہ وبعض البلاد التابعۃ لہا کلہا بلاد الاسلام لانہا وان کان لہا حکام دروز او نصاری ولہم قضاۃ علی دینہم وبعضہم یعلنون بشتم الاسلام لکنہم تحت حکم ولاۃ امورنا وبلاد الاسلام محیطۃ ببلادہم من کل جانب واذا اراد ولی الامر تنفیذ احکامنا فیہم نفذہا۔

پھر یہ لکھا کہ میں کہتا ہوں کہ اس سے ظاہر ہوا کہ شام میں جو جبل تیم اللہ اور اس کے تابع بعض بلاد ہیں وہ سب بلادِ اسلام ہیں۔ کیونکہ اگرچہ وہاں درزی حکام یا نصاریٰ ہیں اور ان کے دین کے مطابق بھی فیصلے دینے والے مقرر ہیں اور بعض لوگ ان میں سے اسلام کے خلاف بھی بکواس کرتے ہیں مگر وہ سب بھی ہمارے مسلمان والیوں کے ماتحت ہیں۔ اور ان کے بلاد کو بلادِ اسلام ہر جانب سے احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جب بھی وہاں کے اولوالامر میں سے کوئی بھی ہمارے اسلامی احکام ان میں نافذ کرنا چاہے تو وہ نافذ کر دیتا ہے۔

ازیں ہر دو روایت واضح شد کہ برائے بقاءِ دارالاسلام بعد غلبۂ کفار بقاءِ قوۃ وشوکتِ حکام اسلام وانفاذِ امور بقوت وغلبہ مراد مے شود وہمچناں در دارِ حرب اجراءِ حکم اسلام اگر بقوت باشد رفعِ دار حرب میشود، نہ اداء محض شعائرِ اسلام باذن ورضاء حاکم حاکم مخالف دین۔

ان دونوں عبارتوں سے واضح ہوا کہ بعد غلبۂ کفار بقاءِ دارالاسلام کیلئے بقاءِ قوت وشوکتِ حکامِ اسلام اور بقوتِ وغلبہ احکام اسلام نافذ کر سکنے کی پوزیشن موجود ہونا ضروری ہے، اور اسی طرح دارِ حرب (کافروں کے ملک) میں بھی اگر بقوت وغلبہ اجراءِ احکام اسلام ہو سکے تو وہ دارِ حرب نہ رہے گا لیکن محض اداءِ شعائرِ اسلام جو حاکم مخالف دینِ اسلام کی رضا واجازت سے ہو تو وہ کافی نہیں۔

الحاصل غرض ازیں شروطِ ثلثہ نزد امام واز شرط کہ اجراء حکم اسلام است نزد صاحبین ہموں وجود غلبہ وقوتِ اہلِ سلام مراد است اگرچہ بہ بعض وجوہ باشد وکسے از اہل فقہ نمی گوید کہ در ملکِ کفار اگر کسے باذن ایشان صراحۃ یا دلالۃ اظہار شعائر اسلام کند آں ملک دار اسلام مے شود، حاشا وکلا کہ ایں دوراز تفقہ است۔

الحاصل: امام صاحب کی تینوں شرائط اور صاحبین کی شرطِ واحد اجراء احکامِ اسلام کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ وجود غلبہ وقوتِ اہل اسلام کا مراد ہے۔ اگرچہ وہ بعض وجوہ سے ہی ہو۔ اور اہلِ فقہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ملکِ کفار میں اگر کوئی مسلمان ان کی اجازت سے شعائرِ اسلام ادا کرے تو وہ دارِ اسلام ہو جائے گا، حاشا وکلا کہ یہ بات تفقہ سے دور ہے۔

چوں ایں مسئلہ منقح شد اکنوں حالِ ہند را خود بخود فرمایند کہ اجراءِ احکامِ نصاریٰ دریں جا بچہ قوت وغلبہ است کہ اگر ادنیٰ کلکٹر حکم کند کہ در مساجد نمازِ جماعت اداء نہ کنید ہیچ کس از غریب وامیر قدرت نہ دارد کہ اداءِ آں نماید۔

ہندوستان دارالحرب: جب یہ مسئلہ منقح ہو گیا تو اب ہندوستان کا حال تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ یہاں احکام نصاری کس قدر قوت و غلبہ کے ساتھ نافذ ہیں کہ اگر ایک ضلع کا حاکم کلکٹر حکم کردے کہ مساجد میں نمازِ جماعت ادا نہ کی جائے تو کسی غریب یا امیر مسلمان کی ہمت نہیں کہ اس کو ادا کر سکے۔

وایں اداءِ جمعہ وعیدین وحکم بقواعدِ فقہ کہ ے شود محض با قانونِ ایشان است کہ در رعایا حکم جاری کردہ اند کہ ہر کس بحسب دینِ خود کند، سرکار، باوے مزاحمت نیست دامن سلاطین اسلام کہ بود ازاں نامے ونشانے نماندہ۔

اور یہ جو اداء جمعہ وعیدین اور قواعد فقہ کے مطابق حکم شرعی ہم بجالاتے ہیں۔ یہ سب محض ان کے اس قانون کی وجہ سے ہے کہ اپنی رعایا کے لئے انہوں نے نافذ کیا ہے کہ ہر ایک کو اپنے دین پر چلنے کی اجازت ہے اور جو امن سلاطین اسلام نے دیا تھا اس کا تو نام ونشان بھی باقی نہیں رہا ہے۔

کدام عاقل خواہد گفت کہ امنیکہ شاہ عالم دادہ، بود، اکنوں بھوں امن مامون نشستہ ایم، بلکہ امن جدید از کفار حاصل شدہ، وہ بھوں امنِ نصاریٰ جملہ رعایا قیام ہند ے کنند۔

کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ جو امن شاہ عالم نے دیا تھا، وہ اب بھی باقی ہے۔ اور ہم اسی کے ماتحت مامون بیٹھے ہیں، بلکہ دوسرا امن جدید کفار سے حاصل ہوا ہے اور اسی امنِ نصاریٰ کی وجہ سے سب رعایا یہاں رہتی ہے۔

واما اتصال پس آں در ممالک واقلیم شرط نیست بلکہ در قریہ وبلدہ ایں شرط کردہ اند کہ مدد رسیدن ازاں مراد ومقصود است وکسے ے تواند گفت کہ اگر مددِ کابل یا شاہ روم آید کفار را از ہند خارج کند حاشا وکلا۔

رہا اتصال کا معاملہ تو وہ ممالک واقالیم میں شرط نہیں ہے بلکہ قریہ وبلاد کے لئے ہے کہ اس سے مدد حاصل ہونی مراد ومقصود ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر کابل سے یا شاہِ روم (ترکی) سے مدد آجائے تو کفار کو ہندوستان سے نکالا جاسکتا ہے، حاشا وکلا!

بلکہ اخراجِ ایشاں بغایت صعب ہست جہاد و جنگ سامان کثیر ے خواہد۔

بلکہ ان کا نکالنا نہایت دشوار ہے، جہاد وجنگ کے لئے بہت زیادہ سامان درکار ہے۔

بہر حال! تسلطِ کفار بر ہند بداں درجہ است کہ در ہیچ وقت کفار را بر دارِ حرب زیادہ نبود واداءِ مراسمِ اسلام از مسلمانانِ محض باجازت ایشاں است۔

بہر حال! ہندوستان پر کفار کا تسلط وغلبہ اس درجہ کا ہے کہ کبھی کسی وقت بھی کفار کا غلبہ کسی دارِ حرب پر اتنا نہیں ہوا ہے اور مراسمِ اسلام کی ادائیگی مسلمان صرف ان کی اجازت کے تحت کرتے ہیں

واز مسلمان عاجز تریں رعایا کسے نیست ہنوز راہم قدرے رسوخ است، مسلمانانِ را نیست، البتہ در رام پور وٹونک وبھوپال کہ حکام آنجا باوجود مغلوب بودن از کفار، احکامِ خود جاری دارند، دار اسلام تواں گفت چنانچہ از روایات ردالمختار مستفاد ے شود واللہ اعلم وعلمہ احکم۔

اور مسلمانوں سے زیادہ عاجز ترین رعایا کوئی دوسری نہیں ہے، ہندوؤں کو بھی کچھ عزت ورسوخ حاصل ہے مسلمانوں کو وہ بھی نہیں ہے۔ البتہ رام پور، ٹونک، بھوپال کہ وہاں کے والیاں باوجود کفار سے مغلوب ہونے کے بھی اپنے اسلامی احکام جاری کر لیتے ہیں، ان کو دار اسلام کہہ سکتے ہیں جیسا کہ ردالمختار کی روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ احکم۔

لمحۂ فکریہ: حضرت اقدس شاہ صاحبؒ کی فارسی تحریر مذکور کتب خانہ رحمانی مونگیر میں محفوظ ہے اور محترم مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی امیرِ شریعت بہار دام فیوضہم نے اس تحریر کا عکس (فوٹو) ۱۳۸۲ھ میں اپنی تقریب کے ساتھ بڑے اہتمام سے عمدہ کاغذ پر طبع کرا کر شائع فرمادیا تھا۔ جزاھم اللہ خیرا۔

اس طرح حضرتؒ کی ایک نہایت قیمتی اور قلمی یادگار نورِ بصیرت وبصارت بنی تھی، احقر نے اس تحریر کا ذکر اور خلاصہ انوارالباری جلد اول کے (جدید ایڈیشن) کے آخر میں کیا تھا، اور تمنا تھی کہ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوجائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اب اس

کے ترجمہ کی توفیق بھی میسر ہوگئی (یہ تحریر تقریباً ۱۹۲۲ء کی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم)۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا دارالحرب و دارالاسلام کے بارے میں ہمارے بہت سے علماء اور مفتیانِ کرام کا مطالعہ بھی بہت کم ہے، اسی لئے وہ کوئی منقح بات نہیں بتا سکتے، اور اس دفعہ افریقہ کے سفر میں جب متعدد احباب نے اس بارے میں تحقیق و تنقیح چاہی تو اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ یہاں لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ہم نے "نطقِ انور" (مجموعۂ ملفوظات حضرت علامہ کشمیریؒ) میں ص ۱۴۶ تا ص ۱۶۶ اچھا مواد جمع کر دیا تھا اور اس میں علامہ مودودی و علامہ مناظر احسن گیلانی کی تحقیق و نقد کا بھی کچھ ضروری حصہ آ گیا تھا، اس کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ تاہم اس کا بھی وہ حصہ جو حضرت شاہ صاحبؒ سے متعلق ہے، یہاں پیش کرتے ہیں۔

حضرتؒ نے اپنے خطبہ صدارت جمعیۃ علماء ہند (منعقدہ پشاور، دسمبر ۱۹۲۷ء میں ارشاد فرمایا۔

ہمارے علماءِ احناف نے اسی معاہدۂ متبرکہ (معاہدۂ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم با یہودِ مدینہ) کو سامنے رکھ کر دارالحرب اور دارالامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کئے ہیں۔

(۱) دارالاسلام اور دارالحرب کا شرعی فرق

فقہاء احنافؒ نے دارالحرب میں عقودِ فاسدہ کے جواز کا حکم دے کر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کے احکام میں بہت فرق ہے، عقودِ فاسدہ کے جواز کی اصل ان کے نزدیک یہ آیت کریمہ[1] ہے۔ **فان کان من قوم عدولکم وھو مومن فتحریر رقبۃ** (یعنی اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی ایسا مسلمان مقتول ہو جائے جو دارالحرب میں رہتا تھا اور اس نے ہجرت نہیں کی تو اس قتل پر کفارہ واجب ہوگا، دیت واجب نہ ہوگی)۔

(۲) عصمت کی دو قسمیں

اس مسئلہ کی اصل یہ ہے کہ اسلام کی وجہ سے اسلام لانے والے کی جان و مال معصوم و محفوظ ہو جاتے ہیں، مگر عصمت کی دو قسم ہیں، ایک عصمت مؤثمہ یعنی ایسی عصمت جس کے توڑنے والے پر گناہ تو ہوتا ہے مگر کوئی بدل واجب نہیں ہوتا، دوسری عصمتِ مقومہ ہے جس کے توڑنے والے پر اس کا بدل بھی واجب ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کی جانیں عصمتِ مقومہ نہیں رکھتیں، کیونکہ اس کے لئے دارالاسلام اور حکومت و غلبہ و شوکتِ اسلامی ہونا شرط ہے۔

حضرتؒ نے لکھا کہ میرا مقصد اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دارالحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ دارالحرب میں رہ کر اپنے ہم وطن غیر مسلموں سے مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی مصالح پر نظر کر کے باہمی خیر سگالی کے جذبہ کے تحت صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں، جس پر دونوں قومیں صدق دل سے عمل کریں، تاکہ وہ کسی ظلم و تعدی کا شکار نہ ہوں اور اس طرح وہ معاہدہ کی رعایت کریں گے تو بیرونِ ملک کے مسلمانوں کو دراندازی کا موقع بھی حاصل نہ ہوگا نہ ان کو ایسا چاہئے۔ حضرتؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں

---

[1] تفسیر مظہری ص ۱۹۲/۲ تفسیر سورۂ نساء (مطبوعہ جید پریس دہلی میں ہے کہ اس قتل مسلم خطاء میں صرف کفارہ لازم ہوگا۔ کیونکہ اس مقتول مسلم کو اسلام کی وجہ سے عصمتِ مؤثمہ حاصل تھی، لیکن دیت واجب نہ ہوگی جو عصمت مقومہ کے سبب ہوتی، اور دارالاسلام میں رہنے والوں کے لئے خاص ہے۔ وہ یہاں نہیں پائی گئی کیونکہ وہ دارالحرب کا ساکن تھا۔

جہاں دارالحرب (مثلاً ہندوستان) میں قوموں کا باہمی معاہدۂ امن وصلح کر لینا ضروری قرار دیا ہے، وہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر اس دارالحرب میں دفاع کی ضرورت پیش آئے، تو مسلمانوں کو اس میں بھی برادرانِ وطن کے ساتھ تعاون کرنا ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر ان کا باہمی معاہدہ مضبوط و مستحکم ہو اور اس پر سب عامل ہوں تو باہر کے مسلمانوں کو بھی یہاں کے مسلمانوں کے معاملات میں دراندازی نہیں کرنی چاہئے۔

ظلم کی صورت

البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مشکلات القرآن ص ۱۹۰ میں آیت نمبر ۷۲، (انفال) **وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر** کی تفسیر میں کتب تفسیر کے حوالہ سے فرمایا کہ اس آیت میں جو یہ حکم ہے کہ دارالحرب کے مسلمان اپنے معاملات میں دارالاسلام کے اعیان وعوام سے مدد طلب کریں تو انہیں مدد کرنی چاہئے بجز اس صورت کے کہ ان دونوں ملکوں میں کوئی باہمی معاہدہ ناجنگ وغیرہ کا ہو چکا ہو، لیکن اس سے ظلم والی صورت[1] مستثنیٰ ہے، کیونکہ اسلام میں مظلوم کی امداد بہر حال ضروری ہے، خواہ وہ کوئی بھی انسان ہو اور کہیں بھی ہو اور خواہ دارالاسلام کے اندر ہی کچھ مسلمان ہی دوسرے مسلمانوں یا اہل ذمہ کفار پر ظلم کریں تو ان مظلوموں کی امداد بھی ضروری و واجب ہے۔

دارالحرب و دارالامان

فقہاء نے دارالحرب ہی کی ایک قسم دارالامان بھی لکھی ہے۔ جیسے انگریزی دور میں ہندوستان تھا۔ اس کے مقابلہ میں دارالخوف ہے، جہاں مسلمانوں کو پوری طرح جان و مال، عزت و مذہب کا تحفظ بھی میسر نہ ہو حضرت شاہ صاحبؒ کے خطبۂ صدارت میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

افادۂ مزید: حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ ترمذی شریف دارالعلوم دیوبند بباب **لا تفادی جیفة الاسیر** میں فرمایا: صاحب فتح القدیر شیخ ابن ہمامؒ نے ربوا کی بحث میں فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں کافر کے ہاتھ خمر وخنزیر کی بیع کرے تو اس کی قیمت حلال ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک ربو دارالحرب میں جائز ہے، ان کے پاس اس کی دلیل مشکل الآثار طحاوی کی حدیث ہے اور اس کی فقہی وجہ بھی ہے۔ البتہ شیخ ابن ہمام نے ایک کمی کہ خبث کی اقسام کو واضح نہیں کیا، جبکہ ہمارے یہاں اس کی کئی قسم ہیں، اور خبث الکسب ان میں سے سب سے بدتر ہے، جو خمر وخنزیر کے لین دین اور ان کے کاروبار کی شکل میں ہوتا ہے اور وہ خود حرام ہے، اور ان کا عوض بھی خبیث ہے، چنانچہ دارالاسلام میں تو انکی بیع کافر کے ساتھ بھی جائز نہیں اگر چہ **تراضی طرفین** سے ہو کیوں کہ شریعت ایسے عقدِ فاسد کو بطریق نیابت فسخ کر دیتی ہے، البتہ دارالحرب میں (جہاں نہ شریعت کا عمل دخل ہے اور نہ وہ وہاں نائب ہے) اگر مسلمان ان کی بیع کر کے قیمت بھی دارالحرب میں ہی وصول کرے تو وہاں اس میں نہ سبب کی خباثت ہوگی نہ عوض کی۔ اس لئے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ ایک خبثِ سبب ہوتا ہے، جیسے چوری، لوٹ، غصب وغیرہ کی اس کی اجازت کفار کے ساتھ دارالحرب میں بھی نہیں ہے۔ اسی لئے وہاں صرف تراضی طرفین ہی کے تحت تمام معاملات جائز قرار دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہاں ان کے اموال فی نفسہ مباح ہیں۔ اور ان کی جانیں پھر بھی کسی طرح مباح الدم نہیں ہیں۔ یہاں سے ایک وجہ اور بھی دارالحرب و دارالاسلام میں فرق کی معلوم ہوئی، یعنی شریعتِ اسلامیہ کا نائب ہونا یا نہ ہونا۔

نطق انور ص ۱۴۶ میں احقر نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد گرامی کا ذکر بھی کیا تھا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور اس میں کفار سے ذریعہ عقود وفاسدہ وعقودِ باطلہ جو بھی منافع حاصل ہوں وہ جائز ہیں۔

حضرت مدنیؒ کے ارشادات

اس میں شک نہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسی جگہ کسی وقت بھی سود لینا جائز نہیں ہے لیکن امام صاحب فرماتے ہیں کہ مسلم اور حربی

---

[1] اس بارے میں صاحب تفہیم القرآن سے مسامحت ہوئی ہے کہ ظلم والی صورت کو بھی مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ (مؤلف)

میں سود کا وجود ہی نہیں ہوتا، وہ یہ نہیں فرماتے کہ سود جائز ہے، بلکہ سود کی اس معاملہ میں نفی کرتے ہیں، (یعنی حدیث شریف کی وجہ سے اس کو ناجائز سود کے مصداق سے خارج قرار دیتے ہیں) مکتوبات شیخ الاسلام ص ۱/۲۰)۔

(۷) ہندوستان دارالحرب ہے، وہ اس وقت تک دارالحرب رہے گا، جب تک اس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا، دارالحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں، الخ۔

(۸) دارالحرب میں غدر اور خیانت کے سوا ہر طریقہ سے اہلِ حرب سے اموال حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے مباح ہے، اس لئے کہ دارالحرب میں مسلمانوں اور حربی کے درمیان معاملۂ سود پر سود کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ (الخ) مکتوبات شیخ الاسلام ص ۲/۱۲۳)

مکتوب مذکور ۶۶ھ کا اور بہت طویل ہے اس کے سب اجزاء قابلِ مطالعہ ہیں۔ پھر ۱۳۷۰ھ کے ایک مکتوب میں ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں جب سے اقتدارِ اسلام ختم ہوا جب ہی سے دارالحرب ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنے زمانہ ۱۸۰۳ء میں دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا اور ہمارے اکابر بھی اسی وقت سے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیتے رہے۔ اور آج بھی وہی حال ہے۔ جمعہ دارالحرب میں یقیناً ہوتا ہے اور فرض ہے، جیسا کہ آپ انگریزی زمانے میں پڑھتے رہے۔ الخ (رر ص ۲/۲۵۱)

حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ

نمبر ۴۲: سرکاری بینک کی ملازمت اس حیثیت سے کہ اس میں سودی کاروبار ہوتا ہے ناجائز نہیں ہے کیونکہ بحالتِ موجودہ گورنمنٹ برطانیہ محارب اور ہندوستان دارالحرب ہے اور اس میں گورنمنٹ سے سود لینا ناجائز نہیں ہے۔ (کفایت المفتی ص ۸/۵۷)۔

نمبر ۴۹: سودی رقم مسلمان محتاج کو دینا اور مسلمان قرضدار کے قرضہ میں دینا اور غیر مسلم محتاج کو دینا جائز ہے۔ انشورنس سے ملی ہوئی رقم پسماندوں کو اپنے خرچ میں لانا بھی درست ہوگا۔ (رر ص ۸/۶۱)

نمبر ۵۴: ڈاکخانے سے جمع شدہ رقم کا سود لینا جائز ہے اور اس کو مدرسہ کی ضرورت میں خرچ کیا جاسکتا ہے، تنخواہ میں دینا بھی جائز ہے۔ (رر ص ۸/۶۳)

نمبر ۸۸: دارالحرب میں معاملات ربویہ وقمار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو کفار سے فائدہ حاصل کر لینا جائز ہے۔ (رر ص ۸/۸۱) دارالحرب کے مسلمانوں کو آپس میں سود وقمار کے معاملات کرنا مکروہ ہے۔ (رر ص ۸/۸۲)

نمبر ۱۱۳: افریقہ قطعاً دارالحرب ہے، وہاں کفار سے معاملات ربویہ کرنا اور فائدہ اٹھانا مباح ہے (رر ص ۸/۹۷)

نمبر ۱۲۶: میں حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ہندوستان میرے نزدیک دارالحرب ہے اور اس میں غیر مسلمہ سے استفادہ مال کی ایک محتاط صورت تجویز فرمائی۔ (رر ص ۸/۱۰۶)

نمبر ۱۲۸: ولایتی تاجروں سے بھی جو دارالحرب میں رہتے ہیں معاملاتِ ربویہ جائز ہیں (کفایت المفتی ص ۸/۱۰۷)

حضرت مولانا تھانویؒ کی احتیاط

راقم الحروف کے نزدیک حضرتؒ بھی ہندوستان کو دارالحرب ہی سمجھتے تھے مگر انہوں نے امام ابو یوسفؒ کے مسلک کی رعایت سے احتیاط اختیار فرمائی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کے بعد ہم تفصیل وتنقیح مذاہب کے ساتھ امام اعظم وغیرہ کے دلائل نقلیہ وعقلیہ کا ذکر کرتے ہیں۔

مذاہب کی تفصیل: اکابرِ امت حضرت ابراہیم نخعی امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام سفیان ثوری، امام محمدؒ فرماتے کہ دارالحرب میں مسلم وکافر کے درمیان معاملات ربویہ اور دوسرے عقودِ فاسدہ جائز ہیں۔ دونوں کی رضامندی سے وہ سب درست ہیں۔ البتہ امام مالکؒ اتنی شرط لگاتے ہیں کہ اگر کسی دارالحرب اور دارالاسلام کے درمیان معاہدۂ صلح ہے تو وہاں کے مسلمان یہاں کے کفار سے ایسے معاملات نہیں کر سکتے، اگر نہیں ہے تو کر سکتے ہیں۔ (المدونة الکبری) امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ معاہدۂ صلح کی وجہ سے کوئی دارِ کفر، دارِاسلام تو نہیں بن جاتا۔ اور جو معاملات طے ہوتے ہیں۔ وہ باہمی رضامندی ہی سے تو ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی وقتِ نظر اور نہایت گہرائی فکر کے ساتھ معاملہ فہمی کی شان اور قانونی موشگافیاں دوسرے تمام فقہاءِ اسلام میں نہیں پائی جاتیں۔ دوسرے یہ کہ اعلاء السنن اور دوسری بھی بعض کتب فقہ حنفی میں جو امام مالک کو امام صاحب کے مقابل گروہ کے ساتھ رکھا گیا ہے، وہ غلط ہے۔ نیز یہ کہ اس مسئلہ میں امام صاحب تنہا نہیں ہیں، جبکہ امام مالک محدث وفقیہ اعظم نخعی، امام المحدثین، سفیان، ثوری وامام محمد (استاذ اعظم امام شافعی) ان کے ساتھ ہیں، دوسری طرف بڑوں میں سے امام ابو یوسف کے ساتھ صرف امام شافعی واحمدؒ ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جمہور کا مسلک وہی ہے جو امام اعظمؒ کا ہے، اور فقہ حنفی میں تو یہ طے شدہ بات ہے کہ کسی مسئلہ میں صرف امام ابوحنیفہ ہی کی رائے ایک طرف ہو تو وہی سب پر فائق وراجح قرار دی جاتی ہے۔ پھر یہاں تو ان کے ساتھ دوسرے اکابر بھی ہیں۔

دلائل جواز: صاحب اعلاء السنن مستحقِ صد تشکر ہیں کہ انہوں نے اکثر دلائل کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی فرمائی ہے، ملاحظہ ہو ص ۱۴/۲۵۴ تا ص ص ۱۴/۲۷۴ اور شروع میں صرف حضرت مکحول کی حدیثِ مرسل پر ہی کئی صفحات میں تحقیق درج کی ہے۔ اس کے بعد مشکل الآثار امام طحاوی وغیرہ سے آثار صحابہ وتابعین کے ذریعہ اس کی تقویت کا صالح مواد جمع کر دیا ہے، رواۃ و رجال پر بھی عمدہ بحث کی ہے۔

حدیث مرسل کی حجیت: صاحب انوار المحمود نے جو تحقیقی مقدمہ اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند وحضرت شاہ صاحبؒ اور کتب اصول حدیث سے استفادہ کے بعد لکھا ہے، اس میں لکھا کہ کبار تابعین کے مراسیل جیسا کہ حضرت سعید بن المسیب، مکحول دمشقی، ابراہیم نخعی، حسن بصری وغیرہم کرتے تھے کہ صحابی کا واسطہ ظاہر کئے بغیر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے روایاتِ حدیث کی ہیں، وہ سب امام ابوحنیفہ، امام مالک واحمد اور جمہور سلف کے نزدیک حجت ہیں۔ اہل ظاہر اور بعض ائمۂ حدیث ان کو قبول نہیں کرتے، امام شافعیؒ شرائط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ (ص ۱/۳۲)۔

اوجز میں اس طرح ہے: علامہ ابن جریر طبری نے کہا کہ تمام تابعین نے قبول مرسل پر اجماع واتفاق کیا ہے پھر ان سے یا بعد کے ائمہ سے بھی دوصدی تک کسی کا انکار منقول نہیں ہوا، علامہ ابن عبد البر نے فرمایا کہ گویا دوصدی کے بعد کا اشارہ امام شافعی کی طرف ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اس کو رد کیا اور بعض کی رائے یہ بھی ہے کہ مرسل مسند سے بھی قوی ہے، کیونکہ جس نے کسی حدیث کو مسنداً روایت کیا اس نے تو تم پر چھوڑ دیا اور جس نے مرسلاً روایت کیا تو اس نے ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ علامہ ابن الجوزیؒ اور محدث خطیب بغدادی نے امام احمد سے بھی نقل کیا کہ بسا اوقات مرسل روایت مسند سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے (امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۰۰)

آخر میں نقل کیا کہ مختار تفصیل یہ ہے کہ مرسلِ صحابی تو اجماعاً مقبول ہے، اور قرنِ ثانی وثالث والوں کے مراسیل حنفیہ ومالکیہ کے یہاں مطلقاً مقبول ہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک بھی ان کی تائید اگر دوسری مرسل، مسند، قولِ صحابی یا قولِ اکثر علماء سے ہوتی ہو یا اطمینان ہو کہ ارسال کرنے والا صرف عادل سے روایت کرتا ہے۔ تو وہ بھی مقبول ہے۔ (اوجز المسالک ص ۱/۶۹)

امام مکحول م ۱۱۸ھ کا تذکرہ

دوسری صدی ہجری کے جلیل القدر تابعی ومحدث۔ صاحب تصانیف مسند وغیرہ مسلم شریف وسنن اربعہ اور جزء القراءۃ خلف الامام

امام بخاری کے رواۃ میں سے ہیں۔آپ نے مصر،عراق،شام،مدینہ طیبہ وغیرہ عالم اسلامی کے علمی اسفار کئے،اور حدیث وفقہ کے بڑے مشہور امام ہوئے،ثقہ،صدوق تھے،ابوحاتم نے کہا کہ شام میں ان سے بڑا فقیہ نہیں تھا،حافظ ابن معین نے کہا کہ پہلے قدریہ کی طرف مائل تھے،پھر رجوع کرلیا تھا،(تہذیب ص۱۰/۲۸۹)

امام مکحول کی جلالتِ قدر علمی کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ امام زہری نے فرمایا:''علماء چار ہیں،سعید بن المسیب مدینہ طیبہ میں،شعبی کوفہ میں،حسن بصری بصرہ میں،اور مکحول شام میں۔(الاکمال فی اسماء الرجال از صاحب مشکوۃ)

غرض حدیث" لا ربوا بین المسلم والحربی ثمہ" کے راوی امام مکحول دمشقی ایسے جلیل القدر محدث وفقیہ ہیں،اوران کی تائید وتقویت آثار صحابہ وتابعین سے بھی ہوتی ہے اور کوئی مسند یا مرسل حدیث اس کے مضمون سے معارض بھی نہیں ہے،اور امام اعظم،امام مالک و ابراہیم نخعی وامام محمد وامام سفیان ثوری ایسے کبار محدثین وفقہاء نے اس کی تلقی بالقبول کی ہے تو ایسے مرسل کو تو امام شافعیؒ کے اصول پر بھی مقبول ہونا چاہئے۔لہٰذا جواز ربوادارالحرب کا مسلک ہر لحاظ سے نہایت قوی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجوزین کا تفقہ

امام اعظمؒ اور دوسرے حضرات کا مذکورہ بالا فیصلہ دینی وعلمی تفقہ کی بلندی وبرتری کے لحاظ سے بھی بوجوہ ذیل راجح وقوی معلوم ہوتا ہے۔

(۱) آیتِ کریمہ فان کان من قوم عدولکم نے واضح اشارہ دیا کہ دارکفر کے ساکن مسلمان عصمتِ مقومہ شرعیہ ایسی نعمتِ عظیمہ سے محروم ہوتے ہیں،جو دارِاسلام کے ساکن مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے۔اسی لئے ان دونوں کے احکام بھی الگ الگ ہیں۔

(۲) احادیثِ نبویہ میں بھی اس امر کو پسند نہیں کیا گیا کہ دارکفر میں مستقل سکونت اختیار کی جائے۔خصوصاً جبکہ وہاں ان کے دین و عقائد پر بھی زد پڑتی ہو۔البتہ اگر ایسا نہ ہو اور جان ومال کا تحفظ بھی حاصل ہو تو وہاں کی سکونت جائز ہے اور ایسے دارحرب کو دارامان کہا جاتا ہے۔اور حسب تحقیق حضرت شاہ صاحب ایسے ملک میں غیرمسلموں سے باقاعدہ معاہدہ دینی،مالی وجانی حقوق کے تحفظ کا کرلینا چاہئے اس کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو اس وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ ہرقسم کی معاونت بھی کرنی چاہئے۔

(۳) چونکہ دارکفر میں اسلامی شریعت کا قانون نافذ نہیں ہوتا،اس لئے وہاں کے ساکنان کے لئے ان کے دین اور جان ومال کا تحفظ اس اعلیٰ سطح کے مطابق نہیں ہوسکتا جو اسلام نے متعین کی ہے،چنانچہ دارِاسلام میں جو مساویانہ حقوق غیرمسلموں کو دیئے گئے ہیں،وہ دنیا کے کسی بھی دارکفر میں مسلمانوں کے لئے حاصل نہیں ہیں۔اگر کہیں قانون وضابطہ میں دیئے بھی گئے ہیں،تو عملاً نہ ملنے کے برابر ہیں۔اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے ہندوستان کے مسلمانوں کا حال تو سب سے بدتر ہے۔جہاں ہزارہا فسادات میں لاکھوں مسلمانوں کی جانی و مالی تباہی وبربادی ہوتی ہے اور کوئی دادفریاد نہیں ہوتی۔امام اعظم وغیرہ نے دیارِکفر کے ایسے ہی حالات کا صحیح ترین اندازہ لگا کر وہاں کے احکام دیارِاسلام کے احکام سے بالکل الگ تجویز کئے تھے۔

(۴) امام صاحب نے یہ دیکھ کر کہ دیارِکفر میں سکونت اختیار کرنے سے مسلمانوں کی پوزیشن نظرِ شارع میں بھی بہت کچھ گرجاتی ہے،اور حق تعالیٰ نے اس کی وجہ سے ان کو قومِ عدو میں سے بھی قراردے دیا،تو انہوں نے ایک رائے یہ بھی قائم کی ہے کہ دیارِحرب کے جو لوگ وہاں رہ کر اسلام لے آئیں اور پھر وہاں سے دیارِاسلام کی طرف ہجرت بھی نہ کریں تو وہ ضرورت پڑنے پر آپس میں بھی ربوی معاملات کرسکتے ہیں،گو اس بارے میں امام محمدؒ کی رائے ان کے ساتھ نہیں ہے،اور اسی لئے امام صاحب کی یہ رائے مرجوح قرار دی گئی ہے، اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے فتاویٰ میں اس کو مکروہ کہا گیا ہے۔وہ ہم پہلے نقل کرچکے ہیں۔

تاہم اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں ایسے مسلمانوں کی اسلامی پوزیشن بہت کمزور سمجھی گئی ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے، ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ تو فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ (انگریزی دور) میں ہندوستان کے باشندے بمنزلۂ اسیر ہیں، جن کی پوزیشن غلام سے بھی بدتر ہوتی ہے، اور اسیر حنفیہ کے نزدیک معاہد نہیں ہوتا، اس لئے قید کرنے والے کا مال مباح ہوتا ہے جس طرح چاہے لے سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنی عزت و جان کو خطرے میں نہ ڈالے اور اسی لئے انگریزی دور میں ہمارے بعض اکابر نے بلاٹکٹ ریلوے سفر وغیرہ کی اجازت دی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ مدت ہوئی جب نصاریٰ کی طرف سے اسلام پر اعتراضات کا بڑا طوفان اٹھا تھا تو ایک اعتراض یہ بھی ہوا تھا کہ اسلام کا یہ کیا انصاف ہے کہ ایک ہاتھ جس کے کاٹنے کی دیت پوری جان کی آدھی ہوتی ہے، یعنی پچاس اونٹ یا پانچ سو دینار (اشرفیاں) پھر صرف چوتھائی دینار چرانے پر اس کا اتنا قیمتی ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے؟ تو اس کے جواب میں علماءِ اسلام نے کہا تھا کہ جب تک وہ ہاتھ امانت دار رہا اس کی وہی قدر و قیمت تھی۔ پھر جب اس نے چوری کی تو وہ خیانت کی وجہ سے نظر شارع میں اتنا ذلیل و بےقدر ہوگیا، یہی باری تعالیٰ کی حکمت ہے تو شاید کچھ ایسی ہی بات دارالحرب کے ساکن مسلمانوں کی بھی ہے۔ جبکہ وہ باوجود قدرت و سہولت کے بھی ہجرت نہ کریں اور دیارِ کفر کی سکونت کو ترجیح دیں۔ باقی مجبوریوں اور معذوریوں کی صورت میں ان کا عذر عند اللہ مقبول ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

(۵) امام اعظم کے نزدیک کسی دارِ اسلام کو دارِ کفر قرار دینے میں بھی نہایت سختی اور بڑی احتیاط سب سے زیادہ ہے اور پھر دیارِ کفر کی مجبوریوں اور مشکلات کا لحاظ بھی انہوں نے ہی سب سے زیادہ کیا ہے اور شرعی حدود میں رہ کر حل نکالنے کی سعی کی ہے۔ اور یہ حقیقت یہ ہے کہ نقل و عقل کی رو سے وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

(۶) امام صاحب کے نزدیک دارِ اسلام میں مستقل طور سے سکونت کرنے والے کفار اہلِ ذمہ اور ان غیر مسلموں کے لئے بھی جو امن لے کر عارضی طور سے دارِ اسلام میں داخل ہوں، تمام حقوق تحفظِ دین و جان و مال و عزت کے مسلمانوں کے برابر ہیں، یہاں تک کہ غیر مسلموں کی غیبت اور برائی کی بھی کوئی بات ان کے پیٹھ پیچھے بھی کرنا جائز نہیں ہے، جس طرح کہ مسلمانوں کی غیبت جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی کافر ذمی یا مستامن کو قتل کردے تو اس مسلمان کو بدلے میں قتل کیا جائے گا جبکہ دوسرے ائمہ کے نزدیک قتل نہیں بلکہ صرف دیت مال کے ذریعہ کافی ہوگی۔ اور غلام کے بدلے میں آزاد مسلمان کو قتل کیا جائے گا۔ اور جن صورتوں میں دیت واجب ہوتی ہے تو مسلم اور غیر مسلم کی دیت برابر رکھی گئی ہے، جبکہ دوسرے اماموں کے یہاں اس میں بھی کمی بیشی ہے۔

غرض یہ کہ ہمارے امام صاحب نے دارِ اسلام میں غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر تمام حقوق مکمل طور سے دیئے ہیں، جس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ہے، تو یہ سب رعایتیں صرف اس لئے ہیں کہ دارِ اسلام کے غیر مسلم شریعت اسلام کی سرپرستی قبول کرتے ہیں۔ اور دارِ کفر جہاں کے غیر مسلم اسلامی شریعت کی سربراہی تسلیم نہیں کرتے اور وہاں غلبہ و شوکت بھی احکام کفر کی ہے تو ایسی جگہ امام صاحب کے نزدیک ان کے مال مباح اور غیر معصوم ہوتے ہیں اور ربوی معاملات کے عدمِ جواز کی شرط دونوں طرف کے مال کا معصوم ہونا ہے۔ جب کفار کے اموال دارِ کفر میں معصوم نہیں ہیں تو وہاں ربوا کا تحقق بھی نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۱۴/ ۲۵۸ بحوالہ بدائع وغیرہ۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام نخعی، امام سفیان ثوری اور امام محمد نے حدیثِ مرسل ''لا ربوا بین المسلم والحربی ثمہ (دارالحرب میں مسلم و حربی کے درمیان ربوا نہیں ہوتا) یعنی وہ اگرچہ صورۃً ربوا ہے مگر حقیقۃً نہیں ہے، اور عقودِ فاسدہ و باطلہ کے ذریعہ جو منافع وہاں حاصل کئے جاتے ہیں وہ بھی ان عقود و معاملات فاسدہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے جائز ہیں کہ دارالحرب میں کئے جارہے ہیں، جہاں اموالِ کفار عصمتِ شرعی کے احاطہ سے باہر ہیں، لہٰذا وہاں صرف تراضیِ طرفین جوازِ منافع کے لئے کافی ہے، امام شافعی و امام ابو یوسف وغیرہ نے یہ خیال کیا کہ ربوی معاملات کا تعلق عقد سے ہے اور مسلمان کے لئے عقد فاسد کے ذریعہ منفعت حاصل کرنا جائز نہیں، اسی

لئے وہ کہتے ہیں کہ مسلمان کے لئے عقد کے لحاظ سے دارالحرب اور دارالاسلام برابر ہیں، للہذا ایسے معاملات دونوں جگہ ناجائز ہیں۔

امام شافعیؒ مرسل کو حجت نہیں مانتے، اس لئے بھی مذکورہ بالا حدیثِ مرسل سے متاثر نہیں ہوئے، حالانکہ وہ آثارِ صحابہ سے مؤید بھی ہے اور ایسی مرسل کو وہ بھی حجت مانتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ عبد وسید کے درمیان ربوا نہیں ہے، وہ بھی اسی طرح ہے کہ گو صورۃً وہ ربوا ہے مگر حقیقت میں ربوا نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے بعض دیارِ حرب والوں کو لکھا کہ تم جزیہ میں اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بیع کر سکتے ہو، اور حضرت یحییٰ بن سعید انصاری نے بھی اس میں کچھ حرج نہیں سمجھا، حالانکہ آزاد اولاد اور عورتوں کی بیع وشرا کا معاملہ دارالاسلام میں کفار سے جائز نہیں ہوسکتا۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابراہیمؒ سے نقل کیا کہ دارالحرب میں ایک دینار کی بیع دو دینار سے کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اور حضرت سفیان سے بھی محدث کبیر ابن مبارک نے ایسا ہی نقل کیا، وغیرہ ان آثارِ صحابہ وتابعین سے بھی دارالحرب کے اندر عقودِ فاسدہ و باطلہ ومعاملاتِ ربویہ کا جواز ہی نکلتا ہے۔ (تفصیل اعلاء السنن جلد ۱۴ میں ہے)

آخر میں گزارش ہے کہ پوری تفصیل ودلائل کے لئے درجِ ذیل کتب کا مطالعہ کریں: مشکل الآثار امام طحاویؒ ص ۲۴۷ جلد رابع۔ تفسیر مظہری ص ۲/۱۵۲، مشکلات القرآن ص ۱۱۴ خطبہ صدارت شاہ صاحبؒ ص ۲۷/۲۰، اعلاء السنن ص ۳۵۴۔۲۸۰ جلد ۱۴۔ انوار الباری ص ۲۰۰/۱۹۹ جلد اول۔ نطق انور ص ۱۶۶/۱۴۶۔ فتاوے عزیزی جلد اول فتاویٰ مولانا عبدالحیٰ فرنگی محلیؒ جلد دوم۔ ہدایہ اولین مع الحواشی اور بدائع ومبسوط د جامع صغیر ودیگر کتبِ فقہ حنفی۔

(۷) دارِکفر میں اموالِ کفار کے غیر معصوم ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے اموال چوری، ڈکیتی یا دوسرے غلط طریقوں سے حاصل کئے جائیں کیونکہ ایسا کرنا مسلمانوں کے لئے بہرصورت اور ہرجگہ ناجائز ہے۔ البتہ رضامندی سے جو معاملات باہم طے ہوں وہ سب جائز ہوتے ہیں اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ ربوی معاملات ہوں یا عقودِ فاسدہ و باطلہ وہ سب دارِکفر میں جائز ہوتے ہیں۔ اور اموال کی مذکورہ صورت کے سوا کفار کی جانوں یا دین وعزت وغیرہ سے تعرض کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔

(۸) دارالحرب کے لفظ سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ وہاں کے کفار سے مسلمانوں کی کوئی لڑائی ہے، بلکہ یہ محض اصطلاح ہے بمعنی دارِکفر جہاں احکام کفر نافذ ہوں اور غلبہ وشوکت غیر مسلموں کی ہو، بمقابلہ دار اسلام کے کہ جہاں اسلام ومسلمانوں کا غلبہ وشوکت ہو، اسی لئے دارالحرب ہی کی ایک قسم دارالامان بھی ہے اور ہر دارِکفر کے دارِاسلام کے ساتھ معاہدے بھی ہوسکتے ہیں۔ دارالامان، دارالخوف کے مقابل ہے۔ جہاں وہ مامون ومطمئن ہی نہ ہوں لیکن دونوں قسمیں دارالحرب ہی کی ہیں۔

خلاصہ: اوپر کی پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام اعظم اور دوسرے ائمہ واکابرِ امت کا فیصلہ شرعیہ بابتہ دیارِکفر نہ صرف دلائل شرعیہ کی رو سے بلکہ عقل ودانش کی روشنی میں بھی نہایت مضبوط ومستحکم ہے۔ ظاہر ہے کہ دیارِکفر میں مسلمانوں کے دین ومال وعزت کا تحفظ نہایت دشوار ہے، اور کسی ملک کے شریف حاکم ان امور کا تحفظ ضابطوں اور قانون کے ذریعہ کرتے بھی ہیں تو عوام کالانعام کی ظالمانہ یورشوں سے پناہ ملنی مشکل ہوتی ہے۔ اور ان کا ایک بڑا حربہ اقتصادی ومالی نقصان رسانی کا بھی کم نہیں ہوتا۔ اس لئے جب شریعت نے ہمارے لئے صرف ایک دروازہ کھلا رکھا ہے تو اس سے ہم صرف نظر کیوں کریں؟!

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب کسی دیارِکفر میں جان ومال، عزت ودین محفوظ نہ ہو تو اس سے ہجرت ہی کیوں نہ کرلی جائے، کیونکہ صرف مالی مشکلات کا حل وہاں حنفیہ کے مسلک پر نکلتا بھی ہے تو دوسری پریشانیوں کا حل تو پھر بھی کچھ نہیں ہے، تو اس کے لئے عرض ہے کہ ہجرت بھی آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے بھی شرائط ہیں، مثلاً یہ کہ دوسرے ملک میں ہمارے لئے معقول وموزوں جگہ ہو اور وہاں دوسری

مشکلات پیدا نہ ہوں۔ان سب باتوں کا فیصلہ علماءِ وقت کی صوابدید پر موقوف ہے۔اور یہ بات ہم اجتماعی ہجرت کے لئے لکھ رہے ہیں۔ انفرادی ہجرت ہروقت ہوسکتی ہے۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

آخر میں بحث مذکور کے چند اہم نکات

امام اعظمؒ نے جومسلک سورۂ نساء کی آیت نمبر۹۲ فان کان من قوم عدو لکم اور آیت نمبر۹۷ ظالمی انفسہم اوراحادیث صحاح بابۃ ممانعت اقامت دارکفروغیرہ سے جودارکفرودارِاسلام کا فرق متعین کیا ہے،اوردونوں کے احکام بھی الگ الگ کتاب وسنت وآثارِ صحابہ و تابعین کی روشنی میں بتائے ہیں،وہی مذہب نہایت قوی ہےاورامام شافعیؒ نے جودارالحرب میں قتلِ مسلم خطا میں کفارہ کے ساتھ دیت کو بھی واجب کیا ہے۔اوروہ آیت بالانمبر۹۲ کے بھی خلاف ہے،اوراسی لئے اس بارے میں امام ابو یوسفؒ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہےاورامام صاحب کے ساتھ ہوگئے ہیں۔(۲)امام اعظم وغیرہ نے جودارکفر میں اموال کفار کومباح الاصل مان کرتمام معاملات کی اجازت صرف تراضی طرفین کی بناپردی ہےوہ دار کے فرق ہی پرمبنی ہے، امام شافعیؒ وغیرہ نے دونوں داروں میں فرق نہیں کیا صرف عقود ومعاملات پرنظر کی لہٰذادونوں جگہ کے احکام مساوی کردیئے۔(۳)امام صاحب وغیرہ کے مسلک کے لئے عقلی دلائل بھی بہت زیادہ اورمستحکم ہیں۔ہم نے ۲۵۔۲۶ جمع کئے ہیں۔جواس مختصر میں ذکرنہیں کئے جاسکتے۔

(۴)موجودہ دورمیں جبکہ دنیا کےڈیڑھ سوملکوں میں سےتقریباًایک تہائی اسلامی ملک ہیں باقی سب دیارِکفر ہیں الکفر ملة واحدہ۔ اگرچہ حق تعالیٰ نے خاص نعمتوں سے مسلمانوں کونوازا ہے،مگرپھربھی وہ غیرمعمولی مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہیں۔اورخاص طور سے اقتصادی بدحالی سےان کو بچانانہایت ضروری ہے،ورنہ کا دالفقران یکون کفرا۔

(۵)ہندوستان کے دارالحرب ہونے کومشکوک سمجھنے والوں کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا مضمون نہایت اہم ہے۔

(۶)تقریباًایک سودیارِکفار میں بسنے والے مسلمانوں کی مشکلات اورتحفظ جان و مال کے مسائل کوحل کرنااورخاص طور سے غیر مسلمین کےظلم وبربریت سےان کو بچانانہ صرف تمام دیارِاسلام کا فرض ہے۔بلکہ تمام دنیائے انسانیت کا بھی ہے۔ہم نےاوپرواضح کیا ہے کہ ظلم کی صورت میں ملکی معاہدات مانع نہیں ہوسکتے۔اورامداد کی صورتیں غیرمحدود ہیں۔

بَابُ خُرُوْجِ الصِّبْيَانِ اِلَى الْمُصَلّٰى

(بچوں کے عیدگاہ جانے کا بیان)

۹۲۲. حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَابِسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ فِطْرٍ اَوْ اَضْحٰى فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ اَتَى النِّسَآءَ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ.

ترجمہ ۹۲۲۔ عبدالرحمٰن بن عابس روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ کے دن نکلا، تو آپ نے نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس آئے انہیں نصیحت کی، اور انہیں صدقہ دینے کا حکم دیا۔

تشریح:۔ حافظؒ اور علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب کی مطابقت ترجمۃ الباب سے نہیں ہے، کیونکہ اس میں حضرت ابن عباسؓ کے صغیر السن ہونے کا ذکر نہیں ہے، نہ بچوں کی شرکت عید کا ہے۔ لیکن امام بخاری نے اپنی عادت کے مطابق حدیث کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کیا ہے، جو ایک باب کے بعد آنے والی ہے اور اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے صغیر السن ہونے کا ذکر ولولا مکانی من الصغر ماشہدتہ سے کیا ہے۔

علامہ عینی نے دوسری مطابقت کی صورت یہ بھی بتائی کہ حضرت ابن عباسؓ جب حضور علیہ السلام کے ساتھ نماز عید کو نکلے تو اس وقت آپ کا بچپن ہی تھا، کیونکہ وفات نبوی کے وقت ان کی عمر ۱۳ برس تک پہنچی تھی۔

بَابُ اِسْتِقْبَالِ الْاِمَامِ النَّاسَ فِيْ خُطْبَةِ الْعِيْدِ وَقَالَ اَبُوْ سَعِيْدٍ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُقَابِلَ النَّاسِ

(عید کے خطبہ میں امام کا لوگوں کی طرف رخ کرنے کا بیان اور ابوسعید نے کہا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے۔)

۹۲۳. حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ ابْنُ طَلْحَةَ عَنْ زُبَيْدٍ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْبَرَآءِ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ اَضْحٰى اِلَى الْبَقِيْعِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ نُسُكِنَا فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا اَنْ نَّبْدَاَ بِالصَّلٰوةِ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدْ وَافَقَ سُنَّتَنَا وَمَنْ ذَبَحَ قَبْلَ ذٰلِكَ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ عَجَّلَهٗ لِاَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ ذَبَحْتُ وَعِنْدِيْ جَزَعَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّسِنَّةٍ قَالَ اذْبَحْهَا وَلَا تَفِيْ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَكَ.

ترجمہ ۹۲۳۔ حضرت براء روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ کے دن بقیع کی طرف تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر ہم لوگوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ سب سے پہلی عبادت ہماری اس دن یہ ہونی چاہئے کہ پہلے ہم نماز پڑھیں، پھر واپس ہوں اور قربانی کریں، جس نے یہ کیا، تو میری سنت کے موافق کیا، اور جس نے قبل اس کے ذبح کیا تو وہ گوشت ہے جو

اس نے اپنے گھر والوں کے لئے تیار کیا، قربانی نہیں ہے، ایک شخص کھڑا ہوا، اورعرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے تو نماز سے پہلے ذبح کرلیا، اور میرے پاس ایک سال سے کم کا بھیڑ کا بچہ ہے جو سال کے بچے سے زیادہ بہتر ہے۔تو آپ نے فرمایا کہ اسے ذبح کردو، اور تمہارے بعد کسی کے لئے کافی نہ ہوگا۔

تشریح:۔علامہ عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاری کے اس ترجمہ پر اعتراض ہوا ہے، کیونکہ جمعہ کے باب میں بھی خطبہ کے وقت امام کے لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا ترجمہ گزر چکا ہے، پھر یہاں تکرار کی کیا ضرورت تھی، خطبے سب ہی یکساں ہیں، اور حدیث بھی پہلے بــــاب التکبیر للعید میں گزر چکی ہے، جواب یہ ہے کہ کسی کو وہم ہوسکتا تھا کہ عید میں منبر وغیرہ نہیں ہوتا تو ممکن ہے خطبہ کا طریقہ بھی جمعہ کے خطبہ سے مختلف ہو، اس کا ازالہ کیا گیا۔(عمدہ ص ۳/۳۸۸)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں بقیع الغرقد، قبرستان والی بقیع مراد نہیں ہے، جیسا کہ علامہ عینی نے سمجھا بلکہ بقیع المصلیٰ مراد ہے(عیدگاہ والی) جس کے بارے میں شاعر نے کہا۔

الا لیت شعری هل تغیر بعدنا بقیع المصلے ام کعهد القرائن

کاش میں جان سکتا کہ کیا ہمارے بعد بقیع المصلے میں بھی حوادثِ زمانہ کی وجہ سے تغیر آ گیا ہے یا وہ ابھی تک اسی طرح ہے کہ ہم سب کے گھر آمنے سامنے تھے۔بقیع اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مختلف اقسام کے درختوں کی پرانی جڑیں ہوں۔حافظ ایسی لمبی تحقیقات لغویہ میں جاتے ہی نہیں۔لہٰذا خاموشی سے گزر گئے۔عینی سے چوک ہوگئی، جس کی اصلاح حضرتؒ نے فرمادی۔رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

بَابُ الْعَلَمِ بِالْمُصَلّٰی

(عیدگاہ میں نشان کا بیان)

۹۲۴۔ حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ سُفْيٰنَ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَابِسٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍؓ قِيْلَ لَهٗ اَشَهِدْتَ الْعِيْدَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ نَعَمْ وَلَوْلَا مَكَانِيْ مِنَ الصِّغَرِ مَا شَهِدْتُهٗ حَتّٰى اَتَى الْعَلَمَ الَّذِيْ عِنْدَ دَارِ كَثِيْرِ بْنِ الصَّلْتِ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ اَتَى النِّسَآءَ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَرَاَيْتُهُنَّ يَهْوِيْنَ بِاَيْدِيْهِنَّ يَقْذِفْنَهٗ فِيْ ثَوْبِ بِلَالٍ ثُمَّ انْطَلَقَ هُوَ وَبِلَالٌ اِلٰى بَيْتِهٖ۔

ترجمہ۹۲۴۔عبدالرحمٰن بن عابس روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا، ان سے پوچھا گیا، کہ کیا آپ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید کی نماز میں شریک ہوئے ہیں، تو فرمایا ہاں! اگر میرا بچپن نہ ہوتا تو میں اس واقعہ کا مشاہدہ نہ کرسکتا۔آپ اس نشان کے پاس آئے جو کثیر بن صلت کے گھر کے پاس تھا، آپ نے نماز پڑھی۔پھر خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس آئے، اس حالت میں کہ آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ نے ان عورتوں کو نصیحت کی اور صدقہ کا حکم دیا، میں نے ان عورتوں کو دیکھا کہ اپنے ہاتھ جھکاتیں، اور بلال کے کپڑے میں ڈالتی جاتی تھیں، پھر آپ اور بلال اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

تشریح:۔یہاں بتایا گیا کہ پہلے زمانہ میں عیدگاہ کی باقاعدہ باؤنڈری بنا کر جگہ مقرر نہ تھی، بلکہ دارِ کثیر بن الصلت کے پاس ایک نشان اونچا سا تھا، جس سے اس جگہ کی پہچان کی جاتی تھی۔اور حدیث الباب کتاب الجمعہ سے چار باب پہلے بھی گزر چکی ہے۔باب وضوء الصبیان میں۔(عمدہ ص ۳/۳۸۹)۔

حافظؒ نے یہ بھی لکھا کہ دار کثیر تو حضور علیہ السلام سے بھی بعد کو بنا ہے اور یہاں بعد کے لوگوں کو سمجھانے کے سے اس مقام کی تعیین کی

گئی ہے۔ (فتح ص ۲/ ۳۱۷)۔ قوله ثم اتى النساء پر حافظ نے لکھا کہ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے مردوں سے الگ دوسری جگہ تھی اور مردوں عورتوں کا اختلاط نہیں تھا۔

قوله و معه بلال ۔ حافظ نے لکھا اس سے معلوم ہوا کہ آدابِ شرعیہ میں سے یہ بھی ہے کہ عورتوں کو وعظ و نصیحت کے وقت ضرورت سے زیادہ مرد ساتھ نہ ہوں، کیونکہ یہاں صرف حضرت بلالؓ بطور خادم کے اور صدقہ وصول کرنے کے لئے تھے اور حضرت ابن عباسؓ تو بچے ہی تھے۔ (فتح ۲/ ۳۱۸)۔

بَابُ مَوْعِظَةِ الْإِمَامِ النِّسَآءَ يَوْمَ الْعِيْدِ

(امام کا عید کے دن عورتوں کو نصیحت کرنے کا بیان)

۹۲۵. حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ نَصْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ اَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَطَآءٌ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْفِطْرِ فَصَلّٰى فَبَدَاَ بِالصَّلٰوةِ ثُمَّ خَطَبَ فَلَمَّا فَرَغَ نَزَلَ فَاَتَى النِّسَآءَ فَذَكَّرَهُنَّ وَهُوَ يَتَوَكَّأُ عَلٰى يَدِ بِلَالٍ وَّ بِلَالٌ بَاسِطٌ ثَوْبَهٗ تُلْقِيْ فِيْهِ النِّسَآءُ الصَّدَقَةَ قُلْتُ لِعَطَآءٍ زَكٰوةُ يَوْمِ الْفِطْرِ قَالَ لَا وَلٰكِنْ صَدَقَةٌ يَّتَصَدَّقْنَ حِيْنَئِذٍ تُلْقِيْ فَتَخَهَا وَيُلْقِيْنَ قُلْتُ لِعَطَآءٍ اَتَرٰى حَقًّا عَلَى الْاِمَامِ ذٰلِكَ وَيُذَكِّرُهُنَّ قَالَ اِنَّهٗ لَحَقٌّ عَلَيْهِمْ وَمَالَهُمْ لَا يَفْعَلُوْنَهٗ قَالَ ابْنُ جُرَيْجٍ وَاَخْبَرَنِي الْحَسَنُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَاؤُسٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ شَهِدْتُّ الْفِطْرَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَ عُثْمَانَ يُصَلُّوْنَهَا قَبْلَ الْخُطْبَةِ ثُمَّ يُخْطَبُ بَعْدُ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ حِيْنَ يُجَلِّسُ بِيَدِهٖ ثُمَّ اَقْبَلَ يَشُقُّهُمْ حَتّٰى جَآءَ النِّسَآءَ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ الْاٰيَةَ ثُمَّ قَالَ حِيْنَ فَرَغَ مِنْهَا اَنْتُنَّ عَلٰى ذٰلِكَ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ وَّاحِدَةٌ مِّنْهُنَّ لَمْ يُجِبْهُ غَيْرُهَا نَعَمْ لَا يَدْرِيْ حَسَنٌ مَّنْ هِيَ قَالَ فَتَصَدَّقْنَ فَبَسَطَ بِلَالٌ ثَوْبَهٗ ثُمَّ قَالَ هَلُمَّ لَكُنَّ فِدَآءٌ اَبِيْ وَاُمِّيْ فَيُلْقِيْنَ الْفَتَخَ وَالْخَوَاتِيْمَ فِيْ ثَوْبِ بِلَالٍ قَالَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ اَلْفَتَخُ الْخَوَاتِيْمُ الْعِظَامُ كَانَتْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ.

ترجمہ ۹۲۵۔ حضرت عطاء حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی، پہلے تو نماز پڑھی، پھر خطبہ کہا، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو منبر سے نیچے اترے، اور عورتوں کے پاس آئے اور انہیں نصیحت کی، اس حال میں کہ بلال کے ہاتھ پر ٹیکا دیئے ہوئے تھے، اور بلال اپنا کپڑا پھیلائے ہوئے تھے، جس میں عورتیں خیرات ڈال رہی تھیں، میں نے عطاء سے پوچھا کیا صدقہ دے رہی تھیں، تو انہوں نے کہا نہیں بلکہ خیرات کر رہی تھیں، اس وقت اگر ایک عورت اپنا چھلا ڈالتی تو دوسری بھی ڈالتیں۔ میں نے عطاء سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں امام پر یہ واجب ہے کہ وہ عورتوں کو نصیحت کرے، انہوں نے کہا، کہ بلاشبہ یہ واجب ہے انہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسا نہیں کرتے، ابن جریج نے کہا کہ مجھ سے حسن بن مسلم نے بہ سند طاؤس حضرت ابن عباس سے بیان کیا کہ ابن عباس نے کہا کہ میں عید الفطر میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کے ساتھ شریک ہوا۔ سب کے سب قبل خطبہ کے نماز پڑھتے، پھر خطبہ دیتے تھے، نبی صلے اللہ علیہ وسلم نکلے، گویا میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، جب آپ لوگوں کو اپنے ہاتھوں کے اشارہ سے بیٹھا رہے تھے، پھر آپ ان صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے، یہاں تک کہ عورتوں کے پاس پہنچ گئے اور آپ کے ساتھ بلال تھے، آپ نے آیت یا یها النبی اذا جاء ک (الخ) آخر تک پڑھی، پھر جب اس سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ تم اس پر قائم ہو تو ان عورتوں میں سے صرف ایک عورت نے کہا ہاں، اور اس کے علاوہ کسی عورت نے آپ کی بات کا جواب نہیں دیا،

حسن کو معلوم نہیں کہ وہ کون عورت تھی۔ آپ نے فرمایا تو تم لوگ خیرات کرو۔ اور بلال نے اپنے کپڑے پھیلا دیئے، اور کہا کہ تم لاؤ، میرے ماں باپ تم پر نثار ہوں تو وہ عورتیں اپنی انگوٹھیاں اور چھلے بلال کے کپڑے میں ڈالنے لگیں، عبدالرزاق نے کہا کہ فتخ سے مراد بڑی انگوٹھیاں ہیں، جن کا رواج عہدِ جاہلیت میں تھا۔

تشریح:۔ باب موعظة الامام النساء حافظ نے لکھا کہ یہ اس لئے ہوا تھا کہ عورتیں دور تھیں اور وہ حضور علیہ السلام کا خطبۂ عید نہ سن پائی ہوں گی، اور اب بھی ایسا ہی ہے کہ اگر عورتوں کے لئے الگ سے وعظ و نصیحت کرنے کی ضرورت ہو تو جائز ہے بشرطیکہ امن ہو اور کوئی مفسدہ یا خرابی واقع نہ ہو۔ علامہ ابن بطال نے لکھا کہ حضور علیہ السلام جو الگ سے عورتوں کے پاس گئے، اور نصیحتیں فرمائیں، یہ صرف آپ کے لئے جائز تھا کہ آپ ان کے لئے بمنزلہ باپ کے تھے (فتح ص ۲/۳۱۹ و عمدہ ص ۳/۳۹۲)۔

حافظ نے لکھا کہ حدیث الباب سے عورتوں کا عیدگاہ جانے کا جواز بھی معلوم ہوا، جو شافعیہ کا مسلک ہے، ہم اس پر آگے مفصل کلام کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

قولہ انری حقا علی الامام، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ بظاہر حضرت عطاء اس کو واجب ہی سمجھتے تھے، اور اسی لئے قاضی عیاض نے لکھا کہ اس کا قائل عطاء کے سوا کوئی نہیں ہے۔ علامہ نووی وغیرہ نے فرمایا کہ علماء نے اس کو مستحب قرار دیا ہے۔ (عمدہ ص ۳/۳۹۱)۔

قولہ قال عبدالرزاق پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ صاحب مصنف مشہور ہیں، اور امام احمدؒ سے قبل تک تصانیف میں احادیثِ مرفوعہ اور آثار صحابہ و تابعین مختلط ہوتے تھے، امام احمد نے سب سے پہلے مرفوع کو موقوف و آثار سے الگ کیا اور صرف مرفوعات کو مدون کیا، اور امام محمدؒ نے سب سے پہلے فقہ کو حدیث سے الگ کیا، ورنہ سب سے پہلے۔ ملا تھا اور یہی راز ہے نرے محدثین کے حنفیہ سے ناراض ہونے کا۔ یہ کام فقہاء محدثین کا تو پسندیدہ تھا، لیکن محدثین غیر فقہاء کے مزاج و مسلک کے خلاف تھا۔ میں نے نیل الفرقدین میں کچھ چبھتے ہوئے جملے لکھ دیئے ہیں۔

فائدہ مہمہ: حضرتؒ نے فرمایا کہ جرح و تعدیل کے سلسلہ میں ہم نے جو تجربہ کیا اور بعد کو بھی لوگ تجربہ کرلیں گے، وہ یہ کہ جرح و تعدیل والے غیر موضع خلاف میں تو صرف ظاہری حالِ راوی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر اس کو صائم و قائم اور غیر مخالفِ ظاہر شرع دیکھا تو بلا نکیر کے توثیق کردی، حتیٰ کہ بعض ایسے لوگوں کی بھی توثیق کردی ہے جن پر کفر کی تہمت بھی لگ چکی ہے، لیکن اس کی وجہ سے بھی کوئی جرح نہ کی اور صرف اس کے ظاہری صلاح پر نظر کی، مگر جب اختلافی موقع آیا تو پھر انہوں نے سارے ضابطے و قاعدے ختم کردیئے، خاص طور سے حنفیہ کے حق میں کہ ان سے تو محدثین ناراض ہی رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض نے تو ان سے احادیث بھی روایت نہیں کیں۔ اب یہاں عبدالرزاق ہی کو دیکھ لو کہ ان سے بھی احادیث لی ہیں۔ جبکہ ان پر شیعیت کی مہر لگی ہوئی ہے، اگرچہ وہ سب صحابہ کے مرتکب نہ تھے، مگر احادیثِ حنفیہ سے اعراض ہی رہا ہے۔

لہٰذا معتمد بات اس بارے میں یہ ہے کہ ایک شخص کا حال خود اپنی جگہ دیکھا جائے اگر تحقیق و تتبع کے بعد اس کا صلاح و حفظ ثابت ہو جائے تو پھر اس کے حق میں دوسروں کے اقوال کا لحاظ نہ کیا جائے کہ کسی ایک کیلئے سب لوگوں کی رضامندی حاصل کرنا ناممکن ہے، ہمیں اپنے ہی علم و تجربہ پر فیصلہ کرنا چاہئے، عیاں راچہ بیاں، البتہ اگر کسی کا حال ہمیں خود نہ معلوم ہو سکے تو مجبوری ہے کہ دوسروں پر اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔ میرا مقصد اس تفصیل سے یہ نہیں کہ ان کے فیصلوں پر سے اعتماد اٹھا دوں، بلکہ یہ بتانا ہے کہ غور و فکر کیا جائے ان کے کس قول اور فیصلہ کو کس مرتبہ میں رکھنا ہے اور خود بھی غور و تامل اور تحقیق حالات کر کے حقیقتِ حال تک پہنچنے کی سعی کرنا ضروری ہے۔ حضرتؒ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جرح و تعدیل اور علم الرجال کا علم اب بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کبھی پہلے تھا، اور آج کل جو حضرات درس و تالیفِ حدیث کا شغل رکھتے ہیں ان کو اس فرض سے غافل نہ ہونا چاہئے، علامہ کوثریؒ بھی اسی طرح اس علم کی اہمیت پر زور دیا کرتے تھے۔ اور یوں بھی حدیث کا آدھا علم رجال میں ہے، ہم نے پہلے بھی لکھا تھا کہ علامہ ابن القیم تک کو اکابر علماء حدیث نے ضعیف فی علم الرجال کہا ہے، تو ہم کس شمار میں ہیں؟!

بَابٌ إذَالَمْ يَكُن لَّهَا جِلْبَابٌ فِي الْعِيدِ

(عورت کے پاس عید میں چادر نہ ہو (تو کیا کرے)

۹۲۶. حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ حَدَّثَنَا اَيُّوْبُ عَنْ حَفْصَةَ بِنْتِ سِيْرِيْنَ قَالَتْ كُنَّا نَمْنَعُ جَوَارِيَنَا اَنْ يُّخْرُجْنَ يَوْمَ الْعِيْدِ فَجَآءَ تِ امْرَاَةٌ فَنَزَلَتْ قَصْرَبَنِيْ خَلَفٍ فَاَتَيْتُهَا فَحَدَّثَتْ اَنَّ زَوْجَ اُخْتِهَا غَزَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثِنْتَيْ عَشَرَةَ غَزْوَةً فَكَانَتْ اُخْتُهَا مَعَهٗ فِيْ سِتَّةِ غَزَوَاتٍ قَالَتْ فَكُنَّا نَقُوْمُ عَلَى الْمَرْضٰى وَنُدَاوِى الْكَلْمٰى فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللهِ اَعَلٰى اِحْدَانَا بَاْسٌ اِذَالَمْ يَكُنْ لَّهَا جِلْبَابٌ اَلَّا تَخْرُجَ فَقَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا فَلْيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَتْ حَفْصَةُ فَلَمَّا قَدِمَتْ اُمُّ عَطِيَّةَ اَتَيْتُهَا فَسَاَلْتُهَا اَسَمِعْتِ فِيْ كَذَا وَكَذَا فَقَالَتْ نَعَمْ بِاَبِيْ وَقَلَّمَا ذَكَرَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَتْ بِاَبِيْ قَالَ لِتَخْرُجِ الْعَوَاتِقُ ذَوَاتُ الْخُدُوْرِ اَوْقَالَ الْعَوَاتِقُ وَذَوَاتُ الْخُدُوْرِ شَكَّ اَيُّوْبُ وَالْحُيَّضُ فَتَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى وَلْيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَتْ فَقُلْتُ لَهَا الْحُيَّضُ قَالَتْ نَعَمْ اَلَيْسَ الْحَآئِضُ تَشْهَدُ عَرَفَاتٍ وَّتَشْهَدُ كَذَاوَتَشْهَدُ كَذَا.

ترجمہ ۹۲۶۔ حضرت حفصہ بنت سیرین روایت کرتی ہیں کہ ہم اپنی لڑکیوں کو عید کے دن نکلنے سے روکتی تھیں۔ ایک عورت آئی اور قصر بنی خلف میں اتری، میں اس کے پاس پہنچی تو اس نے بیان کیا کہ اس کی بہن کا شوہر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ غزوات میں شریک ہوا تھا، تو اس کی بہن چھ غزوات میں اپنے شوہر کے ساتھ تھی، اور اس نے بیان کیا کہ ہم لوگوں کا کام مریضوں کا علاج اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا تھا، تو اس نے کہا کہ یارسول اللہ کیا ہم لوگوں میں سے کسی کے لئے اس باب میں کوئی مضائقہ ہے کہ وہ (عید کے دن) نہ نکلے اگر اس کے پاس چادر نہ ہو، آپ نے فرمایا کہ اس کی ہم جولی اسے اپنی چادر اڑھادے۔ اور چاہئے کہ وہ لوگ نیک کام میں شریک ہوں، اور مومنین کی دعا میں حاضر ہوں۔ حفصہ نے کہا کہ جب ام عطیہ آئیں تو میں ان کے پاس پہنچی اور ان سے پوچھا کہ آپ نے اس کے متعلق کچھ سنا ہے۔ تو انہوں نے کہا ہاں، آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، اور جب کبھی بھی وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا نام لیتیں تو یہ ضرور کہتیں کہ میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں، آپ نے فرمایا کہ پردے والی جوان عورتیں باہر نکلیں، یا یہ فرمایا کہ پردے والی جوان عورتیں نکلیں، ایوب کو شک ہوا اور حائضہ عورتیں بھی نکلیں لیکن وہ نماز کی جگہ سے علیحدہ رہیں اور نیک کام اور مومنین کی دعا میں شریک ہوں، حفصہ کا بیان ہے کہ میں نے ام عطیہ سے کہا کہ کیا حائضہ عورتیں بھی نکلیں، انہوں نے کہا کہ کیا حائضہ عرفات میں اور فلاں فلاں جگہ میں نہیں جاتی ہے۔

تشریح:۔ علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب اول باب "شهود الحائض العيدين" میں بھی گزری ہے۔ اور وہاں تشریح و بحث آچکی ہے، مقصد یہ ہے کہ کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو تو دوسری اس کو عاریۃً دے دے تاکہ وہ ستر کے ساتھ عیدگاہ جاکر نماز یا دعا میں شرکت کر سکے (عمدہ ص ۳/۳۹۳)۔

بَابُ اِعْتِزَالِ الْحَيَّضِ الْمُصَلّٰى

(حائضہ عورتوں کا نماز کی جگہ سے علیحدہ رہنے کا بیان)

۹۲۷. حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِيْ عَدِيٍّ عَنِ ابْنِ عَوْنٍ عَنْ مُحَمَّدٍ قَالَ قَالَتْ اُمُّ عَطِيَّةَ اُمِرْنَا اَنْ نَخْرُجَ فَنُخْرِجَ الْحُيَّضَ وَالْعَوَاتِقَ وَذَوَاتِ الْخُدُوْرِ وَقَالَ ابْنُ عَوْنٍ اَوِ الْعَوَاتِقَ ذَوَاتِ الْخُدُوْرِ فَاَمَّا الْحُيَّضُ فَيَشْهَدْنَ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَدَعْوَتَهُمْ وَيَعْتَزِلْنَ مُصَلَّاهُمْ.

ترجمہ ۹۲۷۔ محمد، ام عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ ام عطیہ نے فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ باہر نکلیں، چنانچہ حائضہ اور نو جوان اور پردے والی عورتیں باہر نکلیں) عیدگاہ کے لئے) اور ابن عون نے کہا کہ یا عواتق ذوات الخدور (یعنی پردے والی نوجوان عورتیں) چنانچہ حائضہ عورتیں مسلمانوں کی جماعت اور انکی دعاؤں میں حاضر ہوتیں، اور ان کی نماز پڑھنے کی جگہوں سے علیحدہ رہتی تھیں۔

تشریح:۔ حافظؒ نے لکھا: حدیث الباب سے جو عورتوں کے لئے نماز عید کے لئے نکلنے کا وجوب اخذ کیا گیا ہے وہ تو محلِ نظر ہے، کیونکہ اس میں وہ بھی مامور ہیں جو مکلف نہیں ہیں، البتہ ان کے خروج کے مستحب ہونے کا حکم ضرور نکلتا ہے، خواہ وہ عورتیں جوان ہوں یا نہ ہوں اور اچھی شکل و صورت کی ہوں یا نہ ہوں، اور سلف سے اس بارے میں اختلاف نقل ہوا ہے، قاضی عیاض نے حضرت ابوبکر و علی و ابن عمرؓ سے وجوب نقل کیا ہے اور ہمارے سامنے ابن ابی شیبہ کا اثر بھی حضرت ابوبکر و علی سے ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر عورت پر حق ہے کہ وہ عیدین کے لئے نکلے، اس میں حق کے لفظ سے وجوب بھی محتمل ہے اور تاکدِ استحباب بھی حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حسب استطاعت اپنے اہل کو عیدگاہ لے جاتے تھے، اس سے بھی وجوب کی صراحت نہیں ملتی، بلکہ ان سے ممانعت بھی مروی ہے، ممکن ہے دو مختلف احوال کے لئے ایسا ہوا ہو اور بعض نے ان کے فعل کو استحباب پر ہی محمول کیا ہے، اور اسی کو شافعیہ میں سے جرجانی نے اور حنابلہ میں سے ابن حامد نے اختیار کیا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ سے ام میں اچھی صورت شکل والی عورتوں کا استثناء ثابت ہوتا ہے، آپ نے فرمایا کہ میں نماز میں بوڑھی اور کم رو عورتوں کا حاضر ہونا پسند کرتا ہوں اور ان کا عیدوں کے موقع پر شرکت کرنا اور بھی زیادہ پسند کرتا ہوں، امام شافعیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ ایک حدیث روایت کی گئی ہے کہ عورتوں کو عیدین جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے، پس اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہے تو میں بھی اس کا قائل ہوں۔ محدث بیہقی نے کہا کہ یہ ثابت ہے، اور بخاری و مسلم میں بھی ہے، یعنی حدیث ام عطیہ (یہی حدیث الباب بخاری) لہٰذا تمام شافعیہ کو اسی کا قائل ہونا چاہئے لیکن امام طحاوی نے کہا کہ احتمال ہے حضور علیہ السلام نے شروع اسلام میں پردہ نشین اور جوان عورتوں کے نکلنے کا حکم اس لئے کیا ہو کہ اس وقت مسلمان کم تھے۔ عورتوں کی وجہ سے کثرت معلوم ہوگی اور دشمنوں پر رعب قائم ہوگا، اب اس کی ضرورت نہیں ہے، اس پر اعتراض ہوا کہ نسخ تو احتمال کے ذریعے ثابت نہیں ہوسکتا، حافظ نے لکھا کہ ام عطیہ کا فتویٰ بھی امام طحاوی کے خلاف ہے، جو حضور علیہ السلام سے مدت بعد کا ہے۔ پھر یہ کہ کسی صحابی سے بھی اس کی مخالفت ثابت نہیں ہوئی، اور حضرت عائشہؓ کا ارشاد کہ "حضور علیہ السلام اس زمانہ کی عورتوں کے طور طریقوں کو دیکھتے تو ان کو مساجد جانے سے روک دیتے، نادر ہے، اس لئے ام عطیہ کے فتوے سے معارض نہیں ہوسکتا خاص طور سے جبکہ حضرت عائشہؓ نے ممانعت کا صریح فتویٰ بھی نہیں دیا ہے، اور دشمنوں پر رعب کی بات بھی محلِ نظر اس لئے ہے کہ عورتوں سے مدد لینا اور جنگ کے وقت ان کی وجہ سے اپنی کثرت ظاہر کرنا اپنی کمزوری بتانا ہے، لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ جوان عورتوں کا عیدگاہ جانا امن کی صورت پر رکھا جائے کہ ان کے وہاں جانے سے نہ وہ خود مبتلائے فتنہ ہوں، اور نہ ان کی وجہ سے مرد فتنہ میں پڑیں تو جاسکتی ہیں بشرطیکہ راستوں میں اور جمع ہونے کے مواضع میں بھی مردوں کے ساتھ مزاحمت و اختلاط نہ ہو۔ (فتح ص ۲/۳۲۰)

علامہ عینی کی طرف سے اور جواب

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جو پردہ دار عورتیں گھروں میں رہنے والی ہیں وہ عیدگاہ کے لئے نہ نکلیں اور امام طحاوی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، پھر علامہ نے حافظ کے مذکورہ بالا دلائل کا رد کیا ہے اور لکھا کہ دشمنوں پر رعب نہ پڑنے کی بات اس لئے درست نہیں کہ بہرحال عورتوں سے بھی تکثیر سواد ہوتی ہے اور دشمن کثرت سے ڈرتا ہے، اسی لئے آتا ہے کہ اکثر صحابہ بعض فتوحاتِ اسلامیہ میں عورتوں کو بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے تاکہ کثرت سے دشمن مرعوب ہوں بلکہ بعض مواضع میں انہوں نے مردوں کی امداد بھی کی ہے اور قتال میں بھی حصہ لیا ہے، مردوں کو بہادری اور جوانمردی کے جوہر دکھانے پر اکسایا بھی ہے۔) اور بعض عورتیں تو مردوں سے بھی زیادہ قوی القلب ہوتی ہیں اور بعض مردوں سے بھی زیادہ میدانِ حرب میں ثابت قدم نکلتی ہیں، اور یہ کہنا کہ عورتوں کی...... کمزوری کی وجہ سے ان پر جہاد بھی فرض نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی ناقابل تسلیم ہے کیونکہ نفیر عام کے موقع پر تو عورتوں اور غلاموں پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے اور وہ بھی اس شان سے کہ وہ اپنے شوہروں اور مالکوں سے بھی اجازت کی محتاج نہ ہوں گے۔

رہا یہ کہ ام عطیہ نے فتویٰ دیا تھا، تو میں کہتا ہوں کہ ان کی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے؟ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو مساجد کے بارے میں فرمایا تھا، پھر شہر سے باہر عیدگاہ جانے کو تو وہ اس سے بھی زیادہ ناپسند کرتی ہوں گی۔ (عمدہ ص ۳/۳۹۴)۔

بَابُ النَّحْرِ وَالذَّبْحِ يَوْمَ النَّحْرِ بِالْمُصَلّٰى

(عیدگاہ میں نحر اور ذبح کرنے کا بیان)

۹۲۸. حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِي كَثِيرُ بْنُ فَرْقَدٍ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَنْحَرُ أَوْ يَذْبَحُ بِالْمُصَلّٰى.

ترجمہ ۹۲۸۔ حضرت نافع حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نحر یا ذبح عیدگاہ میں کرتے تھے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ زیادہ بہتر یہی تھا کہ عیدگاہ میں قربانی ہو اور سلاطینِ اسلام بھی عیدگاہ میں ہی قربانی کیا کرتے تھے، حضرت شیخ الہندؒ نے بیان کیا کہ بہادر شاہ عیدگاہ میں جاتا تھا اور نماز پڑھتے ہی اونٹ کو جو کنارہ عیدگاہ پر ہوتا تھا، نحر کرتا تھا، پھر خطبہ میں شرکت کرتا تھا، اور بعد خطبہ کے کباب کھاتا تھا کہ اس عرصہ میں کباب وغیرہ تیار ہو جاتے تھے۔

ظاہر ہے یہ امور دارالاسلام کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ اور دارالحرب کی زندگی میں بہت سے شعائر وسنن سے محرومی ظاہر ہے، اور مجبوری بھی ہے۔ واللہ المسئول ان یوفقنا لما یحب ویرضی بجاہ سید نا النبی الکریم صلے اللہ علیہ وسلم۔

بَابُ كَلَامِ الْإِمَامِ وَالنَّاسِ فِي خُطْبَةِ الْعِيدِ وَإِذَا سُئِلَ الْإِمَامُ عَنْ شَيْءٍ وَّهُوَ يَخْطُبُ

(خطبۂ عید میں امام اور لوگوں کے کلام کرنے کا بیان، اور جب امام سے کچھ پوچھا جائے، جب کہ وہ خطبہ پڑھ رہا ہو)۔

۹۲۹. حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو الْأَحْوَصِ قَالَ حَدَّثَنَا مَنْصُورُ بْنُ الْمُعْتَمِرِ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ خَطَبَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ فَقَالَ مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَنَسَكَ نُسُكَنَا فَقَدْ أَصَابَ النُّسُكَ وَمَنْ نَسَكَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ فَتِلْكَ شَاةُ لَحْمٍ فَقَامَ أَبُو بُرْدَةَ بْنُ نِيَارٍ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ لَقَدْ نَسَكْتُ قَبْلَ أَنْ أَخْرُجَ إِلَى الصَّلٰوةِ وَعَرَفْتُ أَنَّ الْيَوْمَ يَوْمُ أَكْلٍ وَّشُرْبٍ فَتَعَجَّلْتُ

وَاَکَلْتُ وَاَطْعَمْتُ اَهْلِيْ وَجِيْرَانِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْکَ شَاةُ لَحْمٍ قَالَ فَاِنَّ عِنْدِيْ عَنَاقًا جَزْعَةً لَهِيَ خَيْرٌ مِنْ شَاتَيْ لَحْمٍ فَهَلْ تَجْزِيْ عَنِّيْ قَالَ نَعَمْ وَلَنْ تَجْزِيَ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَکَ.

۹۳۰. حَدَّثَنَا حَامِدُ بْنُ عُمَرَ عَنْ حَمَّادِ بْنِ زَيْدٍ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ مُحَمَّدٍ اَنَّ اَنَسَ ابْنَ مَالِکٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ خَطَبَ فَاَمَرَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلٰوةِ اَنْ يُّعِيْدَ ذَبْحَهُ فَقَامَ رَجُلٌ مِّنَ الْاَنْصَارِ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ جِيْرَانٌ لِّيْ اِمَّا قَالَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّاِمَّا قَالَ بِهِمْ فَقْرٌ وَّاِنِّيْ ذَبَحْتُ قَبْلَ الصَّلٰوةِ وَعِنْدِيْ عَنَاقٌ لِّيْ اَحَبُّ مِنْ شَاتَيْ لَحْمٍ فَرَخَّصَ لَهُ فِيْهَا.

۹۳۱. حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْاَسْوَدِ عَنْ جُنْدُبٍ قَالَ صَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ ذَبَحَ وَقَالَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ فَلْيَذْبَحْ اُخْرٰى مَكَانَهَا وَمَنْ لَّمْ يَذْبَحْ فَلْيَذْبَحْ بِاسْمِ اللّٰهِ.

ترجمہ ۹۲۹۔ شعبی، براء بن عازب سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد یوم نحر میں خطبہ دیا تو آپ نے فرمایا کہ جس نے میری نماز کی طرح نماز پڑھی اور ہماری قربانی کی طرح اس نے قربانی کی، تو اس کی قربانی صحیح ہوئی اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا تو یہ گوشت کی بکری ہے۔ ابو بردہ بن نیار کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں نے تو عید گاہ جانے سے پہلے ہی قربانی کردی اور میں نے سمجھا کہ آج کھانے اور پینے کا دن ہے اس لئے میں نے جلدی کی۔ اور میں نے خود کھایا اور اپنے گھر والوں کو اور پڑوسیوں کو کھلایا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو گوشت کی بکری ہے، ابو بردہ نے کہا، کہ میرے پاس ایک سال سے کم کا بچہ ہے یہ گوشت کی دو بکریوں سے زیادہ بہتر ہے، کیا وہ میری طرف سے کافی ہوجائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں لیکن تمہارے بعد کسی دوسرے کے لئے کافی نہ ہوگا۔

ترجمہ ۹۳۰۔ حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا، تو اس خطبہ میں آپ نے حکم دیا کہ جس نے نماز سے پہلے قربانی کی ہے وہ دوبارہ قربانی کرے، انصار میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میرے پڑوسی ہیں اور وہ فقیر محتاج ہیں اور میں نے نماز سے پہلے ہی (ان کی وجہ سے) ذبح کردیا ہے، اور میرے پاس ایک سال سے کم کا جانور ہے، جو گوشت کی دو بکریوں سے بہتر ہے، آپ نے اسے اس کی اجازت دے دی۔

ترجمہ ۹۳۱۔ حضرت جندبؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھی، پھر خطبہ دیا، پھر ذبح کیا اور فرمایا کہ جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا، تو اس کی جگہ پر دوسرا جانور ذبح کرے، اور جس نے ذبح نہیں کیا ہے، تو وہ اب اللہ کے نام سے ذبح کرے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ کتب حنفیہ میں ۸-۱۰ خطبے گنوائے ہیں، جن کا سننا واجب ہے، حتیٰ کہ خطبۂ نکاح اور خطبۂ ختم قرآن مجید بھی ہے، شاید کسی لڑکے کا ختم قرآن ہوتا تھا تو جمع ہوکر خطبہ ہوتا ہوگا، کیونکہ یہ مروج ہے، باقی تراویح کے ختم پر تو ہے ہی نہیں، میرے نزدیک خطبۂ جمعہ تو واجب ہے اور عید کا اس سے کچھ کم ہے، اور باقی سب مثل مواعظ کے ہیں کہ کوئی اٹھ جائے، کوئی بیٹھا رہے، عید کا کم اس لئے کہتا ہوں کہ حدیث میں مصرح ہے کہ جس کا جی چاہے چلا جائے اور جو چاہے بیٹھا رہے، ارسال وغیرہ کے جھگڑے پڑے ہوئے ہیں، مگر بے سود۔

رہا خطبہ سننا اور دوسری باتوں وغیرہ میں مشغول نہ ہونا تو ابن الہمام سے تصریح ملی ہے کہ استماع وخاموشی کا حکم ماسوی الامام کے لئے ہے امام کلام کرسکتا ہے اور سوال کا جواب بھی دے سکتا ہے اور شاید امام بخاری نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے اور وہ بھی خطبۂ عید میں بہ نسبت جمعہ کے وسعت سمجھتے ہوں گے جو میرا بھی مختار ہے، اگرچہ ہماری کتابوں میں دونوں کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔

قولہ فلیذبح باسم اللہ حضرتؒ نے فرمایا کہ ذبح کے لئے ماثور بسم اللہ واللہ اکبر واو کے ساتھ بھی ہے اور بغیر واو کے بھی

ہے اور ایسے ہی کھانے کے وقت بھی ہے، البتہ وضو سے پہلے معجم طبرانی میں بسم اللہ والحمدللہ وارد ہے، عینی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، مگر میں نے اس میں علت دیکھی ہے پھر فرمایا کہ اہلال کے لئے تکبیر ہی آئی ہے، اسی لئے وہ نماز سے پہلے بھی ہے اور ذبح کے وقت بھی بخلاف تسبیح وغیرہ کے کہ وہ ان کے لئے کہیں وارد نہیں ہوئیں، کیونکہ اہلال کسی چیز کو خالص اللہ کے لئے گردانا اور قرار دینا ہے، جو نماز و ذبح دونوں کے لئے ضروری ہے، کیونکہ غیر مسلم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور ان ہی کے نام پر ذبح بھی کرتے ہیں۔

بَابُ مَنْ خَالَفَ الطَّرِيْقَ اِذَا رَجَعَ يَوْمَ الْعِيْدِ

(عید کے دن راستہ بدل کر واپس ہونے کا بیان)

۹۳۲۔ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْ تَمِيْلَةَ يَحْيَى بْنُ وَاضِحٍ عَنْ فُلَيْحٍ بْنِ سُلَيْمَانَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ خَالَفَ الطَّرِيْقَ تَابَعَهُ يُوْنُسُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ فُلَيْحٍ عَنْ سَعِيْدٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَحَدِيْثُ جَابِرٍ اَصَحُّ.

ترجمہ ۹۳۲۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم واپسی میں راستہ بدل کر آتے۔

تشریح:۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ عیدگاہ کو ایک راستہ سے جانا اور دوسرے سے آنے میں نیک فال ہے، کیونکہ اسی سے واپسی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جیسے پہلے کام کو ادھیڑ دیا، دوسرے اس میں اظہار شوکت بھی ہے، اور اسی لئے وہ بچوں اور عورتوں کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ کابل میں امیر حبیب اللہ کے زمانہ تک بادشاہ بھی عیدگاہ جاتا تھا، اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہ بھی، غرض شوکت کا اظہار جس طرح ہو بہتر ہے۔ علامہ عینی نے بیس وجہ راستہ بدلنے کی ذکر کی ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں: دونوں راستے گواہی دیں گے، دونوں راستوں کے جن و انسان گواہ ہوں گے، دونوں راستوں کے ساکن اس خوشی میں شریک ہوں گے۔ راستہ بدلنے میں فال نیک ہے کہ حال بھی بدلا ہے اور حق تعالیٰ کی رضا اور مغفرت لے کر لوٹے ہیں۔ دونوں راستوں کے اقارب احیاء و اموات کی زیارت حاصل ہوگی۔ (عمدہ ص ۳/ ۳۹۷)۔

بَابٌ اِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَكَذٰلِكَ النِّسَآءُ وَمَنْ كَانَ فِي الْبُيُوْتِ وَالْقُرٰى لِقَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا عِيْدُنَا يَا اَهْلَ الْاِسْلَامِ وَاَمَرَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ مَوْلَاهُ ابْنَ اَبِيْ عُتْبَةَ بِالزَّاوِيَةِ فَجَمَعَ اَهْلَهُ وَبَنِيْهِ وَصَلّٰى كَصَلٰوةِ اَهْلِ الْمِصْرِ وَتَكْبِيْرِهِمْ وَقَالَ عِكْرِمَةُ اَهْلُ السَّوَادِ يَجْتَمِعُوْنَ فِي الْعِيْدِ يُصَلُّوْنَ رَكْعَتَيْنِ كَمَا يَصْنَعُ الْاِمَامُ وَقَالَ عَطَآءٌ اِذَا فَاتَهُ الْعِيْدُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ۔ (جب عید کی نماز فوت ہو جائے تو دو رکعتیں پڑھ لے عورتیں بھی، اور جو لوگ گھروں میں اور گاؤں میں ہوں، ایسا ہی کریں، کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے مسلمانو! یہ ہماری عید کا دن ہے، اور انس بن مالک نے اپنے غلام ابن ابی عتبہ کو زاویہ میں حکم دیا، تو انہوں نے ان کے گھر والوں اور بیٹوں کو جمع کیا اور شہر والوں کی نماز اور تکبیر کی طرح نماز پڑھی اور عکرمہ نے کہا کہ دیہات کے لوگ عید میں جمع ہوں، اور دو رکعت نماز پڑھیں، جس طرح امام کرتا ہے، اور عطا نے کہا کہ جب اس کی عید کی نماز فوت ہو جائے تو دو رکعتیں پڑھ لے۔)

۹۳۳۔ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ اَبَابَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ فِيْ اَيَّامِ مِنًى تُدَفِّفَانِ وَتَضْرِبَانِ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَّجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَابَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ وَّتِلْكَ الْاَيَّامُ اَيَّامُ مِنًى وَّقَالَتْ عَآئِشَةُ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِيْ وَاَنَا اَنْظُرُ اِلَى الْحَبَشَةِ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ فِي

الْمَسْجِدِ فَزَجَرَهُمْ عُمَرُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْهُمْ اَمْنًا بَنِیْ اَرْفَدَةَ يَعْنِيْ مِنَ الْاَمْنِ.

ترجمہ ۹۳۳۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ ان کے پاس آئے اور ان کے پاس ایام منیٰ میں دولڑکیاں تھیں جو دف بجا کر گا رہی تھیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنا چہرہ کپڑے سے ڈھانپے ہوئے لیٹے تھے۔ حضرت ابوبکر نے ان لڑکیوں کو ڈانٹا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا کہ اے ابوبکرؓ ان دونوں کو چھوڑ دو اس لئے کہ یہ عید کے دن ہیں، اور یہ دن منیٰ کے ہیں۔ اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مجھے چھپا رہے ہیں، اور میں حبشیوں کی طرف دیکھ رہی ہوں، کہ وہ مسجد میں کھیل رہے ہیں، ان کو عمرؓ نے ڈانٹا، تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو اے بنی ارفدہ تم اطمینان سے کھیلو۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں دو مسئلے ہیں ایک تو دیہات میں عید کی نماز جائز ہونے کا، دوسرے اس کی قضا کا مثل اداء کے مع تکبیرات کے کہ وہ جمعہ کی طرح نہیں ہے، جس کی قضا نہیں ہے، اور اس کی جگہ ظہر پڑھی جائے گی امام بخاری نے دونوں مسئلوں کو ایک ہی ترجمۃ الباب میں رکھ دیا ہے، اسی لئے وہ عورتوں کا ذکر بھی لائے ہیں اور ان لوگوں کا بھی جو دیہات میں رہتے ہیں، جبکہ جمعہ کے بیان میں امام بخاری نے عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ کیا تھا، لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ جو بھی عید کی نماز کا دیہات میں قائل ہو وہ جمعہ فی القریٰ کا بھی قائل ہو، پھر یہ کہ ہمارے یہاں درمختار میں مسئلہ ہے کہ سنتوں کی قضا نہیں ہے، اس میں مسامحت ہوئی ہے، عنایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ ان کی بھی قضا ہے لیکن وہ مرتبہ سنت میں نہیں رہتی، بدرجۂ مستحب ہو جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت کا ثبوت حضور علیہ السلام کے استمرار فعل سے ہوتا ہے اور اس فعل کا تعلق اسی وقت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب وقت چلا گیا تو اس کی اہمیت بھی وہ نہ رہی، بخلاف فرض و واجب کے کہ وہ امر وقول سے ثابت ہوتا ہے، لہٰذا وقت کے بعد بھی وہ امر متوجہ رہے گا اور مطالبہ باقی رہے گا، اسی سے علماءِ اصول نے لکھا ہے کہ موجب وقت میں امر ہے، اگر وقت پر ادا نہ کیا تب بھی مطالبہ مستمر رہا، سنن فعلی ہیں، لہٰذا وہ وقت کے ساتھ مخصوص ہو گئیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مالکیہ کی "مختصر خلیل" میں عجیب بات دیکھی کہ سنن کی قضا حرام ہے، اس کو دیکھ کر تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، کس طرح ایسی بات لکھ دی۔

غرض جب ہمارے یہاں بھی سنتوں کی قضا ہے تو فوت ہونے پر بعد کو پڑھ لے گا، مگر تکبیرات نہ ہوں گی، یہ میں کہتا ہوں ورنہ کتب فقہ میں تکبیرات کے بارے میں کچھ نہیں ہے۔ ضمناً فرمایا کہ مولانا عبدالحئی صاحب صاحب لکھنویؒ کی سعایہ اور کتابوں سے اعلیٰ سے مولوی عبدالحق خیر آبادی کی بھی، بہت سی کتابیں دیکھ چکا ہوں، سوائے حل لغات کے کچھ نہیں ہے۔ ان سے زیادہ معقول مولانا عبدالحئی صاحب کو آتی تھی۔ لیکن دینیات میں ان کے پاس صرف نقل تھی۔ فرمایا کہ اگر کسی مصنف کی کتابیں پڑھ کر اس کے علم کا درجہ معلوم نہ کر سکے تو ایسے مطالعہ سے کیا فائدہ؟

حضرت انسؓ کا اثر بھی امام بخاری نے یہاں پیش کیا ہے، جو جمعہ فی القریٰ کے قائل نہ تھے کہ جب وہ بصرہ میں آتے تھے تو جمعہ پڑھا کرتے تھے، اور نہ ظہر۔ اور عید کی قضا کے قائل ہم بھی ہیں۔ لہٰذا قضا ماننے سے یہ لازم نہیں کہ اس کو وہ دیہات میں فرض مانتے ہوں، البتہ حضرت عکرمہ دیہات میں نماز عید قائم کرنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت عطاء نے جمعہ فی القریٰ میں حنفیہ کی موافقت کی ہے، لہٰذا وہ بھی حنفیہ کی طرح قضاءِ عید کے قائل ہوں گے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ کوئی صراحت امام بخاری سے بھی اس امر کی نہیں ہے کہ وہ دیہات میں عید قائم کرنے کے قائل ہیں، کیونکہ انہوں نے فائتہ کا مسئلہ لکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ اعادہ فوات کے سبب کیا ہو، نہ اس کے لئے کہ نماز عید دیہات میں فرض ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ علماء نے جو جمعہ کی قضا نہیں رکھی، اور اس کے فوت ہونے پر ظہر پڑھنے کو کہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل ظہر ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے، اسی لئے جمعہ قائم کرنے کے لئے شرائط ہیں جن کے تحقق و یقین کے بغیر اس کو قائم نہیں کر سکتے اور جہاں جمعہ کی

شرائط پوری ہوں، وہاں اس کو قائم کرنا بھی ضروری ہے (لہٰذا عید اگر جمعہ کے دن واقع ہو تو اس دن میں جمعہ کو ساقط کر دینا بھی بغیر کسی حجت شرعیہ قطعیہ کے صحیح نہ ہوگا) اس کی بحث عنقریب آ رہی ہے۔ ان شاءاللہ۔

بَابُ الصَّلٰوةِ قَبْلَ الْعِيْدِ وَبَعْدَهَا وَقَالَ اَبُوْ الْمُعَلّٰى سَمِعْتُ سَعِيْدًا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَرِهَ الصَّلٰوةَ قَبْلَ الْعِيْدِ

(عید کی نماز سے پہلے اور اس کے بعد نماز پڑھنے کا بیان، اور ابوالمعلے نے کہا، میں نے سعید کو ابن عباس کے متعلق کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے عید کی نماز سے پہلے نماز کو مکروہ سمجھا)

۹۳۴۔ حَدَّثَنَا اَبُوْ الْوَلِيْدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِیْ عَدِیُّ ابْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ سَعِيْدَ بْنَ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمَ الْفِطْرِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا وَمَعَهٗ بِلَالٌ

ترجمہ ۹۳۴۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن نکلے اور دو رکعت نماز اس طرح پڑھی کہ نہ تو اس سے پہلے نماز پڑھی اور نہ اس کے بعد پڑھی اور آپ کے ساتھ بلالؓ تھے۔

تشریح:۔ عید کے دن نماز عید سے قبل نوافل حتیٰ کہ نماز اشراق بھی مکروہ ہے، البتہ بعد کو نفل پڑھ سکتے ہیں مگر وہ بھی گھر واپس آ کر، عید گاہ میں وہ بھی نہ پڑھے، کیونکہ حضور علیہ السلام سے وہاں پڑھنا ماثور نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

تکملہ بحث نمازِ جمعہ وعیدین

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جمعہ فی القریٰ کا مسئلہ موافق حنفیہ کے بخاری ص ۸۳۵ کتاب الاضاحی میں ہے، جہاں حضرت عثمانؓ سے نمازِ عید جمعہ کے دن پڑھانے کا ذکر ہے اور آپ نے خطبۂ عید میں فرمایا کہ تم میں سے جو ارد گرد کے دیہات کے لوگ ہیں وہ چاہیں تو جمعہ کی نماز تک ٹھہریں اور جو لوٹنا چاہیں، ان کو اجازت ہے جا سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ دیہات کے لوگوں پر جمعہ نہیں ہے، اگر شہر میں ہوں تو پڑھ لیں، ورنہ نہیں، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ عید جمعہ کے دن ہو تو اس دن بھی شہر میں نمازِ جمعہ ہوگی، جس کی بحث ہم یہاں ذرا تفصیل سے لکھیں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت علیؓ سے تولا جمعة ولا تشريق الا فی مصر جامع او مدينه عظيمة وارد ہے (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲/۱۰۱) اور حضرت عمرؓ سے بھی شہروں کے لئے ہی جمعہ کا ثبوت ہے، (حضرت لیث بن سعد نے نقل کیا کہ حضرت عمر و عثمانؓ کے زمانوں میں، ان کے حکم سے اسکندریہ، مدائن مصر اور مدائن سواحل کے لوگ جمعہ پڑھا کرتے تھے، (اعلاء السنن ص ۸/۸) اور حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا تھا کہ جمعہ کہاں قائم کریں تو آپ نے انہیں لکھا کہ جہاں تم لوگ (عامل و گورنر و حکام) رہتے ہو، وہاں قائم کرو (اعلاء ص ۸/۹) معلوم ہوا کہ تینوں خلفاء کے زمانوں میں جمعہ دیہات میں نہ تھا۔ اور صرف شہروں میں قائم تھا۔ مصنف میں باب قائم کر کے حضرت حذیفہ وغیرہ سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ جمعہ صرف شہروں کے لئے ہے۔ مفصل بحث جمعہ کے باب میں گزر چکی ہے۔

اجتماعِ عیدین کے دن جمعہ ساقط نہ ہوگا

اس کیلئے ایک دلیل تو ابھی بخاری ص ۸۳۵ سے نقل ہوئی ہے جس پر حافظ نے ص ۱۰/۲۰ میں لکھا: قوله فقد اذنت له سے اس نے استدلال کیا ہے جو عید کی نماز پڑھنے سے جمعہ کو ساقط کرتے ہیں، اور یہ قول امام احمدؒ سے بھی نقل ہوا ہے جواب یہ کہ اجازت دینے سے اس امر کی تصریح نہیں ملتی کہ وہ نہ لوٹیں، اسلئے بہت سے لوگوں نے لوٹ کر جمعہ پڑھا بھی ہوگا، دوسرے ظاہر حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کو اجازت

دی تھی وہ اہلِ عوالی تھے، یعنی قریبی بستیوں کے رہنے والے جن پر دور ہونے کی وجہ سے جمعہ واجب نہیں تھا، تیسرے یہ کہ اصل مسئلہ (وجوبِ جمعہ) کیلئے حدیث مرفوع موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیہات والوں پر جمعہ حافظ کے نزدیک بھی فرض نہیں ہے، واللہ اعلم۔

علامہ عینی رحمہ اللہ: ص۲۱/۱۶۱ میں لکھا: عوالی، عالیہ کی جمع ہے، اس سے مراد مدینہ طیبہ سے ملحقہ شرقی دیہات ہیں، جن میں سے زیادہ قریب تین چار میل کے فاصلہ پر تھے اور زیادہ دور والے آٹھ میل پر تھے، قولہ فلینتظر سے مراد یہ ہے کہ اتنی دیر کریں کہ جمعہ پڑھ سکیں۔ قولہ ان یرجع سے مراد اپنے اپنے گھروں کو لوٹنا ہے کہ اس کی حضرت عثمانؓ نے اجازت دی، اس سے امام احمدؒ نے سقوطِ جمعہ پر استدلال کیا ہے، اور امام مالک نے بھی ایک مرتبہ ایسا کہا تھا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ قریبی دیہات سے عید و جمعہ کے لئے شہر میں آتے تھے، جن پر آنا واجب نہیں تھا، لہٰذا حضرت عثمانؓ نے ان کو لوٹ جانے کی اجازت بتائی۔

علامہ ابن رشدؒ: لکھا: ایک دن میں عید اور جمعہ دونوں جمع ہوں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ عید کی نماز کافی ہے اور اس دن جمعہ وظہر فرض نہیں صرف عصر کی نماز پڑھے گا، یہ عطاء کا قول ہے اور حضرت ابن زبیر و علیؓ سے بھی مروی ہے، دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ رخصت صرف دیہات والوں کے واسطے ہے جو شہروں میں خاص طور سے عید اور جمعہ کے لئے آجاتے ہیں جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے خطبۂ عید میں جمعہ کے دن فرمایا کہ باہر کے دیہات والوں میں سے جو جمعہ کا انتظار کرنا چاہے وہ انتظار کرے اور جو لوٹنا چاہے وہ لوٹ جائے، (موطا وامام مالک) اور ایسا ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی مروی ہے، اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے اور امام مالک و ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ جب عید و جمعہ ایک دن میں جمع ہوں تو مکلّف بندہ دونوں کا مخاطب ہے، عید کی نماز سنت ہونے کی وجہ سے اور جمعہ کی فرض ہونے کے سبب سے اور کوئی ایک نماز دوسری کے قائم مقام نہ ہوگی، یہی اصلِ شرعی ہے الا یہ کہ اس بارے میں دوسری اصلِ شرع آئے، جس پر عمل کریں اور حضرت عثمانؓ کے قول سے بھی استدلال اس لئے ہے کہ انہوں نے ایک ایسی بات کہی جو رائے سے نہیں کہی جاسکتی ہے، اور وہ امرِ توقیفی ہے۔ لہٰذا وہ بھی اصولِ شرعیہ کے تحت ہی ہے، البتہ فرضِ ظہر اور جمعہ کا اسقاط نمازِ عید کی وجہ سے، یہ بات بغیر دوسری دلیل و اصلِ شرع کے ہے اور اصولِ شرع کے بہت ہی زیادہ خلاف ہے۔ (بدایۃ المجتہد ص۱/۱۸۶)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ

آپ نے امیر یمانی کا قول نقل کیا کہ حدیثِ ابن زبیرؓ سے ثابت ہوا کہ نمازِ عید پڑھ لینے کے بعد نمازِ جمعہ رخصت و اختیاری ہے، چاہے کوئی پڑھے یا نہ پڑھے البتہ امام اور تین آدمی اس کے ساتھ نمازِ جمعہ پڑھیں گے عطا کے نزدیک یہ حکم رخصت کا سب کے لئے ہے، امام وغیرہ کا استثناء بھی نہیں ہے۔ پھر حضرتؒ نے امام شافعیؒ کا ارشاد ام سے نقل کر کے لکھا کہ حدیثِ ابی داؤد میں انا مجمعون صریح و واضح ہے کہ اہلِ مدینہ پڑھیں گے اور رخصت صرف اہلِ قریٰ کے لئے تھی اور ابن عباس و ابن زبیر دونوں صغیر السن بھی تھے، ممکن ہے انہوں نے اس اعلان کو بھی کے لئے سمجھ لیا ہو اور اس پر عمل کر لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن زبیر نے جو تاخیر کر کے قبل الزوال دو رکعت پڑھیں وہ جمعہ ہی کی نیت سے پڑھی ہوں اور اسی میں نمازِ عید کی نیت کر لی ہو تا کہ دیہات کے لوگوں کو نصیحت ہو، اور شاید وہ بعض دوسروں کی طرح قبل الزوال جمعہ کو درست مانتے ہوں، (بذل ص۲/۱۷۳) یہ توجیہ اس لئے بہتر ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ کی طرف یہ نسبت کرنا کہ اس روز انہوں نے نہ جمعہ کی نماز پڑھی نہ ظہر اور یہ کہ عید کے بعد صرف عصر پڑھی، ان کی شان سے بہت مستبعد ہے۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم

حافظ کے قول وهو المحكي عن احمد پر لکھا کہ میں نے الروض وغیرہ ان کی فروع کی کتابوں میں امام احمد کا قول ایسا نہیں پایا۔

---

۱ اوجز ص۲/۳۴۲ میں ہے کہ کتب فروع حنابلہ الروض وغیرہ میں امام احمدؒ سے اس کی نقل نہیں ہے، لہٰذا اس کے قائل بعض حنابلہ اور ابن تیمیہ ہی معلوم ہوتے ہیں واللہ اعلم

۲ او پر ہم نے بخاری شریف ص۸۳۵ سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے، چونکہ وہ غیر مظان میں ہے، اس لئے اکثر بحث کرنے والے اس کا حوالہ نہیں دیتے، واللہ اعلم (مؤلف)

باقی نقل اس کو عینی نے بھی کر دیا ہے بلکہ انہوں نے امام مالک کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے امام شافعیؒ کی ام اور رافعی کی شرح الاحیاء کی عبارات نقل کیں کہ شہر کے لوگوں کے واسطے عید کے دن ترکِ جمعہ بلا عذر جائز نہیں ہے، صرف دیہات والوں کے لئے یہ گنجائش ہے کہ وہ عید پڑھ کر اپنے دیہات کو لوٹ جائیں اور جمعہ کے لئے نہ ٹھہریں، امام شافعی کے قولِ جدید و قدیم میں اسی طرح مصرح ہے، اور ایک شاذ قول یہ بھی ہے کہ ان کو بھی جمعہ کے لئے ٹھہرنا چاہئے۔

مالکیہ اور حنفیہ بھی اسی کے قائل ہیں ان کی دلیل ایک تو یہی ہے کہ اجازت صرف اہلِ عالیہ کے لئے ہے، دوسرے یہ بھی حدیث میں ہے کہ ہم جمعہ پڑھیں گے۔ یہ شہر والوں کے لئے صریح حکم معلوم ہوا، طحاوی میں بھی ذکوان سے مروی ہے کہ ہم جمعہ پڑھیں گے۔ اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں نمازِ جمعہ کی فرضیت ہے اس میں عید کے دن کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے سب دنوں کے لئے یکساں حکم ہے اس کے مقابلہ میں کوئی دلیل اسقاطِ جمعہ کے لئے ثابت نہیں ہے۔ (اوجز ص ۲/۲۴۱)

جد ابن تیمیہؒ کی رائے

جد ابن تیمیہ ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلام معروف بابن تیمیہ م ۶۵۲ھ نے اپنی گرانقدر حدیثی تالیف منتقی الاخبار میں " بابا ماجاء فی اجتماع العید و الجمعه" قائم کر کے زید بن ارقم، حضرت ابوہریرہ، وہب بن کیسان اور عطاء کے مرویات ذکر کئے اور ابن الزبیرؓ کا اثر نقل کر کے یہ بھی لکھا کہ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ جمعہ قبل الزوال کے قائل ہوں گے، لہٰذا جمعہ کو مقدم کر دیا ہوگا اور اس کو نمازِ عید سے بھی کافی سمجھا ہوگا۔

اس کو نقل کر کے شارح المنتقی، علامہ شوکانی م ۱۲۵۰ھ نے ریمارک کیا کہ اس توجیہ میں جو تعسف (بے راہ روی یا کج روی ہے، وہ ظاہر و باہر ہے، پھر موفق مغنی بن قدامہ کی عبارت نقل کر دی، جس میں طرفین کے دلائل کا ذکر ہے (بستان الاحبار ص ۱/۳۹۷)۔

علامہ ابن تیمیہ کے ارشادات

ناظرین کے سامنے امیر یمانی کا استدلال اور شوکانی کی درازلسانی آ چکی اب علامہ ابن تیمیہؒ م ۷۲۸ھ کی تحقیق بھی ملاحظہ کی جائے، جو نہ صرف اپنے ناناجان کے خلاف ہے، بلکہ جمہور کے بھی مخالف ہے اور خاص طور سے ان کے حسب عادت دعاوی اور عقلی دلائل قابلِ مطالعہ ہیں۔

(۱) عید اگر جمعہ کے دن واقع ہو تو علماء کے اس بارے میں تین قول ہیں۔ ۱۔ نمازِ عید پڑھنے والے پر نمازِ جمعہ بھی واجب ہے جیسے کہ اور سب دنوں میں واجب ہے دلائلِ وجوب عامہ کی وجہ سے۔ ۲۔ ملحقہ دیہات و عوالی کے لوگوں سے جمعہ ساقط ہے، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ان کو نمازِ عید پڑھا کر ترکِ جمعہ کی رخصت دی تھی۔ ۳۔ جو بھی نمازِ عید پڑھ لے، اس سے جمعہ ساقط ہو جائے گا، لیکن امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمعہ قائم کرے تا کہ جو پڑھنا چاہے وہ پڑھ لے اور وہ بھی پڑھ لیں جنہوں نے عید کی نماز نہیں پڑھی ہے۔

یہی تیسری صورت صحیح ہے اور یہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ، حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن مسعود...... ابن عباسؓ و ابن زبیرؓ و غیرہم سے منقول ہے اور صحابہ میں سے کسی سے اس کا خلاف معروف نہیں ہے۔

پہلے دو قول جن کے ہیں ان کو اس بارے میں سنتِ نبویہ کا علم نہیں ہوا کہ حضور علیہ السلام نے عید کی نماز پڑھا کر جمعہ کے بارے میں لوگوں کو رخصت دے دی تھی اور ایک روایت ان الفاظ سے ہے کہ تم نے (عید پڑھ کر) خیر حاصل کر لی، اب جس کا جی چاہے وہ جمعہ پڑھے، لیکن ہم تو جمعہ پڑھیں گے۔ (علامہ نے غور نہیں فرمایا کہ یہ تقسیم کیوں تھی؟ اس لئے تو تھی کہ باہر کے لوگ واپس جا سکتے تھے اور مدینہ کے لوگ حضور علیہ السلام کے ساتھ جمعہ پڑھنے والے تھے) دوسرے یہ کہ جب ایک شخص نے نمازِ عید میں شرکت کر لی تو اجتماع کا مقصد حاصل ہو چکا۔ (یعنی جمعہ کا مقصودِ اجتماع عید سے پورا ہو گیا) اب اگر وہ جمعہ نہ پڑھے گا اور اس کی جگہ ظہر اس کے وقت میں پڑھ لے گا تو کام پورا ہو گیا کہ عید

سے مقصودِ جمعہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر جمعہ کو بھی عید کے دن واجب قرار دیں تو لوگوں پر تنگی و سختی ہوگی، اور ان کی عید کا مقصود فوت ہوگا کہ ان کے لئے عید کے دن سرور وانبساط تجویز کیا گیا ہے، اگر ان کو اس سے روک دیں گے تو عید کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ چوتھے یہ کہ جمعہ کا دن بھی عید ہے اور فطر و نحر کا دن بھی عید ہے، اور شارع علیہ السلام کی سنت ہے کہ جب دو عبادتیں ایک جنس کی جمع ہوتی ہیں تو ایک کو دوسری میں داخل اور مدغم کر دیا جاتا ہے، جیسے وضو غسل کے اندر اور ایک غسل دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں ہوگا۔ واللہ اعلم (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱/۱۵۰ طبع مصر ۱۹۶۶ء)۔

(۳) دوسری بار پھر ایک کے سوال پر تحریر کیا کہ اس بارے میں فقہاء کے تین قول ہیں۔ ۱۔ جمعہ عید پڑھنے والے پر بھی ہے اور نہ پڑھنے والے پر بھی۔ امام مالک وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ ۲۔ جمعہ ان لوگوں سے ساقط ہے جو نواحی وسوادِ مصر کے ساکن ہیں، جیسا کہ حضرت عثمان سے مروی ہے کہ انہوں نے دیہات کے لوگوں کو جانے کی اجازت دی، اس کو امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے۔ ۳۔ جس نے عید پڑھ لی، اس سے جمعہ کی نماز ساقط ہو گئی، لیکن امام کو جمعہ قائم کرنا چاہئے، جیسا کہ سنن میں ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے عید کی نماز پڑھا کر جمعہ کی رخصت دے دی۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ نے رخصت دے کر فرمایا کہ ہم تو جمعہ پڑھیں گے۔ ان کے علاوہ سنن میں تیسری حدیث بھی ہے کہ ابن الزبیرؓ نے اول دن میں دونوں نمازوں کو جمع کیا، پھر صرف نمازِ عصر پڑھی (یعنی جمعہ کی نماز نہیں پڑھی) اور کہا کہ حضرت عمرؓ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ پھر یہی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم، نیز آپ کے خلفاء وصحابہ سے بھی ثابت ہے۔ اور یہی قول ان کا ہے جن کو اس کی خبر مل گئی جیسے امام احمد وغیرہ اور جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے وہ ہیں جن کو اس بارے میں سنن و آثار نہیں پہنچے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱/۱۷۳) حنابلہ وہ علامہ ابن تیمیہ کے جواب میں مزید تفصیل و دلائل کے لئے ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۸/۵۲ و اوجز ص ۲/۲۴۱ و بدایۃ المجتہد ص ۱/۱۸۶ و انوار الباری ص ۱۵/۱۰۹)۔

ابواب الوتر (احادیث نمبر ۹۳۵ تا ۹۴۸)

یہاں سے ہم متنِ بخاری شریف اور ترجمہ کا التزام ختم کرتے ہیں، کیونکہ اس سے شرحِ بخاری کا حجم بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ ابھی چوتھے پارے کے بھی سات ورق باقی ہیں، اور انوار الباری کا مع مقدمہ کے یہ اٹھارواں حصہ چل رہا ہے خیال ہے کہ اگر متن و ترجمہ کا التزام آخر تک رکھا جائے گا تو پوری کتاب پینتالیس سے بھی زیادہ حصوں میں آئے گی عربی شروحِ حدیث مطبوعہ ہند، فیض الباری، لامع الدراری، العرف الشذی و انوار المحمود وغیرہ میں بھی متن و ترجمہ کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ پاکستان والے متن و ترجمہ کو بھی ساتھ کر دیں، وہاں بھی خدا کا شکر ہے۔ انوار الباری کی طباعت و اشاعت کا انتظام ہو گیا ہے بلکہ مقدمہ کی دونوں جلدیں بہت عمدہ طباعت کے ساتھ، خوب صورت سنہری جلد میں شائع ہو چکی ہیں، اور موجودہ سترہ جلدیں شائع کرنے کے بعد وہ باقی حصے بھی وہیں طبع کرا کر شائع کرتے رہیں گے ان شاء اللہ العزیز۔ وہاں قوتِ خرید بھی زیادہ ہے اور قدر دان بھی ماشاء اللہ بہت زیادہ ہیں۔

امام بخاریؒ نے وتر سے متعلق سات ابواب و تراجم قائم کئے ہیں، جن میں ۱۳ احادیث مرفوع اور ایک اثرِ صحابی ذکر کیا ہے۔ پہلے باب میں نمازِ وتر کی اہمیت زیادہ واضح کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وجوبِ وتر کے مسلک میں امام ابو حنیفہؒ کی موافقت کر رہے ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ نے امام بخاری کے سواری دابہ کے وقت جوازِ وتر سے جو امام صاحب کی مخالفت سمجھی ہے، اس پر علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ یہ کیا ضروری ہے کہ حنفیہ و شافعیہ کی طرح وہ بھی دابہ پر فرض و واجب نماز کو بلا عذر غیر درست ہی سمجھتے ہوں، وہ کسی کے مقلد تو ہیں نہیں، یا حالتِ سفر کو عذر کا درجہ دیا ہو، اور شاید اسی لئے امام بخاریؒ نے باب الوتر علی الدابۃ کا عنوان دیا ہے۔ کیچڑ، دلدل یا بارش وغیرہ کو تو حالتِ عذر

سب ہی مانتے ہیں کہ اس میں فرض بھی سواری پر درست ہوتے ہیں۔ اور امام طحاویؒ نے لکھا کہ قدرتِ قیام کے وقت وتر بیٹھ کر پڑھنا بھی سب کے نزدیک بالاتفاق ناجائز ہے، اس سے بھی وجوب کی شق راجح ہوتی ہے۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ ابواب وتر میں ایک بات سب سے اہم یہ بھی ہے کہ صلوٰۃ اللیل (نماز تہجد) اور وتر دو الگ الگ نمازیں ہیں یا ایک ہیں، تمام محدثین تو ہر ایک کیلئے باب الگ الگ ہی قائم کرتے ہیں، امام بخاریؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، پھر چونکہ دونوں میں باہم ایک قسم کا رابطہ واتصال بھی ہے۔ اسی لئے صلوٰۃ اللیل کا ذکر ابواب وتر میں اور برعکس بھی آتا ہے۔ اور یہی حنفیہ کا نقطۂ نظر بھی ہے، کہ نماز وتر صلوٰۃ اللیل کا ایک ٹکڑا ہے جو اس سے بلحاظِ صورت، قراءت و رکعات وغیرہ الگ مستقل و ممتاز ہے، برخلاف شافعیہ کے کہ ان کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں بجز اس کے کہ وتر کی صرف ایک رکعت ہے، اسی لئے ان کے یہاں ایک ہزار رکعت بھی ایک سلام کے ساتھ مشروع ہیں۔

یہی وجہ ہوئی کہ جن کے نزدیک دونوں میں فرق نہیں، وہ وجوبِ وتر کے بھی قائل نہ ہو سکے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا اپنے اہل کو وتر کے لئے اٹھانا، (نہ کہ تہجد کے لئے) اور جو سو کر آخر رات میں نہ اٹھ سکے، اس کو اول شب میں اداءِ وتر کا حکم فرمانا، فوت ہونے پر قضاء کا حکم کرنا، وتر کے لئے الگ سے قراءت سور کی تعیین، اور وتر کے لئے وقت و رکعات کی بھی تعیین، پھر ترک نماز وتر کو بھی جائز نہ رکھنا، یہ سب امور ایسے ہیں جو وجوب کی کھلی علامات ہیں۔ پھر صرف اس میں نزاع رہ جاتا ہے کہ اس پر لفظِ وجوب کا اطلاق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ بات نزاع کا سبب بننے کے لائق نہیں ہے۔

تفردِ امام اعظمؒ کا دعویٰ

مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ وجوب وسنیتِ وتر کے مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ نزاعی ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ قاضی ابوالطیب نے یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ سارے علماء وائمہ تو ایک طرف ہیں جو وتر کو سنت مانتے ہیں حتیٰ کہ امام ابو یوسف وامام محمد بھی، اور صرف امام ابوحنیفہ دوسری طرف وجوب کے قائل ہوئے اور وہ اس مسئلہ میں منفرد ہیں۔ اسی طرح شیخ ابوحامد نے بھی دعویٰ کیا کہ وتر تو صرف سنتِ موکدہ ہیں، نہ فرض ہیں نہ واجب، اور یہی سواء امام ابوحنیفہ کے سارے ائمہ کا مسلک ہے، علامہ عینی نے دونوں علماء کا قول نقل کر کے لکھا کہ یہ سب تعصب کی بات ہے، اور تعجب ہے کہ ایسی صریح غلط بات انہوں نے کیسے کہہ دی جبکہ وہ مشہور امام ہیں، کیونکہ امام ابوحنیفہؒ اس مسئلہ میں تفرد کے الزام سے بالکل بری ہیں، ملاحظہ ہو قاضی ابوبکر بن العربی نے مشہور محدث وفقیہ سحنون اور اصبغ بن الفرج سے بھی وجوب نقل کیا ہے، ابن حزم نے امام مالکؒ کا قول نقل کیا کہ جو شخص وتر نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے اور اس کی شہادت قبول نہ ہوگی۔ یہی بات ابن قدامہ نے المغنی میں امام احمد سے بھی نقل کی۔ مصنفِ ابن ابی شیبہ میں بھی حضرت مجاہد کا قول بھی بسندِ صحیح وجوب (غیر فرض) کا مروی ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے بسندِ صحیح یہ روایت بھی نقل کی کہ مجھے سرخ اونٹ بھی ترک وتر کے عوض پسند نہیں علامہ ابنِ بطال نے حضرت ابنِ مسعود، حذیفہ وابراہیم نخعیؒ سے بھی وجوب کا قول نقل کیا، امام شافعیؒ کے شیخ یوسف بن خالد السمتی سے بھی وجوب ثابت ہے، ابن ابی شیبہ نے حضرت سعید بن المسیب وابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود اور ضحاک سے بھی وجوب نقل کیا ہے۔

ان سب حضرات اکابر واجلہ کی تائید وموافقت کے ہوتے ہوئے بھی امام صاحب پر تفرد کا دعویٰ کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ (اوجز ص ۱/۴۳۰) وحاشیہ بخاری ص ۱۳۶) امام رازی نے تفسیر سورۂ روم میں تحت قولہ تعالےٰ **فسبحان اللہ حین تمسون الآیہ** امام صاحب کے قول وجوبِ وتر ثلاث رکعات کو اقرب للتقویٰ قرار دیا۔

علامہ محقق کاسانیؒ نے اپنی مشہور ومعروف تالیف بدائع الصنائع میں بہت اچھی بحث وجوبِ وتر کی لکھی ہے۔ جس کو اوجز ص ۱/۴۳۱ میں

نقل کیا گیا ہے، اس میں حضرت حسن بصریؒ سے وجوب وتر پر اجماع بھی نقل کیا ہے اور امام طحاوی نے بھی اس پر اجماع سلف نقل کیا، ایسے ثقہ حضرات غلط بات نہیں کہہ سکتے، بدائع وغیرہ میں امام شافعیؒ کے استاذ وشیخ کا یہ واقعہ بھی نقل ہوا کہ "انہوں نے امام اعظمؒ سے وتر کے بارے میں گفتگو کی، اور آپ نے واجب بتایا تو وہ برداشت نہ کر سکے، غصہ سے کہا کہ آپ تو کافر ہو گئے، کیونکہ پانچ فرض نمازوں پر زیادتی کر دی، امام صاحب نے فرمایا کہ میں تمہارے حکم کفر سے نہیں ڈرتا، اس لئے کہ میں فرض وواجب میں فرق کو خوب جانتا ہوں کہ وہ زمین وآسمان میں فرق جیسا ہے، پھر امام صاحب نے ان کو فرق کی تفصیل اچھی طرح سمجھائی تو وہ مطمئن ہو گئے، اور معذرت کی، پھر آپ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل کیا۔"

یہاں ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جب مسئلہ کی نوعیت ایسی تھی تو امام اعظمؒ کے دونوں محترم تلامذہ امام ابو یوسف وامام محمد وجوب کے قائل کیوں نہ ہوئے؟ تو راقم الحروف اس کا جواب بھی عرض کرتا ہے۔ ہدایۃ المجتہد ص ۱/۶۷ میں امام اعظمؒ کے ساتھ آپ کے اصحاب کا قول بھی وجوب کا نقل ہوا ہے۔ حاشیۂ ہدایہ ص ۱۴۷ میں ہے کہ امام صاحب سے ظاہر میں کوئی منصوص روایت نہیں ہے لیکن یوسف بن خالد سمتی نے آپ سے وجوب نقل کیا، جو آپ کا مشہور مذہب قرار پایا، اور نوح بن ابی مریم نے آپ سے سنت کا قول نقل کیا جس کو امام ابو یوسف و امام محمد نے اختیار کیا، اور حماد بن زید نے آپ کا قول فرضیت کا نقل کیا، جس کو امام زفر نے اختیار کیا۔ صاحب ہدایہ نے لکھا کہ وتر کے منکر کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا وجوب سنت (غیر متواترہ) سے ثابت ہوا ہے اور یہی مراد ہے امام صاحب سے وتر کے سنت ہونے کی روایت کی۔ (پھر چونکہ واجب عملاً فرض کے درجہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے فرضیت کی روایت بھی نقل ہوئی، اگرچہ عقیدۃً وہ فرض نہیں ہے۔)

وجوب وتر کے لئے مرفوع احادیث بھی بہ کثرت ہیں، جن میں ابوداؤد، نسائی، ترمذی وابن ماجہ وغیرہ کی بھی ہیں۔ اوجز ص ۱/۴۳۱ میں ۲۴ ذکر کی گئی ہیں۔ ابوداؤد کی حدیث کے ایک راوی پر امام بخاری نے نقد کیا ہے، جس پر علامہ عینی نے لکھا کہ یہ حدیث صحیح ہے، اسی لئے حاکم نے بھی نقل کی اور تصحیح کی۔ اور امام بخاری کے متکلم فیہ راوی ابوالمنیب کو حاکم نے ثقہ کہا اور ابن معین نے بھی توثیق کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابوحاتم سے توثیق نقل کی، اور امام بخاری کی تضعیف پر ان کی نکیر کو بھی ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں صرف ایک اثر حضرت ابن عمرؓ کا پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے سواری پر وتر پڑھے۔ تو ہو سکتا ہے کہ کسی عذر سے پڑھے ہوں، دوسرے یہ کہ امام طحاوی وغیرہ نے ایسی روایات بھی پیش کی ہیں، جن سے ان کا سواری سے اتر کر پڑھنا بھی ثابت ہے تو اس سے دونوں روایتوں کا جمع کرنا بھی دشوار نہ رہا۔ دوسرے صحابہ حضرت عمرؓ وغیرہ سے بھی وتر پڑھنا سواری سے اتر کر...... ثابت ہوا ہے چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ صحابۂ کرام زمین پر اتر کر وتر پڑھا کرتے تھے، لہٰذا ان کا یہ اہتمام بھی وجوب وتر کے لئے دلیل بنتا ہے۔

قنوت کا مسئلہ: وجوب وتر کے بعد دوسرا اہم مسئلہ قنوتِ وتر کا ہے، کہ وہ کن نمازوں میں ہے اور رکوع سے قبل ہے یا بعد۔ اس میں حنفیہ وامام احمد کا مسلک یہ ہے کہ نمازِ وتر میں تمام سال تیسری رکعت کے رکوع سے قبل دعاءِ قنوت پڑھی جائے، اور قنوتِ نازلہ صرف بڑے حوادث ونوازل کے وقت پڑھی جائے جو رکوع سے قبل وبعد دونوں طرح درست ہے لیکن بہتر بعد میں ہے۔ یہ دعاءِ قنوت حنفیہ وامام احمد کے نزدیک صرف فجر کی نماز میں ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک سب نمازوں میں ہے۔ امام مالک کسی نماز میں بھی اس کے قائل نہیں۔ (ہدایۃ المجتہد ص ۱/۱۷۴)۔

امام شافعی کے نزدیک وتر میں قنوت صرف نصف آخر رمضان میں ہے، اور فجر کی نماز میں تمام سال پڑھی جائے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کے پاس قنوتِ وتر کی حدیث نہ ہوگی۔ اس لئے صرف قنوتِ نازلہ والی حدیث لا کر قنوتِ وتر کی طرف اشارہ کیا، کہ ان کے نزدیک بھی وہ درست ہے، اس طرح اس مسئلہ میں بھی حنفیہ وحنابلہ کی موافقت کی ہے۔

وقتِ نمازِ وتر: امام بخاری نے باب ساعات الوتر سے بتایا کہ نمازِ وتر کا وقت تمام رات ہے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حنفیہ نے دوسری احادیثِ بخاری وابوداؤد کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی صحیح کیا کہ اس کو نمازِ عشاء پر مقدم کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ ان احادیث میں وتر کو شب کی آخری نماز

بنانے کا حکم کیا گیا ہے، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ وتر کے بعد جو دو رکعت نفل بیٹھ کر حضور علیہ السلام سے ثابت ہیں، وہ اس کے منافی نہیں کیونکہ ان کی ہیئت وصورت بدل گئی ہے۔ حضرتؒ کی رائے گرامی اسی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنے کی فضیلت بھی تھی وللہ درہ۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ ایسا بیانِ جواز کے لئے کیا گیا، تیسری یہ کہ مراد حدیث میں آخری فرض وواجب نمازِ وتر کو بتانا ہے، لہٰذا نوافل اس کے خلاف نہیں ہیں۔ (راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اسی لئے جو شخص پوری نمازِ عشاء اور وتر پڑھ کر سو جائے کہ شاید آنکھ نہ کھلے، پھر جاگ کر آخر شب میں نوافل تہجد پڑھے تو وہ بھی حدیثِ مذکور کے خلاف نہیں ہے، واللہ اعلم، لامع الدراری اور بذل المجہود میں زیادہ مفصل بحث پڑھ لی جائے۔

وتر کی تین رکعات ایک سلام سے اور امام بخاری کی مخالفت

حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ بابِ وتر میں صرف یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس میں امام بخاری نے حنفیہ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے جزم کرلیا کہ دو سلام ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ اس کے لئے کوئی حدیثِ مرفوع نہ لا سکے۔ اس لئے صرف اثرِ ابن عمر سے استدلال کیا ہے، جبکہ حنفیہ کے پاس دوسرے اکابر صحابہ حضرت عمر، حضرت علی وابن مسعود وغیرہ ہیں جو ایک سلام سے تین رکعت بتاتے ہیں۔

مدونہ باب قیام رمضان میں ہے کہ آخری نماز تراویح کے بعد وتر کی تین رکعات تھیں۔ امام طحاوی نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا فیصلہ نقل کیا ہے کہ فقہاءِ سبعہ مدینہ طیبہ کی رائے پر وتر کی تین رکعات ایک سلام سے پڑھنے کا حکم فرمایا، اور امام طحاوی نے دوسرے اکابر فقہاء سے بھی یہی رائے نقل کی، پھر اس روایت میں اگرچہ عبدالرحمٰن بن ابی الزناد ہے، جس میں کچھ ضعف ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اس راوی سے امام بخاری نے بابِ استقاء میں تعلیقاً روایت لی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس موقع پر دوسرے حضرات نے یہ دلیل بھی پیش کی ہے کہ قول کو فعل پر ترجیح ہے، لہٰذا قولی حدیث مثنیٰ مثنیٰ والی راجح ہونی چاہئے۔ حضور علیہ السلام کی فعلی حدیث پر کہ آپ نے تین رکعات ایک سلام سے پڑھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں معاملہ برعکس۔ اس لئے ہے کہ حضور علیہ السلام کا مدۃ العمر کا عمل تین رکعات وتر ملا کر پڑھنے کا مروی ہے، جس کو حضرت عائشہؓ نے ہمیشہ ملاحظہ فرمایا اور حضرت ابن عباسؓ نے بھی جو حضور کی نمازِ وتر دیکھنے کے لئے ہی شب میں حضور کے ساتھ رہے، یہی بتایا، اس کے مقابلہ میں قولِ مذکور مبہم ہے، اور اس میں دوسری وجوہ نکل سکتی ہے۔

ایسی صورت میں کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ قول کو فعل پر ترجیح دی جائے، وہ تو جب ہی ہے کہ قول سے تشریع عام مفہوم ہو رہی ہو اور فعل واقعہ جزئیہ ہونے کی وجہ سے خصوصیتِ حال پر محمول ہو، پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ کسی امر کو حضور علیہ السلام کے لئے خصوصیت پر محمول کرنے میں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ وہ فعل باب عبادات میں آپ کے لئے افضل واعلیٰ بھی بن سکے۔ جیسے صومِ وصال وغیرہ، بخلاف استقبال واستدبار بوقت قضاءِ حاجت کے مثلاً، اس لئے کہ اگر ہم اس کو خصوصیت پر محمول کریں گے، تو وہ دلیلِ افضلیت نہیں بن سکتا، کیونکہ ہو سکتا ہے حضور علیہ السلام کا وہ استقبال اس لئے ہو کہ آپ فی ذاتہ کعبہ معظمہ سے افضل تھے، اور اسی لئے کراہتِ استقبال کی علت اٹھ گئی ہو، جو تحقیرِ کعبہ معظمہ ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہم مثنویت کی احادیث پر بھی عمل کرتے ہیں اور ان کو دو رکعت پر درمیانی قعدہ پر محمول کرتے ہیں، شافعیہ نے سلام کو بھی اس کے ساتھ لازم کرلیا ہے (الخ) ملاحظہ ہو کشف الستر وفیض الباری وغیرہ۔ حضرتؒ نے مسئلہ وتر پر مستقل رسالہ کشف الستر لکھا ہے جو احقر کے زمانہ نظامت مجلس علمی ڈابھیل میں شائع ہو گیا تھا، اس کو اور آپ کے دوسرے رسائل پڑھ کر آپ کے علومِ حدیث میں تبحر اور علمِ معقول ومنقول کے کمالات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، اور علومِ حدیث کے نوع بنوع دروازے کھلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جب ہی ہے کہ آپ کی تالیفات کا مطالعہ پوری وقتِ نظر کے ساتھ اور بار بار کیا جائے، ورنہ سطحی نظر سے تو ایک بڑا عالم بھی نہ کچھ سمجھے گا نہ جانے گا،

حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی" فرماتے تھے کہ میں نے وتر کے مسئلہ میں تمام محدثین کی ابحاث وتحقیقات کا مطالعہ کر چکنے کے بعد کشف الستر کا مطالعہ کیا اور صرف ایک بار نہیں بلکہ سترہ بار کیا تب میں سمجھ سکا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے کن کن مشکلات کو حل فرمادیا ہے، اور کس طرح علوم حدیث کے تحقیقاتی گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ رحمہما اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اس مختصر مگر عظیم حدیثی معلومات کے خزینہ کی حضرت محدث وفقیہ مشہور مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے اتنی قدر کی کہ اپنی محققانہ شرح کتاب الآثار امام محمد کے ص ۱۵۸ تا ص ۲۰۴ میں مکمل رسالہ درج کر دیا اور حاشیہ میں تسہیل وتائید کے ساتھ دلائل کی تکمیل بھی فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

امام بخاری کا جواب: اس عنوان سے چونکئے نہیں کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، کیونکہ ہم امام بخاری کی دلیل اثر ابن عمر کا جواب ان دونوں سے کہیں بڑے حضرات کے اقوال وآثار سے پیش کریں گے، اور پھر حسب اشارۂ لطیفہ حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری تو کوئی مرفوع حدیث بھی استدلال میں نہ لاسکے، ہوسکتا ہے وہ ان کی شرط پر نہ ہو مگر نہایت ادب سے گزارش ہے کہ جب محدث اسحٰق بن راہویہ کی تحریک و مشورہ پر صحیح مجرد کا مجموعہ مرتب کر کے پیش کرنے کا ارادہ ہوا تھا تو اس میں حدیث اپنی شرط پر نہ ملنے کی صورت میں یہی کیا ضروری تھا کہ اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر اثر صحابی ہی سے کام نکال لیا جائے، نام رکھا " الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سننہ و ایامہ" اور اس میں جگہ جگہ فقہ البخاری پر استدلال کی مجبوری کے تحت آثار صحابہ وتابعین بھی درج ہوئے ہیں، کہیں باب وعنوان میں اور کہیں متونِ حدیث کی جگہ بھی۔ جیسے یہاں باب الوتر کی پہلی حدیث کے تحت یہ بھی ذکر فرمادیا کہ حضرت ابن عمرؓ وتر کی دو رکعت پڑھ کر اپنے خدام سے باتیں بھی کرلیا کرتے تھے، تاکہ فقہ البخاری کا ایک مسئلہ وتر دو سلام کے ساتھ ثابت کیا جاسکے۔ اور آخر ابواب الوتر میں بھی حدثنا کے تحت بھی صرف اثر انس بن مالک کو ذکر کیا، وہاں بھی کوئی حدیث مرفوع نہیں لائے۔

ہماری مشکلات: یہ زمانہ علمی انحطاط کا ہے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے زمین وآسمان کا فرق ہوگیا۔ ابھی ہم نے حضرت علامہ کشمیری، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت علامہ عثمانی جیسے اکابر محدثین کو مسندِ حدیث کا صدر نشین دیکھا تھا، اور حضرت تھانویؒ کی جامعیت کی شان بھی دیکھی تھی کہ فنِ حدیث میں خود "جامع الآثار" لکھی اور اپنے تلامذہ سے اعلاء السنن کی ۱۸ ضخیم جلدیں چھپوا کر شائع کرادیں۔ اور اب دیکھتے ہیں تو یک دم میدان خالی نظر آنے لگا، کیا میں غلط لکھ رہا ہوں، اس دور کے شیوخ حدیث پر ایک نظر ڈال لیجئے، کتنے اس کے اہل ہیں کہ درسِ بخاری شریف کا حق ادا کرسکیں، اور ان کی نظر کتب حدیث ورجال پر بقدر کفاف وضرورت ہی ہو، نتیجہ یہ ہے کہ غیر مقلدوں کے وارے نیارے ہیں، خوب خوب مغالطہ آمیزیاں کر کے مذاہب ائمہ اربعہ کے خلاف زہر افشانی کرنے کے محبوب مشغلہ میں منہمک ہیں۔ اور جن پر جواب دہی کی ذمہ داری ہے وہ خواب غفلت کا شکار ہیں والی اللہ مشتکی۔

ہمارے محترم مولانا عبداللہ خاں صاحب کرت پوری (تلمیذ رشید حضرت علامہ کشمیریؒ) کو اپنی اس بات پر بڑا اصرار ہے کہ بخاری شریف کو دورۂ حدیث میں اب نہ رکھو کیونکہ اس دور کے اساتذۂ حدیث اس کا جواب تو دے نہیں سکتے، لہٰذا تلامذہ کا رجحان غیر مقلدیت کی طرف بڑھتا ہے، اور وہ فارغ التحصیل وسند یافتہ ہو کر عوام کے سامنے جاتے ہیں اور غیر مقلدوں کا جواب شافی نہیں دے سکتے، تو ہر جگہ کے عوام بھی غیر مقلد بنتے ہیں۔

خود انوارالباری کے بہت سے ناظرین ہمیں لکھتے ہیں کہ ہم تو غیر مقلدوں کے غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ فقہ حنفی میں بڑی خامیاں ہیں، اب انوارالباری کی وجہ سے ہماری حنفیت کو استحکام ملا ہے، اور ہم عدمِ تقلید کے فتنہ سے محفوظ ہوئے ہیں۔

ہمارے ضلع بجنور میں چونکہ حضرات اکابر دیوبند کی آمد ورفت کافی رہی ہے، اور یہاں نہ صرف تقلید وحنفیت بلکہ دیوبندیت پر بھی

عوام بڑی پختگی سے قائم رہے ہیں۔ مگر اب کچھ عرصہ سے دہلی و بمبئی کے غیر مقلدوں کے اثرات ادھر بھی آنے لگے ہیں۔ کیونکہ یہاں کے لوگ وہاں ملازمت و کاروباری سلسلہ سے جاتے ہیں۔

ایک واقعہ: چندروز قبل ایک قریبی بستی کے کچھ حنفی مسلمان اپنے ساتھ ایک عزیز کو لائے، جو بمبئی جا کر غیر مقلد بن چکا ہے اور یہاں جب آتا ہے تو اپنی بستی کے لوگوں سے کہتا ہے کہ تمہاری نمازیں صحیح نہیں ہوتیں کیونکہ تم امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے، اور یہ بھی کہتا ہے کہ ہم نے دیوبند سے فتویٰ منگالیا ہے کہ غیر مقلد امام کے پیچھے مقلدوں کی نماز ہو جاتی ہے۔ لہٰذا دیوبند والوں نے بھی ہماری نماز کو صحیح مان لیا ہے، مگر تمہاری نمازیں حدیث کے خلاف ہیں۔

وہ غیر مقلد صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ بتائیں کہ ان لوگوں کی نسبت سے ہماری نماز زیادہ صحیح ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ نماز کا مسئلہ تو پھر سوچئے گا، آپ یہ بتائیں کہ جس کی نماز آپ پڑھتے ہیں وہ کہاں ہے اور اس کے بارے میں آپ کا عقیدہ کیا ہے؟

کہنے لگے کہ خدا تو عرش کے اوپر بیٹھا ہے اور زمین و آسمان اور تمام کائنات اس کے اور ہمارے درمیان حائل ہے اور وہیں سے وہ ہم سب کو دیکھتا ہے، اس کا وجود سب جگہ نہیں ہے، اور ہونا بھی نہ چاہئے، کیا اس کی مقدس ذات ہر جگہ اور غلیظ و گندی جگہوں پر بھی ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا کہ یہی مغالطہ آپ کے بڑوں کو بھی ہوا ہے، سلف کا عقیدہ تو اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود مخلوق سے بائن اور جدا ہے باعتبار ذات وصفات کے۔ یہ لوگ یہ سمجھ گئے کہ وہ مخلوق سے بہت دور بھی ہے حتیٰ کہ پہاڑ کی چوٹیوں پر جو لوگ ہیں وہ بہ نسبت زمین والوں کے اللہ کے نزدیک ہیں اور وہ آسمانوں سے بھی اوپر اپنے عرش پر بیٹھا ہے، اور وہیں سے بیٹھ کر سب کو دیکھتا ہے اور سب کی باتیں سنتا ہے۔

سلف کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک جگہ یا مکان میں محدود نہیں ہے، نہ وہ عرش پر بیٹھا ہے اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اس کی یہی صفت بتائی گئی ہے، وہ حد و جہت سے بھی منزہ ہے، اور عرش پر بیٹھا ہوا مانیں تو اس کے لئے، حد، جسم اور جہت بھی ماننی پڑے گی، جو اس کی شان "لیس کمثلہ شیئ" کے خلاف ہے۔ مگر ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کا وجود بہت بڑا ہے جو عرش عظیم پر بھاری ہے، بلکہ ساری دنیا کے بھاری پہاڑوں وغیرہ سے بھی زیادہ بوجھل ہے، اسی لئے عرش اس کا تحمل نہیں کر سکتا اور کجاوے کی طرح چوں چوں کرتا رہتا ہے۔

حضرت تھانوی کا ارشاد

آپ نے لکھا کہ حق تعالیٰ کے لئے تمکن علی العرش کے دعوے کو فقہاء نے بناء علیٰ انکار النص کفر کہا ہے (فتاویٰ امدادیہ ص ۴/۱۲۶)۔

ایک مسامحت: حضرت تھانویؒ کی نہایت اہم تحقیقات عالیہ علمیہ بابۃ استواء علی العرش جوئی جگہ بوادر النوادر میں مذکور ہیں۔ اہل علم کے لئے ان کا مطالعہ نہایت ضروری واہم ہے البتہ ایک جگہ بعض مفسرین کی مسامحت کی وجہ سے حضرتؒ نے سلف کی طرف استواء بمعنی استقرار منسوب کیا ہے، وہ صحیح نہیں۔

استواء کے معنی سلف سے استعلاء، رفع رتبی وغیرہ ضرور منقول ہے، لیکن استقرار و تمکن، یا جلوس علے العرش کے معانی صحیح طور سے منقول نہیں ہوئے ہیں۔ وللتفصیل محل آخر۔

میں نے ان لوگوں کے سامنے ذات وصفات کی مزید تشریح اور غیر مقلدوں کے دوسرے عقائد کی بھی غلطی بیان کی، پھر یہ بھی کہا کہ جس کسی نے غیر مقلد کی اقتدا کو جائز کہا ہے اس کو آپ لوگوں کے عقائد سے واقفیت نہ ہوگی۔ تاہم اس کو یہ قید ضرور بڑھانی تھی کہ فروعی اختلاف تک تو صحتِ اقتدا کی گنجائش ہے، لیکن عقائد میں بھی سلف کی مخالفت ہو تو کسی طرح بھی جواز نہیں ہے۔

غیر مقلدوں کے بارے میں حضرت تھانوی کے ارشادات

(۱) غیر مقلد بہت طرح کے ہیں بعض ایسے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنا خلاف احتیاط یا مکروہ یا باطل ہے۔اس لئے احتیاط یہی ہے کہ ان کی اقتدا نہ کی جائے۔(فتاوی امدادیہ ص ۱/۹۰)۔

(۲) ہمارا نزاع غیر مقلدوں سے فقط بوجہ اختلاف فروع وجزئیات کے نہیں ہے،اگر یہ وجہ ہوتی تو حنفیہ شافعیہ کی کبھی نہ بنتی،لڑائی دنگا رہا کرتا،حالانکہ ہمیشہ صلح واتحاد رہا،بلکہ نزاع ان لوگوں (غیر مقلدوں) سے اصول میں ہوگیا ہے۔کیونکہ وہ سلف صالح خصوصاً امام اعظم کو طعن و تشنیع کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور چار نکاح سے زیادہ جائز کہتے ہیں اور حضرت عمرؓ کو در بارہ تراویح بدعتی بتاتے ہیں اور مقلدوں کو مشرک سمجھ کر مقابلے میں اپنا لقب موحدین رکھتے ہیں۔اور تقلید ائمہ کو مثل رسم جاہلان عرب کہتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے وجدنا علیه آبائنا معاذ الله. استغفر الله اور وہ خدا تعالیٰ کو عرش پر بیٹھا ہوا مانتے ہیں اور فقہاء کو مخالفِ سنت ٹھہراتے ہیں۔علے ہذا القیاس بہت سے عقائد باطلہ رکھتے ہیں۔ پھر اس پر عادت تقیہ کی ہے کہ موقع پر چھپ جاتے ہیں اور اکثر باتوں سے مکر جاتے ہیں اور منکر ہو جاتے ہیں (فتاوی امدادیہ ص ۳/۱۵۰)۔

جمہور سلف کے خلاف تفرد کے ہم سختی سے مخالف ہیں اور انوار الباری میں حسب موقع اس پر لکھتے بھی رہتے ہیں۔عن قریب تفردات اکابر امت پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ان شاء اللہ۔

دلائل حنفیہ ایک نظر میں

اعلاء السنن ص ۱۷/۶ میں ایک اہم باب قائم کیا ہے،جس میں ۳۷ روایات مرفوعہ وآثار صحابہ وتابعین ایک جگہ جمع کر دیے ہیں،جن میں وتر برکعت واحدہ کی ممانعت،وجوب قعدہ علے الرکعتین من الوتر، ذکرِ قرأت فی الوتر، حکمِ ایتار بثلاث موصولہ اور عدمِ فصل بایں رکعات الوتر کا بیان مع حواشی وتعلیقات ص ۴۲/۶ تک پھیلا ہوا ہے۔

(۱) امام شافعیؒ کے نزدیک وتر ایک رکعت ہے اور نفل نماز ایک رکعت کی بھی جائز ہے۔دوسرے سب حضرات ایک رکعت کو مستقل نماز نہیں مانتے اور امام مالک بھی جو وتر کو ایک رکعت کہتے ہیں،یہ شرط کرتے ہیں کہ اس سے قبل کم از کم دو رکعت کا شفعہ ضروری ہے۔لہٰذا ممانعت نماز ایک رکعت کی احادیث وآثار سے امام شافعیؒ کا رد ہو جاتا ہے۔

(۲) وجوبِ قعدہ علی الرکعتین کی روایات سے حنفیہ کی تائید اور انکی تردید ہو جاتی ہے جو بعض مبہم روایات سے استدلال کر کے ہر دو رکعت پر قعدہ کو واجب نہیں کہتے۔

(۳) جن روایات میں تین رکعات وتر کا ذکر اور اس کے ساتھ یہ تفصیل بھی ہے کہ ان تینوں رکعات میں حضور علیہ السلام نے کون کون سی سورتیں پڑھی ہیں،ان سے وتر کی تین رکعات اور وہ بھی موصول ہونا یعنی ایک سلام سے ہونا ثابت ہے۔

(۴) جن روایات میں نمازِ وتر کو نمازِ مغرب سے تشبیہ دی گئی ہے،اور جن میں مطلق تین رکعات پڑھنے کا ذکر ہے ان سب سے بھی تین رکعاتِ وتر کا موصول اور سلام واحد سے ہونا ثابت ہے۔حضرت ابن عمر سے بھی ایک روایت مرفوع مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں موجود ہے کہ دن کی نمازِ مغرب کی طرح ہی رات کی نماز وتر ہے۔

(۵) نسائی شریف،مستدرک حاکم،اور مسندِ احمد وغیرہ کی احادیث مرفوعہ میں صراحت ہے کہ حضور علیہ السلام نے وتر کی تین رکعات ایک سلام سے پڑھیں اور درمیان میں دو رکعت پر سلام نہیں پھیرا۔اور حضرت عمر،حضرت عبداللہ بن مسعود،حضرت ابن عباس اور فقہاء سبعہ مدینہ طیبہ،پھر تابعین نے بھی وتر کی تین رکعات ایک سلام سے ہونے کا فیصلہ کیا ہے،اسی لئے حضرت حسن بصری نے فرمایا تھا کہ حضرت ابن

عمر سے زیادہ فقیہ تو ان کے والد ماجد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لئے ان کے مقابلے میں حضرت ابن عمر کا قول وفعل پیش کرنا بے سود ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے یہ بھی فرمایا کہ سارے مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہو چکا ہے کہ وتر کی نماز تین رکعات ہیں، جن کے صرف آخر میں ایک سلام ہے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)۔

حضرت امام طحاویؒ نے وترِ حنفیہ کے دلائل مع محدثانہ محققانہ ابحاث کے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں جمع کئے ہیں اور امانی الاحبار جلد رابع میں علامہ عینی کی تحقیق بھی قابلِ مطالعہ ہے، امام طحاوی نے سند کے ساتھ ذکر کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فقہاءِ مدینہ منورہ کی رائے کے مطابق تین رکعات وتر ایک سلام سے پڑھنے کا فیصلہ صادر کیا تھا۔ اور لکھا کہ اس وقت کسی ایک شخص نے بھی اس فیصلہ پر اعتراض نہیں کیا۔ پھر آخر میں لکھا کہ اس کے خلاف کسی کو بھی نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ حضور علیہ السلام کی حدیث، پھر طریقۂ صحابہ اور اکثر کے اقوال کے مطابق ہے۔ پھر اسی پر تابعین نے بھی اتفاق کیا ہے۔ (امانی الاحبار ص۴/۲۹۳)۔

وتر کے بعض مسائل پر امام اعظم پر تفرد کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس لئے ہم نے حتی الوسع بحث کو مفصل ومکمل کیا ہے۔ چونکہ ہم تفرد کو خود ہی ہمیشہ نام رکھتے آئے ہیں، ہمیں یہ الزام بہت ناگوار ہوا اب ناظرین خود فیصلہ کریں گے کہ الزام تفرد کے مستحق حنفیہ ہیں یا دوسرے حضرات اکابر، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

افادۂ انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ دعوے کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ امام ابوحنیفہؒ کے حدیث سے متعلق فقہی جزئیات میں سے ایک جزئیہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ان کے ساتھ سلفِ صالحین میں سے کوئی نہ ہو؟ اور باب افتراق ہذہ الامۃ کے تحت حدیث "ما انا علیہ واصحابی" کا مصداق واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ " معرفت ما انا علیہ واصحابی کا طریقہ سلفِ صالحین کا تعامل وتوارث ہے، اور جب ان میں بھی اختلاف ہو تو حق دونوں طرف ہوتا ہے۔" (یہ ارشاد العرف الشذی ص۵۲۱ اور ص۵۲۶ میں بھی ہے۔)

وتر سے متعلق کچھ تفصیل، دلائل وجوابات ہم جلد اول ص۲۷ تا ص۳۲ میں بھی لکھ چکے ہیں، اس کا بھی مطالعہ تازہ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابواب الاستسقاء احادیث نمبر ۹۴۹ تا نمبر ۹۷۹ (بخاری ص ۱۳۶/۱۴۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: قحط باراں کی صورت میں استسقاء کئی طرح ہوتا ہے، عام احوال واوقات میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا، نمازوں کے بعد دوسری دعاؤں کی طرح بارش کے لئے دعا کرنا اور خاص طور سے عیدگاہ میں جا کر دعا کرنا، اور اس میں ہمارے بڑے امام صاحب کے نزدیک قراءت سری ہے اور خطبہ نہیں ہے مگر صاحبین کے نزدیک قراءت جہری ہے اور خطبہ بھی ہے اور تحویلِ رداء بھی صرف امام کے لئے مستحب ہے اور اسی پر حنفیہ کا عمل ہے (کما فی فتح القدیر) پھر متونِ حنفیہ میں جو نمازِ استسقاء کی نفی ذکر ہوئی ہے وہ نفی وجوب ہے، جس کی تفصیل شرح المنیہ میں دیکھی جائے، کیونکہ علامہ سروجی نے شرح ہدایہ میں روایتِ وجوبِ عیدین وکسوف کے ساتھ روایتِ وجوبِ استسقاء بامر الامام بھی نقل کی ہے۔

علامہ حمویؒ نے حاشیۂ الاشباہ میں تصریح کی کہ امرِ قاضی کی وجہ سے روزہ بھی واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے حکم سے نمازِ استسقاء بھی واجب ہو سکتی ہے اور علامہ نوویؒ نے بھی وجوب بامر الامام کا فتویٰ دیا ہے (کما فی شرح الجامع الصغیر) اگرچہ ان کے زمانے میں علماء نے اس کی مخالفت کی تھی۔

تاہم یہ امر بھی محقق ہے کہ جو وجوب امرِ قاضی یا امام کی وجہ سے ہوگا وہ اس کے زمانۂ امارت تک رہے گا پھر ختم ہو کر اپنی اصل پر لوٹ

جائے گا اور یہ سب انتظامی امور میں ہے، کیونکہ امور تشریعی میں امرِ امام کو کوئی دخل نہیں ہے۔ البتہ خلفاءِ اربعہ راشدین کا حکم امرِ امیر پر بھی فائق ہے، اور وہ تشریع کے تحت آجاتا ہے، لہٰذا اس کا اتباع انتظامی امور کی طرح بعض امورِ تشریعی میں بھی ضروری ہوگا۔ جیسے جماعتِ تراویح میں کیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے انتظامی امور میں جو فیصلے حضرت عمرؓ نے کئے تھے، ان کو حنفیہ نے بطور مذہب کے اختیار کیا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو شرعیات کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کی نظیر چاروں مذاہب میں موجود ہیں اور اسی طرح ہونا بھی چاہئے، کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے "میرے بعد ابوبکر وعمر کی اقتداء پیروی کرنا (ترمذی مسند احمد وغیرہ جامع صغیر سیوطی ص ۱/۵۱)

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کا اتباع لازم وضروری ہے اس کو خوب مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا اور بدعات سے سخت احتراز کرنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے (ابوداؤد ترمذی احمد ابن ماجہ)

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ قضاۃ وولاۃ کے فیصلوں اور اوامر کی بڑی اہمیت تھی اور وہ چونکہ اکثر اہلِ علم ہی ہوتے تھے، اس لئے وہ شریعت کے ماتحت ہی ہوتے تھے اور غیر منصوص احکام میں ان کے احکام کی تعمیل گویا شریعت ہی کے احکام کا اتباع ہے۔ اسی لئے دارالاسلام میں کسی قسم کی تنگی ودشواری پیش نہیں آتی۔

دارالحرب کی مشکلات

البتہ دیارِ حرب میں ضرور مشکلات پیش آتی ہیں۔ کیونکہ وہاں نہ قضاۃ وولاۃ ہوتے ہیں، نہ ان کے فیصلے، جو غیر منصوص امور میں ناطق فیصلہ کریں۔ حضرت علامہ تھانویؒ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: میں نے ایک انگریز کا قول دیکھا ہے کہ بغیر حنفی مذہب کے سلطنت چل نہیں سکتی، کیونکہ اس قدر توسع اور مراعاتِ مصالح دوسرے اسلامی فقہی مذاہب میں نہیں پائی جاتیں، مگر باوجود اتنے توسع کے پھر بھی وجدان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات اس وقت ہوتے تو اس زمانہ کی حالت پر نظر کر کے غالباً اور بھی توسع کرتے۔ مگر ہماری تو ہمت نہیں ہوتی، اپنے اندر قوتِ اجتہاد بھی نہیں۔ پھر نااہلوں سے بھی ڈر لگتا ہے، نہ معلوم کیا گڑبڑ کریں۔ پھر اس کی مثال میں کہ بعض جزئیات میں غالباً زیادہ توسع فرماتے یہ فرمایا کہ مثلاً اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت دارالحرب میں رہتی ہو تو اس کے متعلق بعض ابواب سیاسیہ میں کیا احکام ہیں۔ مفصل مستقل طور پر مدون نہیں ہیں۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ ان حضرات کو اس کا وہم وگمان بھی نہ ہوا ہوگا کہ کبھی مسلمان کفار کے ماتحت ہوں گے، باقی استقلال وتفصیل کی نفی سے نفسِ احکام کا غیر مذکور ہونا لازم نہیں آتا۔ اور وہ بھی کافی ہے اور کسی کے اجتہاد کی ضرورت نہیں رہتی۔ (الخ) (الافاضات الیومیہ ملفوظ ص ۴۳۲، ص ۴/۲۷۵)۔

علامہ اقبال اور حضرت شاہ صاحبؒ

اس موقع پر یاد آیا کہ علامہ اقبالؒ کو ہندوستان کے اندر بہت سے احکام ومسائل کے بارے میں فکر وتشویش رہتی تھی، اور وہ ایسے مسائل میں حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ سے رجوع کرتے تھے۔ اور حضرتؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے اہم مسائل ومشکلات کے بارے میں جس قدر استفادہ علامہ اقبال نے کیا ہے، دوسرے بہت سے میرے تلامذہ نے بھی نہیں کیا، اور پھر حضرتؒ کی وفات کے بعد علامہ اقبال کی تمنا تھی کہ ان کو کوئی ایسا جید عالم میسر ہو جائے، جس کو وہ اپنے پاس رکھ کر ان مسائل ومشکلات کے فیصلے منضبط کرائیں اور راقم الحروف کو بھی کئی خط لکھے جن میں ایسے عالم کی تلاش واستشارہ تھا، مگر میرا خیال ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اور نہ اب تک علامہ اقبال

---

[1] اس سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ خلفائے راشدین کے کسی فیصلہ کو صرف سیاست وتعزیر پر محمول کرنا اور اس کو امرِ تشریعی کی حیثیت نہ دینا درست نہ ہوگا۔
جس طرح علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کا طلاق ثلاث بلفظ واحد کو نافذ کرنا صرف وقتی عقوبت وتعزیر تھی امرِ تشریعی نہ تھا، چنانچہ اکابر علماءِ نجد وحجاز نے بھی ان دونوں حضرات کی اس دلیل کو رد کرتے ہوئے جمہور سلف وخلف کے فیصلے کو قبول کر کے دولتِ سعودیہ میں نافذ کرا دیا ہے۔ والحمد للہ علی ذلک

کے استفادات علمیہ انوریہ کی پوری تفصیل سامنے آسکی ہے۔سنا ہے کہ اب کچھ خطوط لاہور میں طبع ہوئے ہیں۔واللہ اعلم۔
علامہ کہا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی نظیر پانچ سوسال کے اندر نہیں ہے۔اور محقق علامہ کوثریؒ نے بھی لکھا ہے کہ شیخ ابن ہمامؒ (م ۸۶۱ھ) کے بعد ایس بے نظیر متبحر محدث فقیہ نہیں ہوا۔ ہمارا خیال ہے کہ امام طحاوی کے بعد سے ایسا محقق نہیں ہوا۔
راقم الحروف نے بھی بہت سے مسائل دارالحرب کے بارے میں حضرتؒ سے استفسارات کئے تھے،اور حضرتؒ کے خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند اجلاسِ پشاور میں بھی مہمات مسائل درج ہوئے ہیں۔
اوپر جو کچھ حضرتؒ اور حضرت تھانویؒ کے ارشادات نقل ہوئے ، وہ بھی محققین اہلِ علم کی بصیرت کو دعوتِ فکر ونظر دیتے ہیں۔ ع۔ کس نے آید بمیداں، شہ سواراں راچہ شد؟! دارالحرب کی مفصل بحث ص ۱۶۵/۱۴۵ میں آرہی ہے۔

نمازِ استسقاء اور توسل

امام بخاری نے باب سوال الناس قائم کر کے حضرت عمرؓ کا ارشاد ذکر کیا کہ ہم حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارکہ میں آپ کا توسل[1] کر کے حق تعالیٰ سے بارانِ رحمت طلب کیا کرتے تھے، اور اب (یہاں عیدگاہ میں) آپ کے چچا حضرت عباسؓ کے توسل سے استقاء کر رہے ہیں،......حسبِ تخریج حافظ ابن حجرؒ حضرت ابن عباسؓ نے دعا اس طرح کی۔ "یا اللہ! کوئی بلا اور مصیبت بغیر گناہوں کے نہیں اترتی اور اس کا ازالہ صرف توبہ ہی سے ممکن ہے، یہ سب لوگ آپ کے نبی اکرم سے میری قرابت کے سبب، مجھے آپ کی بارگاہِ رحمت میں لے کر حاضر ہوئے ہیں، اور اب ہم سب کے گناہ آلود ہاتھ آپ کی جنابِ رفیع میں اٹھ رہے ہیں اور ہماری پیشانیاں توبہ وانابت کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں جھک گئی ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں بارش کی نعمت سے بہرہ ور فرمائیں۔"
اس سے معلوم ہوا کہ یہ توسل بھی گویا حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے منسوب ومتعلق تھا اور چونکہ آپ کی تشریف آوری عیدگاہ میں اس وقت نہ ہوسکتی تھی، اس لئے آپ کے نائب حضرت عباسؓ قرار پائے تھے اور اس سے غائبانہ توسل کی نفی بھی نہیں ہوتی۔ صرف توسل بالنائب کا ثبوت ہوتا ہے۔

توسلِ قولی کا جواز

یہی بات یہاں سے اکابرِ امت نے سمجھی ہے کہ جس طرح توسلِ فعلی حضور علیہ السلام سے جائز تھا، آپ کے نائبین سے بھی جائز ہے، رہا توسلِ قولی، تو گو اس کا جواز اس حدیثِ بخاری سے نہیں نکلتا، مگر وہ دوسری حدیثِ ترمذی وغیرہ سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی بات ہمارے حضرت الاستاذ شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ رشید حضرت مولانا محمد صاحب لائلپوری انوری قادری (خلیفۂ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ) نے انوارِ انوری ص ۹۱ میں نقل فرمائی ہے، ملاحظہ ہو۔

۸۔ توسل فعلی وقولی

فرمایا کہ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کا قول اللھم انا کنا نتوسل الیک بینا صلے اللہ علیہ وسلم فستقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا (بخاری ص ۱۳۷) یہ توسلِ فعلی ہے، رہا توسلِ قولی، تو وہ حدیثِ ترمذی شریف میں۔ اعمٰی کی حدیث میں ہے: اللھم انی اتوجہ الیک بنبیک محمد نبی الرحمۃ الی قولہ فشفعہ فی۔

---

[1] باب مذکور کی پہلی حدیث نمبر ۹۵۲ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ بھی ہے کہ امساکِ باراں کے زمانہ میں جب حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں منبر پر طلبِ باراں کے لئے تشریف رکھتے تھے اور میں ابوطالب کا یہ شعر وابیض یستسقی الغمام بوجہہ یاد کر کے آپ کے چہرۂ مبارک کی طرف نظر جما کر دیکھتا تو معاً بارش ہونے لگتی اور آپ کے منبر سے اترنے سے پہلے مدینہ منورہ کے پرنالے پانی سے بھر جاتے تھے۔ (بخاری ص ۱/۱۳۷)

(ف) یہ حدیث ترمذی کے علاوہ زادالمعاد میں بھی ہے اور تصحیح فرمائی ہے، مستدرکِ حاکم میں بھی ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے، علامہ ذہبی نے تصحیح حاکم کی تصویب کی ہے۔ (انوارانوری، مجموعہ ملفوظات علامہ کشمیریؒ)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی شریف ص ۲۸۲/۴ میں بھی مفصل تخریج ہے۔ توسل کی مستقل و مفصل بحث انوار الباری جلد۱۳/۱۱ میں گزر چکی ہے، یہاں بھی کچھ باتیں جدید اور کچھ بطور قندِ مکرر پیش کی جاتی ہیں، کیونکہ " **هوالمسک ما کررته یتضوع**"

آگے ہم زیارۃِ نبویہ کی اہمیت اس حیثیت سے بھی واضح کریں گے، کہ جس مقام میں اس وقت افضل الخلق علی الاطلاق، اشرف البریہ بکل معنی الکلمہ اور باعثِ ایجادِ کون ومکان جلوہ افروز ہیں، وہ مقام بھی اشرف البقاع علی الاطلاق، افضل ترینِ امکنۂ سموات وارضین بکل معنی الکلمہ اور تجلی گاہِ اعظم رب العالمین ہے، **جل مجده و عز اسمه و تعالت کلماته، وقال الشیخ الانورؒ تعالیٰ الذی کان ولم یک ماسویٰ واول ماجلی العماء بمصطفیٰ.**

جس ذاتِ مقدس واقدس کے نورِ معظم سے تمام کائنات کو تجلی ومنور فرمایا گیا تھا، اور اسی لئے ہم اس کو بجا طور پر تجلی گاہِ اعظم کہتے ہیں اور مانتے ہیں، کیا کوئی عاقل ان کے مقام جلوہ افروزی کو برترِ عالم ماننے میں ادنیٰ تامل بھی کر سکتا ہے، لیکن حیرت زائے عالم میں ناممکن کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اشرف الخلق وافضل الخلق مان کر بھی بعض لوگوں نے اس حقیقت سے صاف انکار کر دیا کہ بقعۂ مبارکہ قبرِ نبوی کا وہ حصہ جو جسدِ مبارک نبوی سے ملاصق ہے، مساجد ومعابد یا کعبہ معظمہ سے افضل واشرف ہو سکتا ہے۔ پھر حیرت در حیرت اس پر کیجئے کہ اس استبعاد کے قائل بھی سب سے پہلے علامہ ابن تیمیہ ہوئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے ساری امت بقعۂ مبارکہ کے افضل علی الاطلاق ہونے پر متفق رہی ہے۔ اور اس بحث کو بھی ہم بقدرِ استطاعت وبصد اعترافِ عجز پیش کریں گے، ان شاء اللہ۔

ایک اہم اشکال وجواب

ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ نے ایک نہایت تحقیقی رسالہ "قبلہ نما" لکھا ہے، جو معاندینِ اسلام کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ جس طرح احجار واصنام کی پرستش قابلِ ترک وملامت ہے، اسی طرح صلوٰۃ الی الکعبہ بھی ممنوع ہونی چاہئے۔ حضرتؒ کے مکمل ومفصل جواب وتحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں کعبۂ مکرمہ کی طرف توجہ اس کے تجلی گاہِ خداوندی ہونے کی وجہ سے ہے، اور وہ در حقیقت مسجود نہیں بلکہ مسجود الیہ ہے۔ پھر اسی ضمن میں حضرتؒ یہ تحقیق بھی فرما گئے کہ حقیقتِ محمدیہ، حقیقتِ کعبہ سے افضل ہے۔

پس جب کعبہ معظمہ (بہ صورت احجار وبیت) حضور علیہ السلام کے مرتبۂ عالیہ کے اعتبار سے مفضول ہے، تو وہ آپ کے لئے عقلاً مسجود ومعبود بھی نہیں سکتا، (الخ) پورا رسالہ علوم وحقائق کا گنجینہ اور بے بہا خزینہ ہے مگر اس کے مضامین نہایت ادق بھی ہیں، راقم الحروف نے کچھ عرصہ دارالعلوم دیوبند میں قیام کر کے اس کی تسہیل وتصحیح کا کام کیا تھا اور کئی سو کتابت کی اغلاط دور کر کے کئی سو عنوانات بھی اس میں قائم کئے تھے، جس کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ کتاب اب سمجھ میں آنے لگی، حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب نے فرمایا تھا کہ تمہارے آنے سے پہلے ہم تینوں (مع قاری صاحب ومولانا اشتیاق احمد صاحب) اس کتاب کا مذاکرہ کرتے رہے ہیں مگر بہت جگہ گاڑی اٹک جاتی تھی۔ اور ہم میں تعیین مراد کے بارے میں اختلاف ہو جاتا تھا۔

اسی کام کے دوران احقر بھی علامہ موصوف سے استفادہ کرتا رہا، اور یاد رہے کہ ایک روز قبیل مغرب آپ کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر ایک مقام میں اشکال پیش کیا تو حضرت نے ایک مراد بتائی اور احقر نے دوسری تو خاموش ہو گئے، پھر بعد مغرب فرمایا کہ تم جو کہتے ہو وہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

احقر نے تسہیل وغیرہ سے فارغ ہوکر اس پر ایک مختصر مقدمہ بھی لکھا تھا۔ جس میں خاص طور سے اس اشکال کا جواب بھی دیا تھا کہ حضرت مجدد صاحب قدس سرہ نے مکاتیب عالیہ میں حقیقتِ کعبہ معظمہ کو حقیقتِ محمدیہ سے افضل قرار دیا ہے۔ جبکہ ابھی ہم نے اوپر حضرت نانوتویؒ کی تحقیق اس کے برعکس نقل کی ہے۔

احقر کے نزدیک تطبیق کی صورت یہ ہے کہ صورتِ کعبہ معظمہ (احجار و بیت) حضرت مجدد صاحبؒ کے نزدیک بھی مفضول ہے۔ حقیقتِ محمدیہ سے (کیونکہ آپ افضل الخلائق اور افضل اشرف عالم و عالسیاں ہیں) اور وہ صورتِ کعبہ ان کے نزدیک بھی مسجود نہیں بلکہ مسجود الیہ ہے۔

البتہ حقیقتِ کعبہ معظمہ ضرور مسجود ہے۔ اور وہ افضل بھی ہے حقیقتِ محمدیہ سے کیونکہ وہ اس عالم سے نہیں ہے۔ (فرمودند کہ حقیقتِ کعبہ از عالم عالم نے) لہٰذا بات صاف ہوگئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نانوتویؒ کی مراد حقیقتِ کعبہ سے صورتِ کعبہ ہے، جس سے حضور علیہ ضرور افضل ہیں۔ اور وہ مسجود بھی نہیں ہے۔ صرف مسجود الیہ اور جہتِ سجود ہے۔ اس طرح حضرتؒ سے تعبیر میں کچھ کوتاہی معلوم ہوتی ہے یا یہ بھی کتابت کی دوسری اغلاط کی طرح سے ایک غلطی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ وعلمہ اتم واحکم۔

علامہ ابن تیمیہ کے تفردات

معلوم ہوا کہ جس طرح علامہ کے دوسرے اصولی فروعی تفردات بہ کثرت ہیں، ان میں یہ بھی کم اہم نہیں کہ وہ بقعۂ مبارکہ قبر نبوی کے لئے وہ منقبت و مزیت ماننے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہو سکے، جس کو جمہور امت نے آپ سے قبل و بعد مسلم قرار دیا تھا۔

ہم نے انوارالباری ص ۱۵/۱۸۹ میں ذکر کیا تھا کہ اکابرِ امتِ محمدیہ نے کسی بڑے سے بڑے عالم کے بھی تفردات کو قبول نہیں کیا ہے اور مثال میں صحابی رسول حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا بھی ذکر کیا تھا جو کثیر التفردات تھے اور نہ صرف دوسرے اکابرِ امت نے بلکہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی ان کے تفردات پر نقد کیا ہے جبکہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی وہ صاحب مناقبِ جلیلہ و فضائلِ عظیمہ بھی تھے، تو ظاہر ہے کہ جمہور امت کے خلاف علامہ ابن تیمیہ کے تفردات کو بھی رد و نقد سے محفوظ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

علماءِ نجد و حجاز کو مبارکباد

میں یہاں ان حضرات کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں، جنہوں نے ''حکمِ طلاق ثلاث بلفظ واحد'' کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کے تفرد کو رد کر کے جمہور امت کے فیصلے کو نجد و حجاز میں نافذ کرا دیا ہے۔ یہ فیصلہ پوری تفصیل کے ساتھ ''مجلۃ البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد'' جلد اول بابتہ ماہ شوال و ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ میں ص ۱۶۵ تا ص ۱۷۳) شائع ہوا تھا۔

جس کو پھر الگ سے بھی بعنوان "فتوی کبار العلماء والمحققین" بڑی تعداد میں شائع کیا گیا ہے، یہ بات کم حیرت و مسرت کی نہیں کہ اس دور کے نجدی کبار علماء و محققین نے بھی علامہ ابن تیمیہ کے ایک تفرد کے خلاف ایسی جرأت و وضاحت کے ساتھ اقدام کیا۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

ہماری تمنا ہے کہ اسی طرح وہ حضرات دوسرے اہم اصولی و فروعی تفردات پر بھی کھلے دل سے بحث و فکر کر کے دادِ تحقیق دیں، اور احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا فریضہ ادا کریں۔ واللہ الموفق۔

مولانا بنوریؒ کی یاد

اس موقع پر شیخ سلیمان الصنیعؒ (رئیس ھیۃ الامر بالمعروف والنھی عن المنکر) کی یاد تازہ ہوگئی، جن سے احرار و علامہ بنوری بزمانۂ قیام مکہ معظمہ ۱۹۳۸ء گھنٹوں اصولی و فروعی اختلافی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے، اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب بھی نجدی

علماء میں تعصب کم ہوگا وہ تم لوگوں سے قریب تر ہو جائیں گے اور حق بات کا اعتراف کرلیں گے، اس وقت ان میں علم کی کمی اور تعصب کی زیادتی ہے۔ پھر جب مولانا بنوریؒ کی آمد و رفت حرمین کی بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ تو احقر سے کہا تھا کہ علماءِ نجد میں بڑی صلاحیت ہے اور وہ بہت سے مسائل میں ہماری بات مان لیتے ہیں۔ پھر اب تو طلاقِ ثلاث جیسے نہایت اہم مسئلہ میں ان علماء کا قبولِ حق تو بہت ہی قابلِ قدر ہے، اور شیخ ابن باز ایسے چند کے علاوہ خیال ہے کہ اکثریت بے تعصب علماء کی ہوگئی ہے، کمی یہ ہے کہ ہم میں سے جن کی رسائی وہاں تک ہے وہ علم و مطالعہ کی کمی اور جرأتِ اظہارِ حق سے محرومی کا شکار ہیں۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

اکابرِ حنفیہ کی دینی و علمی خدمات

سید المرسلین رحمۃ للعالمین علیہ وعلیٰ آلہ و صحبہ الف الف تحیات مبارکۃ طیبہ نے امتِ مرحومہ کی نجاتِ ابدی و فلاحِ سرمدی کے لئے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر چلنا، اس سے جتنی بھی دوری ہوگی وہ حق و صواب سے دوری ہوگی، اسی لئے اکابر نے طے کیا کہ حضور علیہ السلام کے تمام اقوال و افعال کو صحیح سے صحیح تر صورتوں میں حاصل کر کے منضبط کریں۔ تمام صحابہ کرام اور تابعین وائمہ مجتہدین و محدثین نے اپنے عزیز ترین اوقات و عمریں اسی سعی میں صرف کردیں تب ہی ہمارے سامنے ان کی مساعی کے ثمرات کتابی شکل میں آئے اور ہر دور کے علماء نے ان سے استفادات کئے۔

اس سلسلہ میں صحابۂ کرام کے بعد سب سے پہلے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں کہ پہلے اسلام کے اصول و عقائد پر ہمت و قوت صرف کی، فرقِ باطلہ کا مقابلہ بے جگری سے کیا، پھر چالیس محدثین فقہاء کی جماعت بنا کر اپنی سرپرستی و نگرانی میں فقہِ اسلامی کے مسائل مرتب کرائے، اصول و فروعِ دین کی ان ہی خدماتِ جلیلہ کا صدقہ ہے کہ آج ہمارے سامنے ملت بیضاء کا لیل و نہار برابر ہے کہ کوئی ادنیٰ چیز بھی زاویۂ خمول میں نہ جاسکی اور نہ حق و باطل میں التباس و اشتباہ کی صورت پیدا ہوسکی، اور اس طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ترکتکم علی ملۃ بیضاء لیلھا و نہارھا سواء (میں تمہیں ایسی روشن ملت پر چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کا رات و دن برابر ہے) کی صداقت ظاہر ہوئی۔

آثارِ صحابہ و تابعین

جس طرح قرآن مجید کی شرح احادیث نبویہ ہیں کہ بغیر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ہم اس کی مراد و مقصد کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح سے احادیثِ نبویہ کے معانی و مقاصد کا پوری طرح سمجھنا فقہِ اسلامی پر موقوف ہے اور ان کو سمجھنے کے لئے ہم آثارِ صحابہ و تابعین کے محتاج ہیں۔ اسی لئے وہ لوگ غلطی پر رہے جنہوں نے قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے احادیث کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ بھی جو معانی احادیث کو سمجھنے میں آثار صحابہ و تابعین سے استغنا ظاہر کرتے ہیں۔

فقہِ حنفی کی بڑی عظیم خصوصیت

یہ ہے کہ وہ احادیث و آثار دونوں سے ماخوذ ہے، اور جن حضرات نے فقط مجرد صحیح سے فقہی استباط کا دعویٰ کیا، وہ بھی سینکڑوں مسائل میں بغیر آثار صحابہ کے کام نہ چلا سکے۔ بلکہ بعض ایسے بڑے بول والوں نے تو یہ بھی کیا کہ جب ان کو اپنی طے کردہ فقہی رائے کی تائید میں احادیث نہ مل سکیں تو آثار صحابہ ہی پر انحصار کرلیا بلکہ بعض مسائل میں تو آثار صحابہ کو باوجود مخالفتِ احادیث بھی قبول کرلیا، ویاللعجب! ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ تو اس کے بہت ہی خلاف تھے کہ فقہ سے حدیث کی طرف جایا جائے، وہ فرماتے تھے کہ حدیث سے فقہ کی طرف جانا چاہئے۔ کہ پہلے خالی الذہن ہو کر احادیث کے سارے طرق و متون پر نظر کر کے اس کی مراد متعین کی جائے۔ پھر فقہی رائے قائم کی جائے، اور اس کے برعکس طریقہ صحیح نہیں ہے۔

امام اعظم کی اولیت

عقائد واصول میں آپ کی اولیت اوپر ذکر ہوئی اور علامہ ماتریدی دو واسطوں سے آپ کے تلمیذ ہیں جن کا علم کلام میں تبحر اور گرانقدر اعلیٰ مقام مشہور ومعروف ہے حتیٰ کہ امام بخاری نے بھی حق تعالیٰ کی صفت تکوین کا اثبات ان ہی پر اعتماد کر کے کیا ہے، جس کا بقول حضرت شاہ صاحبؒ حافظ ابن حجر ایسے متعصب حنفیہ نے بھی اعتراف کرلیا ہے۔ اس کے بعد فقہ میں تو امام صاحب کی اولیت امام شافعی اور دوسرے اکابر وائمہ نے بھی مان لی ہے اور فقہ حنفی میں آثار صحابہ وتابعین سے جتنا زیادہ استفادہ کیا گیا وہ بھی سب کو معلوم ہے، اسی لئے امام طحاوی نے خاص طور سے علوم صحابہ واختلاف میں تخصص حاصل کیا، اپنی مشہور کتاب کا نام بھی شرح معانی الآثار رکھا، جو علم حدیث میں نہایت بلند پایہ تالیف ہے کہ اس سے دوسرے بھی مستغنی نہیں ہو سکے۔

امام طحاوی: حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ محمد بن نصر (م ۲۹۴ھ) محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) محمد بن المنذر نیساپوری (م ۳۱۸ھ) اور امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) سب ہم عصر تھے، اور علوم صحابہ جمع کرنے میں ساعی تھے مگر امام طحاویؒ مذاہب صحابہ کی نقل وجمع میں سب سے آگے تھے۔ اسی لئے ان کی نقل پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا ہے، ان کے بعد حافظ ابوعمر ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے بھی بڑا کام کیا ہے۔

زیارۃ سید المرسلین رحمۃ للعالمین

(علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وتابعیہ الی یوم الدین افضل الصلوات والبرکات الف الف مرۃ بعدد کل ذرۃ)

سرور کائنات سیدنا رسول معظم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت بالاجماع اعظم قربات وافضل طاعات ہے، اور ترقی درجات وحصول مقاصد کے لئے تمام اسباب ووسائل سے بڑا وسیلہ ہے۔

بعض علماء نے اہل وسعت کے لئے اس کو قریب واجب کے لکھا ہے۔ درمختار میں ہے کہ زیارت قبر شریف مندوب ہے۔ بلکہ اس کو اہل وسعت کے لئے واجب کہا گیا ہے۔ محقق ابن الہمامؒ نے فرمایا کہ سفر مدینہ کے وقت صرف قبر نبوی کی نیت کرنی چاہئے، پھر جب مسجد نبوی میں داخل ہوگا تو اس کو اس کی زیارت بھی حاصل ہو ہی جائے گی، کیونکہ اس خالص نیت میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم واجلال زیادہ ہے اور اسی کی تائید حدیث نبوی سے بھی ہوتی ہے، جس میں ہے کہ جو شخص میری زیارت کے لئے آئے گا جبکہ اس کی نیت بجز میری زیارت کے کسی دوسرے مقصد کے لئے نہ ہوگی تو مجھ پر لازم ہوگا کہ قیامت کے دن اس کے لئے شفاعت کروں۔ نیز حضرت عارف ملا جامیؒ سے نقل ہوا ہے کہ وہ حج کے علاوہ بھی صرف زیارت قبر نبوی کے لئے سفر کرتے تھے، تاکہ ان کا مقصد سفر کوئی دوسری غرض نہ ہو۔ فتح الملہم ص ۳/۳۷۸ اور خود حضور علیہ السلام نے اس کی ترغیب دی ہے اور باوجود قدرت ووسعت کے زیارۃ قبر نبوی نہ کرنے والوں کو ظالم وبے مروت فرمایا ہے۔

لہٰذا خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو اس دولت وشرف سے نوازا جائے اور بدبخت ہے وہ شخص جو باوجود قدرت ووسعت کے اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے۔

علامہ محدث قسطلانی شافعیؒ شارح بخاری شریف اور علامہ محدث زرقانی مالکیؒ شارح موطأ امام مالک نے لکھا کہ ہر مسلمان کو نبی اکرم صلے اللہ کی زیارت کے قربت عظیمہ ہونے کا اعتقاد رکھنا چاہئے، کیونکہ اس کے لئے صحیح احادیث وارد ہیں جو درجۂ حسن سے کم نہیں ہیں، اور آیت قرآنی (ولو انھم اذ ظلموا انفسھم نمبر ۶۴ سورہ نساء) بھی اس پر دال ہے (اگر وہ لوگ ظلم ومعصیت کے بعد آپ کے پاس آ کر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے استغفار وسفارش کرتے تو یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔)

لہٰذا جو لوگ قبرِ مبارک پر حاضر ہو کر استغفار کریں گے، ان کے لئے آپ کی شفاعت و استغفار ضرور حاصل ہوگی، اور علماءِ امت نے اس آیت کے عموم سے یہی سمجھا ہے کہ آپ کی شفاعت مغفرتِ ذنوب کے لئے جس طرح آپ کی دنیوی حیاتِ طیبہ میں تھی، اسی طرح آپ کی حیاتِ برزخیہ میں بھی ہے۔ اسی لئے علماء نے قبرِ مبارک پر حاضر ہونے والوں کے لئے اس آیت کی تلاوت کو بھی مستحب قرار دیا ہے کیونکہ آپ کی عظمتِ مرتبت موت کی وجہ سے ختم نہیں ہوگئی اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی استغفار امت کے لئے جیسی حیاتِ دنیوی میں تھی، وہ اب باقی نہیں رہی، نیز لکھا کہ تمام مسلمانوں کا زیارتِ قبور کے استحباب پر اجماع رہا ہے۔ جیسا کہ محدث نووی شارح مسلم شریف نے نقل کیا ہے اور ظاہریہ نے اس کو واجب کہا ہے۔

پھر لکھا کہ زیارتِ روضۂ مطہرہ نبویہ کا مسئلہ کبار صحابہ کے زمانہ میں بھی مشہور و معروف تھا، چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس فتح کیا تو اس وقت کعب احبار آپ کے پاس حاضر ہوئے اور اسلام لائے تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، اور یہ بھی ارشاد کیا کہ تم میرے ساتھ مدینہ منورہ چلو تو بہتر ہے، تا کہ قبرِ مبارک نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کرو، کعب احبار نے فرمایا کہ ضرور حاضر ہوں گا۔

(ظاہر ہے کہ شام سے مدینہ منورہ تک کتنی طویل مسافت ہے، اور اس سفرِ زیارت کی ترغیب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دے رہے تھے، جبکہ حضور علیہ السلام نے اپنے بعد حضرت ابوبکر و عمرؓ کے اتباع کی تاکید و حکم دیا تھا۔ لہٰذا اس سفر کو سفرِ معصیت قرار دینے والوں کو سوچنا چاہئے کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر رہے ہیں۔)

آگے علامہ محدث قسطلانیؒ نے یہ بھی لکھا کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز دونوں کے عمل سے زیارت نبویہ کے لئے سفر کرنا قربت و طاعت ثابت ہوا اور شیخ ابن تیمیہ نے اس بارے میں جو کلامِ قبیح و شنیع کیا ہے، وہ قابلِ تعجب بھی ہے کہ اس کو سفرِ معصیت قرار دیا (جس میں نمازِ قصر بھی درست نہیں ہے) اسی لئے ان کی تردید میں علامہ محدث شیخ تقی الدین سبکیؒ[1] نے (بے نظیر کتاب)

---

[1] علامہ محدث شیخ الاسلام تقی الدین ابوالحسن علی بن عبدالکافی شافعی م ۷۵۶ھ کا مختصر ذکر مقدمہ انوار الباری ص ۲/۱۴۳ میں ہوا تھا مگر انکی جلالتِ قدر کے پیش نظر مزید تعارف کرانا ضروری ہوا، علامہ محدث مولانا عبدالحئی لکھنویؒ نے لکھا: شیخ صلاح صفدریؒ نے فرمایا کہ لوگ ان کی مدح میں کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ کے بعد ان جیسا جامع عالم نہیں ہوا، میرے نزدیک یہ ان پر ظلم اور ان کے مرتبۂ عالیہ سے کم ہے۔ کیونکہ وہ میرے نزدیک حضرت سفیان ثوری جیسے تھے، اور ان کی تصانیفِ جلیلہ ساٹھ سے زیادہ ہیں، جو علامہ سیوطیؒ نے حسن المحاضرہ میں درج کی ہیں اور ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ (حاشیہ فوائد بہیہ ص ۴۴) پھر دوسری جگہ لکھا کہ عجائب خبط میں سے ہے کہ صاحب اتحاف النبلاء (نواب صدیق حسن خاں قنوجی) نے ان علامہ ابوالحسن تقی سبکی کے تذکرے میں لکھ دیا کہ وہ ابن تیمیہ سے بڑا تعصب رکھتے تھے۔ لیکن آخر عمر میں اس سے رجوع کر لیا تھا پھر نقل کیا کہ انہوں نے علامہ ذہبی کو ایک خط بھی بطور معذرت کے لکھا تھا، حالانکہ وہ خط علامہ ابوالحسن تقی سبکی کا نہیں تھا بلکہ ان کے لڑکے ابوالنصر تاج الدین سبکی م ۷۷۱ھ کا تھا۔ نواب صاحب نے یہ بھی لکھا کہ میں نے یہ خط اس لئے نقل کر دیا ہے تا کہ مخالفین کا یہ گھمنڈ ختم ہو جائے کہ علامہ سبکی نے علامہ ابن تیمیہ کا خوب رد کیا ہے (گویا ان کے رجوع سے ان کے ردود کا وزن بھی بے قیمت ہوگیا) مولانا عبدالحئیؒ نے لکھا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ مسئلہ زیارۃ نبویہ میں ابن تیمیہ کا رد کرنے والے تقی سبکی ہیں (تاج الدین سبکی نہیں) اور انہوں نے تعصب کی وجہ سے رد نہیں کیا بلکہ وہ اپنے رد میں حق و صواب پر ہیں۔ جس کی شہادت بڑے بڑوں نے دی ہے اور ذہبی کو جس نے ابن تیمیہ کی تعریف کا خط لکھا، وہ ان کے بیٹے تاج الدین کا خط تھا۔ جو لوگ تاریخ پر وسیع نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں، پھر بھی اگر کوئی دعویٰ کرے کہ وہ خط تقی سبکی کا ہے تو اس کو اصحاب تواریخ و طبقات کی تصریح دکھانی پڑے گی، جو محال ہے۔ (حاشیہ فوائد ص ۱۹۶ طبع مصر)

عجیب بات: جس تاریخی غلطی کا ذکر ابھی اوپر مولانا عبدالحئیؒ نے کیا ہے، اسی غلطی کا ارتکاب محترم مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب سے بھی تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲/۱۴۴ میں ہوا ہے۔ آپ نے طبقات الشافعیہ کا حوالہ بھی دیا ہے اس وقت میرے سامنے وہ کتاب نہیں ہے، تاہم اس مکتوب کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ تاج سبکی نے ذہبی سے تلمذ و شاگردی کی وجہ سے ہی ایسے ارادتمندانہ کلمات لکھے ہوں گے اور اس طرح کی مدح انہوں نے دوسری جگہ بھی کی ہے اگرچہ انہوں نے اپنے استاذ ذہبی پر بہت کافی نقد بھی کیا ہے۔ جس سے علامہ ذہبی کے غلط رجحانات و اقدامات کی بھی تفصیل ملتی ہے، اس کے لئے السیف الصقیل دیکھی جائے ص ۱۷۹/۱۷۷، وھو مھم جدا۔ باقی ان کے والد ماجد شیخ الاسلام تقی سبکیؒ تو علامہ ذہبی ۷۴۸ھ کے معاصر تھے، اور تمام علوم فنون میں ذہبی سے بہت فائق تھے، اور انہوں نے تو حق کہنے میں علامہ ابن تیمیہؒ کی بھی کوئی رعایت نہیں کی، اور کئی کتابوں میں رد شدید و وافر کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

''شفاء السقام''، لکھی جس نے سب مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کر دیا (شرح المواہب اللدنیہ ص ۱۹۹/۸)
واضح ہو کہ یہ علامہ سبکی بہت بڑے متکلم، فقیہ و محدث گزرے ہیں اور ہمارے استاذ الاساتذہ علامہ محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ وہ علامہ ابن تیمیہ سے ہر علم وفن میں فائق تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ علامہ سبکی تمام علوم وفنون میں علامہ تیمیہ پر فائق تھے۔ غرض رجوع کی بات نہایت غلط اور بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

تاج سبکی کی پیدائش ۷۳۹ھ کی ہے اور ذہبی کی وفات ۷۴۸ھ میں ہوگئی، یعنی کل ۱۹ سال انہوں نے ذہبی کی زندگی کے پائے اور غالباً اسی ابتدائی عمر کے تلمذ کے زمانے میں وہ اتنے مرعوب رہے ہوں گے کہ اپنے کو استاذ کا مملوک وغلام لکھا۔ پھر بڑے ہو کر تو انہوں نے اپنے ان ہی استاذ محترم کی نہایت ادب کے ساتھ بڑی بڑی غلطیاں بھی پکڑی ہیں۔ اور ان کو تعصب مفرط کا بھی مرتکب گردانا ہے۔ اگرچہ مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کی طرح عمر زیادہ نہ ہوئی، صرف ۴۲ سال تقریباً۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بڑے حق گو بھی تھے، اور اگر اپنے والد ماجد میں کچھ تفردات وشذوذ پاتے، تو اس کو بھی ضرور برملا لکھ جاتے۔ انہوں نے فنون کی تعلیم اپنے والد اور دوسرے اساتذۂ کاملین سے پائی تھی اور جوانی میں ہی ماہر فنون اور جلیل القدر کتابوں کے مصنف ہوگئے تھے۔ الجوامع، منع الموانع۔ شرح منہاج البیضاوی، طبقات الشافعیہ وغیرہ تصنیف کیں۔ اپنے والد کی جگہ شام کے قاضی القضاۃ بھی ہوگئے تھے۔

شیخ ابوالمحاسن دمشقیؒ م ۷۶۵ھ نے ذیل تذکرۃ الحفاظ میں تقی سبکی کو امام، حافظ، علامہ اور بقیۃ المجتہدین، علم حدیث کے ساتھ نہایت شغف رکھنے والا اور تمام علوم اسلام اور فنون علم سے حظ وافر رکھنے والا کہا اور لکھا کہ ان کی تصانیف وفتاویٰ ساری دنیا میں پھیل گئے، زہد، ورع، عبادت کثیرہ تلاوت شجاعت اور شدۃ فی الدین میں ضرب المثل تھے۔

ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں، **التحقیق فی مسئلة التعلیق**، جو شیخ ابن تیمیہ پر رد کبیر ہے۔ **رفع الشقاق فی مسئلة الطلاق شفاء السقام فی زیارة خیر الانام**، وہ بھی ابن تیمیہ کے رد میں ہے۔ **السیف المسلول علی من سب الرسول، شرح المهذب للنووی** کو پانچ جلدوں میں مکمل کیا۔ اور الابہاج فی شرح المنہاج للنووی لکھی۔ (ص ۴۰ ذیل) ان کے علاوہ بڑی اہم اور مشہور تصنیف ''السیف الصقیل فی الرد علی ابن زفیل'' ہے، جس میں علامہ ابن القیم کے طویل قصیدہ نونیہ کے غلط نظریات بابۃ اصول وعقائد کا رد کیا گیا ہے، اور حواشی میں مزید دلائل سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب اہل علم کے لئے نہایت گرانقدر علمی دستاویز ہے۔ جس کا مطالعہ بہت اہم اور ضروری ہے۔

زمانہ کی نیرنگیوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس عظیم القدر علمی شخصیت کی تصانیف کی مقبولیت عامہ وخاصہ کا وہ دور تھا جس کی طرف علامہ دمشقی نے اشارہ کیا ہے۔ آج اس کی اشاعت کا کوئی سروسامان نہیں ہے، اور علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کی وہ کتابیں جو پانچ سو برس تک زاویۂ خمول میں رہیں، اب ان کی اشاعت بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی ہی، علامہ تقی سبکیؒ کی **السیف الصقیل** عرصہ ہوا مصر سے علامہ کوثری کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوئی تھی پھر دوبارہ شاید نہیں چھپ سکی اور شفاء السقام بھی عرصہ ہوا دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی ایسی عظیم النفع کتاب ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہونی چاہئے۔ میں نے ایک دفعہ حضرت شیخ الحدیثؒ کو توجہ دلائی تھی، تو بڑی مایوسی کے انداز میں تحریر فرمایا تھا کہ کون چھاپے گا، کتب خانہ والے تو اب صرف نفع عاجل کے طالب ہیں اور ایسی علمی کتابیں مدت میں نکلتی ہیں، پھر یہ کہ جو اس کا ترجمہ کرے گا اور شائع کرے گا اس کو سلفی خیال کے لوگ پریشان کریں گے۔

علامہ سیوطیؒ نے ذیل طبقات الحفاظ میں علامہ تقی سبکی کو **الامام الفقیه المحدث الحافظ المفسر الاصولی المتکلم المجتهد** لکھا۔ ان کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ بتائیں، اور لکھا کہ ان کی تصانیف ان کے **تبحر فی الحدیث** وغیرہ اور **وسعت نظر فی العلوم** کی گواہ ہیں۔ (ذیل ص ۳۵۲)۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی ان کے علم وفضل، زہد وورع کی بڑی مدح کی ہے، علامہ زین العراقی نے کہا ایک جماعت ائمہ نے ان سے تفقہ حاصل کیا اور ان کی شہرت اور تالیفات سارے اطراف میں پھیل گئیں۔ ان کے بعد ان جیسا کوئی نہ ہوا۔

محقق استویؒ نے فرمایا کہ اہل علم میں ان جیسا صاحب نظر ہم نے نہیں دیکھا، اور نہ ان جیسا جامع العلوم اور امور دقیقہ میں بہترین کلام کرنے والا، پختہ کاری اور نہایت انصاف سے اور مباحث میں رجوع الی الحق کرنے والا خواہ مقابلہ میں کوئی ادنیٰ طالب علم ہی ہوتا، علامہ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں ان کے مناقب عالیہ کا ذکر کیا ہے بہت سے اکابر نے ان کے لئے مرتبۂ اجتہاد کا اقرار کیا ہے، ایسے امام جلیل کی تنقیص کینہ پرور اہل بدعت ہی کر سکتے تھے، **شذاذو التفردات** کے مقابلہ میں ننگی تلوار تھے، **دفاع عن السنت** اور **رد حشویه** میں بڑے ثابت قدم تھے۔ باوجود قاضی القضاۃ اور دوسرے اہم عہدوں پر رہنے کے ان کے ترکہ اور میراث میں کوئی حبہ بھی غلط آمدنی کا نہیں پایا گیا۔ بلکہ اپنے پیچھے ۳۲ ہزار درہم کا قرضہ چھوڑ گئے۔ جن کو دونوں بیٹوں تاج سبکی اور بہار سبکی نے ادا کیا۔ نہایت متقشفانہ زندگی گزارتے تھے۔

ان کی تصانیف میں سے یہ ہیں: **السیف الصقیل**، جس سے ابن القیم کے نونیہ کا رد کیا ہے، **شفاء السقام فی زیارة خیر الانام**، جس سے ابن تیمیہ کا رد کیا ہے۔ اس کے رد کا ارادہ شمس بن عبدالہادی نے الصارم المنکی میں کیا ہے، لیکن علماء نے اس کے رد میں بھی متعدد تالیفات کی ہیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

افاداتِ اکابر: حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ مسئلۂ سفرِ زیارت نبویہ میں جمہور امت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہمیشہ سے سلفِ صالحین روضۂ شریفہ کے لئے سفر کرتے رہے ہیں، اور یہ تواترِ عملی کی صورت ہے جس کی شرعاً بڑی اہمیت ہے، اور جو کچھ اس کا جواب علامہ ابن تیمیہ اور ان کے اتباع نے دیا ہے، وہ اس درجہ کا نہیں ہے جس کو ذوقِ سلیم قبول کر سکے۔ پھر یہ کہنا اور بھی غلط ہے کہ وہ سب لوگ مسجدِ نبوی کی نیت سے سفر کرتے تھے، روضۂ مطہرہ کی نیت سے نہیں کرتے تھے کیونکہ ایسا ہوتا تو وہ مسجدِ نبوی کی طرح مسجدِ اقصیٰ کی طرف بھی سفر کرتے کہ حدیث میں تو تینوں مسجدوں کی فضیلت وارد ہے۔

یہی بات علامہ شوکانیؒ سے بھی منقول ہے، جن کے علم وفضل پر سارے سلفی اور غیر مقلدین بھی اعتماد کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ مشروعیتِ سفرِ زیارۃ نبویہ کی دلیلِ شرعی یہ بیان کی گئی ہے کہ ہمیشہ سے ہر زمانہ میں مختلف بلاد و مذاہب کے مسلمان حج کرنے والے مدینہ منورہ کا سفر زیارۃ نبویہ ہی کے ارادہ سے کرتے رہے ہیں اور اس کو افضل اعمال سمجھتے رہے ہیں، اور کسی نے اس عمل پر نکیر بھی نہیں کی ہے، لہٰذا یہ مسئلہ سب کا اجماعی واتفاقی رہا ہے۔ (فتح الملہم ص ۳۷۸/۳)۔

علامہ محدث ملا علی قاری حنفی شارح مشکوٰۃ شریف نے فرمایا کہ ابن تیمیہ نے بڑی تفریط کی کہ زیارۃ نبویہ کے لئے سفر کو حرام کہا، جس طرح دوسرے بعض لوگوں نے افراط کی کہ زیارت کو ضروریاتِ دین میں شمار کر کے اس کے منکر کی تکفیر کی۔

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ زیارت نبویہ افضلِ اعمال اور اجلِ قرباتِ الٰہیہ میں سے ہے اور اس کی مشروعیت محلِ اجماع بلانزاع ہے۔ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اوجز المسالک شرح موطأ امام مالک میں لکھا کہ مشروعیت زیارۃ نبویہ پر علماء کرام نے آیت **ولو انهم اذظلموا انفسهم** الخ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مثلاً علامہ ابن علان نے المبرد المهكي في رد الصارم المنكي لکھی، اور علامہ سمہودی نے نصرة الامام السبكي برد الصارم المنكي لکھی۔ وغیرہ۔ التحقيق في مسئلة التعليق، جو ابن تیمیہ پر رد کبیر ہے۔ رفع الشقاق، الدرة المضية في الرد على ابن تيميه۔ الاعتبار في بقاء الجنة والنار وغیرہ۔ الخ (مقدمه فتاوىٰ السبكي) دو ضخیم جلدوں میں شائع شدہ ہے۔ مبارک صد مبارک باد کے مستحق یہی حضرات تھے جنہوں نے امتِ مرحومہ محمدیہ کو خلافِ جمہور اقوال وشذاذ کے فتنوں سے خبردار کیا، ان کے دفاع میں اپنی علمی توتیں صرف کیں اور مسلکِ جمہور کی بھرپور حفاظت کے لئے کوششیں کیں۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

اسی طرح ہم ان نامسعود مساعی کو ہرگز پسند نہیں کر سکتے جو شذاذ وتفردات والوں کی تائید میں روا رکھی گئی ہیں، خاص طور سے ہم ان افرادِ امت سے بیزار ونفور ہیں جنہوں نے متاعِ دنیا کی خاطر ایسا کیا ہے۔ والى الله المشتكى۔

الحق يعلو ولا يعلىٰ: خدا کا شکر ہے غلو وتار کی حقیت اور اس کے انکار کی رکاکت سب ہی عوام وخواص امت کے لئے واضح ہو چکی ہے اور طلاقِ ثلاث کے ایک طلاق ہونے کے دعوے کو خود علامہ ابن تیمیہ کے نہایت عقیدت مندوں نے بھی غلط مان لیا ہے۔ اور ہم خدا کے فضل وکرم سے مایوس نہیں ہیں۔ السيف الصقيل اور شفاء السقام کی مساعیِ علمیہ بھی ضرور ضرور بار آور ہوں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شیخ الاسلام کا لقب: جس طرح دوسرے بہت سے اکابر علماءِ امت کو دیا گیا ہے، ہمارے زیرِ ترجمہ علامہ محدث تقی سبکی کو بھی اس سے نوازا گیا ہے، خدا کی شان کہ ایک یہ بھی شیخ الاسلام تھے جنہوں نے جمہور امت کے خلاف اقوالِ شاذہ کا رد وافر کیا اور ان کو برداشت کر ہی نہ سکتے تھے اور دوسرے ان ہی کے مقابل وہ بھی شیخ الاسلام تھے جن کے ۱۹۸ اقوال ودعاوی جمہور وسلف کے خلاف تھے اور وہ بھی نہ صرف فروع میں بلکہ اصول وعقائد میں بھی، جن کے بارے میں ان کے غالی مداح علامہ ذہبی کو بھی کہہ دینا پڑا کہ میں اصول وفروع میں ان کا شدید مخالف بھی ہوں۔ حافظ ابن حجر اور استاذ محترم علامہ کشمیریؒ کی طرح ہم بھی علامہ ابن تیمیہ کے غیر معمولی فضل وتبحر اور علمی گرانقدر تحقیقاتِ عالیہ کے قائل ہیں۔ مگر ان کے کثیر تفردات وشذاذ بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، اسی لئے جس طرح ان دونوں حضرات اور دوسرے سینکڑوں علماءِ امت نے ایسے اقوال ودعاوی کی تردید ضروری سمجھی ہے۔ ہم بھی اس فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہنا نہیں چاہتے واللہ المستعان۔ تاریخ دعوت وعزیمت ص ۲۱۸/۲ میں الرد على البكرى کے حوالہ سے امام مالکؒ کی طرف قبر انور کے پاس دعا کے بدعت ہونے کی صراحت نقل کی ہے۔ ایسی عظیم شخصیت کی طرف اتنی بڑی بات کے لئے فقہ مالکی کی کسی معتمد کتاب کا حوالہ ضروری تھا۔ جبکہ کبارِ مالکیہ سے دعا و استشفاع عند القبر النبوی کے لئے شفاء السقام وغیرہ میں معتمد نقول موجود ہیں اور خود امام مالک نے بھی خلیفہ ابوجعفر کو طلبِ شفاعت عند القبر النبوی کا حکم دیا تھا۔ تو وہ اس کو بدعت کیوں کہہ سکتے ہیں؟ پھر دوسرے تینوں ائمۂ مجتہدین اور ان کے کبار تابعین بھی ان دونوں باتوں کے قائل ہیں۔ تو یہ بدعت کیسے ہو سکتی ہے؟

استدلال کیا ہےاور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں، جیسا کہ حدیثِ بیہقی میں وارد ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں، محدث بیہقی نے حیاۃ انبیاء کے اثبات میں مستقل رسالہ لکھا ہے، شیخ ابومنصور بغدادی نے فرمایا کہ متکلمین محققین کا فیصلہ ہے کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں، لہٰذا بعد وفات کے آپکے پاس آنا ایسا ہی ہے جیسے وفات سے پہلے تھا۔

اس کے بعد آپ نے پندرہ احادیث نقل فرمائیں، جن میں حضور علیہ السلام نے زیارتِ قبرِ مکرم پر شفاعت کا وعدہ فرمایا ہےاور یہ بھی فرمایا کہ جس نے میری وفات کے بعد میری قبر کی آیات کی، اس نے گویا میری حیات میں زیارت کی۔ اور جس نے باوجود استطاعت کے میری زیارت نہ کی تو اس کے لئے کوئی عذر نہیں ہے۔ اور جس نے مکہ تک آ کر حج کیا پھر میری نیت سے میری مسجد میں آیا تو اس کے لئے دو حج مبرور ومقبول لکھے جائیں گے۔

علامہ علی قاری نے فرمایا کہ اس بارے میں احادیث بہ کثرت ہیں اور مشہور ہیں۔ علامہ شوکانیؒ نے فرمایا کہ زیارتِ نبویہ کا ثبوت ایک جماعتِ صحابہ سے ہے، جن میں سے حضرت بلالؓ کی روایت ابن عساکر نے بہ سندِ جید کی ہے، اس میں ہے کہ آپ نے حضور علیہ السلام کو خواب میں دیکھا ارشادِ نبوی ہوا کہ اے بلال! یہ کیا بے مروتی ہے، کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ میری زیارت کے لئے مدینہ طیبہ آؤ؟ اس پر وہ شدِ رحیل کر کے دار یا (شام) سے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور زیارتِ مبارکہ سے مشرف ہوئے (اوجز ص ۱/۳۶۴) امید ہے سلفی حضرات اس روایت پر ضرور غور کریں گے، کیونکہ علامہ شوکانی نے سندِ جید اور زیارتِ قبرِ نبوی کے لئے شدرحیل وسفر کا بھی اعتراف کیا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ صحیح بخاری میں ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آ سکتا، پھر اگر خواب کی بات کو حجتِ شرعی نہ بھی مانا جائے تو صحابیِ جلیل القدر سیدنا حضرت بلالؓ نے اتنا طویل سفر کیسے گوارا فرمالیا، یعنی علامہ ابن تیمیہ کی بات اگر صحیح ہوتی کہ زیارۃ قبرِ نبوی کے لئے سفر معصیت کا سفر اور حرام ہے، جس میں قصر بھی جائز نہیں، گویا ایسا ہے کہ جیسے کوئی چوری ڈکیتی کے سفر پر نکلا ہو تو کسی صحابی سے ایسے سفر کا صدور ممکن ہوسکتا تھا؟!

حضرت بلالؓ کی تشریف آوری مدینہ طیبہ کا واقعہ بہت مشہور[1] ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت سیدنا حسن وسیدنا حسینؓ وغیرہ کے اصرار پر آپ نے مسجدِ نبوی میں اذان بھی دی تھی، جس کے آدھے کلمات بھی آپ ادا نہ کر پائے تھے۔ کہ مدینہ میں زلزلہ سا آ گیا تھا اور گھروں میں پردہ نشین عورتیں تک بے چین ومضطرب ہوگئی تھیں۔ کیونکہ ان کے لئے حضور علیہ السلام کے زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔

آج بھی جس وقت مسجدِ نبوی میں اذان ہوتی ہے تو زائرین وحاضرین کے دلوں پر جو کیفیت گزرتی ہے، وہ بیان نہیں ہوسکتی پھر جب حضرت بلالؓ قبرِ نبوی پر حاضر ہوئے تو اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگے اور اپنا چہرہ قبر مبارک پر رگڑتے تھے معلوم نہیں آج کل سلفی ان کے اس فعل کو کتنی بڑی بدعت بلکہ شرک بھی کہہ دیں گے، کیونکہ ان کے یہاں تو ہر نئی چیز بدعت اور ہر تعظیم شرک ہے۔ یہ روایت ابن عساکر سے مروی ہے۔ جس کی سند کو تقی سبکی نے شفاء السقام میں جید قرار دیا۔

شفاء السقام ہی میں...... مدینہ طیبہ میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر ان کے میزبان حضرت ابوایوب انصاری کا فعل التزام قبرِ نبوی کا نقل کیا گیا ہے۔ جس پر مروان نے نکیر کی تھی تو آپ نے اس کی جہالت کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں کسی پتھر کے پاس نہیں آیا ہوں بلکہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا: **مارا لا بداست کہ بحرمین محترمین رویم دروئے خود رابر آں آستانہا بمالیم"** (ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ حرمین شریفین جایا کریں اور اپنے چہروں کو ان آستانوں پر ملا کریں) پھر لکھا کہ ہماری

[1] انوارالباری ص ۱۱/۴۰ میں بھی پورا واقعہ نقل ہوا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو اعلاء السنن ص ۸/۲۰۸

سعادت اور خوش نصیبی اسی میں ہے اور ہماری شقاوت و بدبختی اس مسلک سے روگردانی اور اعراض میں ہے۔ (حجاز و ہند کے سلفی الخیال حضرات اس عبارت کو بار بار پڑھیں۔)

حضرت شاہ صاحبؒ نے ''انفاس العارفین'' اور فیوض الحرمین میں ان فیوض و برکاتِ عالیہ کی طرف بھی اشارات کئے ہیں جو آپ کو وہاں کے قیام میں حاصل ہوئے تھے۔ (علامہ ابن تیمیہ[1] اور ان کے ہم عصر علماء ص ۲۷)

سفرِ زیارت نبویہ

اس مسئلہ کی کافی تفصیل انوار الباری جلد ۱۱ میں آچکی ہے، اس کی مراجعت کی جائے، لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کی غایتِ اہمیت و عظمت کے سبب یہاں بھی کچھ لکھ دیا جائے، واللہ الموفق، بعض مادحین علامہ ابن تیمیہؒ نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ توحید کا غایتِ اہتمام اور شرک و مشرکانہ رسوم کے ذرائع مسدود کرنا ضرور بہتر ہے، اس سے کسی صاحبِ علم کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے لئے زیارتِ قبر نبوی کو مطلقاً روکنا ذکاوتِ حس اور تشدد سے خالی نہیں معلوم ہوتا اور یہ بات نہ ان کی علمی و دینی عظمت کے منافی ہے نہ ہمارے حسنِ اعتقاد اور ان کے کمالات کے اعتراف کے لئے مانع۔ نہ یہ مسئلہ اتنا سنگین تھا کہ اس کے لئے ان کو (یعنی ابن تیمیہ کو) محبوس کیا جائے اور اسی حالتِ اسیری میں وہ دنیا سے رخصت ہوں (تاریخ دعوت و عزیمت ص ۲/۱۱۸) دوسری جگہ لکھتے ہیں جن لوگوں کی فقہ و خلاف کی تاریخ اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و مسائل پر وسیع نظر ہے ان کے لئے تو یہ ''تفردات'' کوئی وحشت کی چیز اور ابن تیمیہ کے فضل و کمال کے انکار کا موجب نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر ائمہ مشہورین اور اولیائے مقبولین کے تفردات اور مسائلِ غریبہ جمع کردیے جائیں تو یہ تفردات بہت ہلکے اور معمولی نظر آنے لگیں الخ (ص ۲/۱۶۰) سوال ہلکے بھاری کا نہیں ہے۔ کیا دوسروں کے تفردات بھی کبھی ایسے اہتمام کے ساتھ شائع کرائے گئے تھے؟۔

مؤلف ''شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ'' نے اسی بات کو ذرا سنبھال کر پیش کرنے کی سعی کی ہے اور لکھا کہ اصولی درجہ میں اس توافق اور طرزِ فکر میں اسی یگانگت کے باوجود بعض نظریات و مسائل میں ہمارے اکابرِ دیوبند و علماء نجد میں کچھ فرق بھی ہے، مثلاً سفرِ زیارت نبویہ، توسل بالنبی صلے اللہ علیہ وسلم، سوالِ شفاعت، نظم یا نثر میں حضور علیہ السلام کو نداءِ غائبانہ، تارکینِ صلوٰۃ کی تکفیر و عدم تکفیر۔ مؤلف علام دام ظلہم نے حافظ ابن تیمیہ و شیخ محمد بن عبدالوہاب سے بیسیوں مسائلِ اصول و فروع میں اختلاف کو ذکر نہ کر کے بطورِ اختصار یہی پانچ ذکر کئے ہیں۔

راقم الحروف کے دل میں ان دونوں محترم حضرات کے علم و فضل اور گرانقدر علمی و ملی خدمات کی بڑی قدر ہے مگر افسوس کہ اس سلسلے میں ان دونوں کے اقوال و نظریات غیر ذمہ دارانہ ہیں۔ وللتفصیل محل آخر۔

یہاں اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ سفرِ زیارتِ نبویہ کی تحریم اور توسل نبوی پر حکمِ شرک لگانا اور اس قسم کے تفردات پر اس وقت کے تمام معاصرین علماءِ مذاہب اربعہ کا اجتماعی فیصلہ معمولی بات نہیں تھی، جس کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو یہ لکھنا پڑا کہ ''......ابن تیمیہ کے زمانہ میں ان کے تفردات کا رد جہابذۂ علماءِ شام و مغرب و مصر نے کیا تھا، پھر ابن القیم نے اپنے استاذ ابنِ تیمیہ کے نظریات کی توجیہ میں بڑی کوشش کی، لیکن اس کو بھی علماء نے قبول نہیں کیا۔ حتیٰ کہ حضرت والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے زمانہ میں شیخ مخدوم معین الدین سندی نے بھی ردِ ابن تیمیہؒ میں رسالہ لکھا، اور جب ان کے دعاوی علماء اہلِ سنت کی نظر میں قابلِ رد تھے ہی تو رد کرنے والے کیسے موردِ طعن بن سکتے ہیں؟

یہ بھی آپ نے لکھا کہ منہاج السنہ وغیرہ میں ان کے اقوالِ سخت وحشت میں ڈال دیتے ہیں، خاص کر تفریط حق اہل بیت، مع زیارۃ

---

[1] یہ کتاب محقق عصر حضرت مولانا شاہ زید ابوالحسن فاروقی مجددی دامت برکاتہم نے لکھی ہے، جو حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی دہلی نمبر ۶ سے دوبارہ شائع ہوئی ہے جو علامہ ابن تیمیہ کے حالات پر تحقیقی دستاویز اور ان کے بعض تفردات پر گرانقدر نقد ہے۔ اس پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا تبصرہ اور ڈاکٹر مولانا محمد عبدالستار خان صاحب نقشبندی و قادری دامت فیوضہم کا تقدمہ بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

نبویہ، انکارِ غوث وقطب وابدال اور تحقیر وتوہینِ صوفیہ وغیرہ اور یہ سب مضامین میرے پاس نقل شدہ موجود ہیں (فتاویٰ عزیزی ص ۲/۸۰)

علامہ ابنِ تیمیہ کی قید کے زمانہ میں ان کے کچھ لوگ ہم خیال اور ہمدرد بھی تھے، اور ان کی بار بار کی قید وبند کی تکالیف سے تو موافق مخالف سب ہی متالم ومتاثر تھے، اور سعی کرتے تھے کہ وہ ایسے مسائلِ غریبہ سے رجوع کرلیں اور قید سے رہائی پائیں، مگر علامہ کسی مسئلہ سے بھی رجوع کرنے کو تیار نہ ہوئے، اپنی دانست میں یہ انہوں نے بہت بڑا جہاد کیا ہے، اگرچہ اس سے امتِ مرحومہ کے لئے بہت سے فتنوں کے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ واللہ المستعان۔

ہمیں اس وقت صرف زیارۃ نبویہ کی عظمت واہمیت سے متعلق ہی کچھ مزید لکھنا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ نے زاد المعاد کے شروع میں بڑی اہم بحث فضیلتِ ازمنہ وامکنہ پر لکھی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کچھ ذواتِ قدسیہ، کچھ اوقات وازمنہ اور کچھ مقامات وامکنہ کو خاص طور سے فضل وشرف بخشا ہے۔ چنانچہ سات آسمانوں میں سے سب سے اوپر کے آسمان کو خاص شرف بخشا اور اس کو ملائکہ مقربین کا مستقر بنایا اور اپنی کرسی سے اور اپنے عرش سے قرب کی وجہ سے اس کو دوسرے آسمانوں پر افضلیت دی، اگر حق تعالیٰ کا قرب نہ ہوتا تو اس کو نیچے کے دوسرے آسمانوں پر فضیلت ہرگز نہ ہوتی، کیونکہ مادہ کے لحاظ سے سب آسمان برابر تھے۔

پھر جنت الفردوس کو بھی دوسری جنتوں پر اسی لئے افضل کیا کہ اپنے عرش کو اس کی چھت بنایا تھا اور بعض آثار میں یہ بھی آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جنت الفردوس کو اپنے ہاتھ سے بنایا تھا اور اس کو اپنی چنیدہ مخلوق کے لئے مخصوص کیا ہے۔ پھر فرشتوں میں سے بھی جبرئیل، میکائیل و اسرافیل کو خاص فضل وشرف دیا۔

پھر بنی آدم میں سے انبیاء علیہم السلام کو چنا جو ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے، ان میں سے تین سو تیرہ کو رسول کا مرتبہ دیا اور ان میں سے پانچ اولوالعزم بنائے، حضور علیہ السلام، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ وحضرت عیسیٰ علیہم السلام۔

پھر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو افضل ترین قبیلہ سے پیدا فرما کر سید اولادِ بنی آدم قرار دیا، ان کی شریعت کو افضل الشرائع ان کی امت کو خیر الامم بنایا۔

اس کے بعد علامہ نے لکھا کہ اماکن وبلاد میں سب سے زیادہ اشرف بلدِ حرام کو بنایا۔ اور اسی وجہ سے مناسکِ حج وہاں اور اس کے قرب وجوار میں ادا ہوتے ہیں۔ اور وہیں کعبۃ اللہ ہے، جس کی طرف سب نماز پڑھتے ہیں۔

لہٰذا یہ بھی معلوم ہوا کہ وہی تمام بقاعِ ارض میں سے سب سے افضل واشرف ہے۔ اور اس کے اختصاص وتفصیل کی بڑی علامت یہ ہے کہ ساری دنیا کے قلوب اس کی طرف جذب ہوتے ہیں اور سب کو اس بلدِ امیں سے ہی محبت کا سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔

اس کا سر (راز) یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے طہر بیتی فرما کر اس بیتِ محترم کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اس کے بعد علامہ نے ازمنہ کے شرف پر بھی سیر حاصل کلام کیا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے۔

آخر میں کہا کہ دنیا کے تمام افعال واعمال میں حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ومردود ہونے کا فیصلہ صرف انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا اپنے نبی کی معرفت اور اس کے احکام کی اطاعت ضروری ہے اس لئے ہم نے یہ کتاب لکھی ہے کہ حضور علیہ السلام کی سیرت طیبہ، آپ کے اخلاقِ فاضلہ، اور احکام سے مکمل واقفیت ہو سکے۔ اس کے بعد علامہ نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت وحالات پر چار جلدوں میں کافی وشافی مواد جمع فرما دیا ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

اس ابتدائی تمہید میں جو خاص اہم امور اپنے خاص نظریہ کے تحت لکھے ہیں، وہ یہ ہیں۔

۱۔ ساتویں آسمان کو شرف وفضل حق تعالیٰ نے اس لئے دیا ہے کہ وہ اس کی کرسی وعرش سے قریب ہے، ورنہ سب آسمان برابر ہوتے۔

۲۔ جنت الفردوس کوفضل وشرف اس لئے حاصل ہوا کہ اس کی چھت خدا کا عرش ہے۔
۳۔ بیت اللہ کوتمام بقاع ارض پرفضیلت ہے۔جس میں سر یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔
۴۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کوکسی مکان یا زمان میں فضیلت دی ہوتو وہ مکان اورزمان بھی تمام مکانوں اور زمانوں سے افضل ہو جائے۔
۵۔ نبی کی معرفت اس لئے ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ احکامِ خداوندی معلوم ہوتے ہیں۔

افضلِ بقاع العالم

علامہ ابن تیمیہؒ کے ممدوحِ معظم اور معتمد علمی علامہ ابن عقیل حنبلیؒ م ۵۱۳ھ کا ارشاد ہے کہ زمین وآسمانوں میں سب سے افضل واشرف جگہ وہ بقعۂ مبارکہ ہے، جہاں افضل الخلق رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم استراحت فرما ہیں، وہ جگہ عرشِ اعظم سے بھی زیادہ افضل ہے، اور علامہ محقق قاضی عیاض مالکیؒ نے اس جگہ کو بیت اللہ سے بھی افضل ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔علامہ ابن تیمیہ کو یہ بات پسند نہ آئی، اس لئے دعویٰ کردیا کہ یہ بات صرف قاضی عیاض نے نکالی ہے، نہ ان سے پہلے کسی نے کہی نہ بعد کو اس کی تفصیل تو مع دلائل کے ہم آگے کریں گے، یہاں یہ اشارہ کرنا ہے کہ زادالمعاد کے شروع میں علامہ ابن القیم کو اپنے استاذِ محترم کے نظریہ ہی کی تائید بڑی خوش اسلوبی سے کرنی تھی، چنانچہ کرگئے۔
کیونکہ جب زمین میں سب سے اشرف کعبہ مکرمہ ہوا، کیونکہ وہ بیت اللہ ہے، اور آسمانوں پر سب سے افضل عرش ہے کیونکہ اس پر خدا کا استواء بمعنے استقرار وتمکن وقعود وغیرہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ افضل کون سی چیز ہوسکتی ہے۔
اس طرح انہوں نے دوسرے سب حضرات محققین امت کی بات بھی کاٹ دی اور اپنا خاص نظریہ بھی قارئین زادالمعاد کے دلوں میں اتار دیا۔ہمارے نزدیک نہ تو عرش خدا کا مستقر ومکان ہے۔نہ بیت اللہ خدا کا گھر ہے، بلکہ دونوں حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہیں، جس طرح قبر نبوی بھی اس کی تجلی گاہ ہے۔اور جمہور امت کے نزدیک چونکہ سب سے بڑی تجلی گاہ قبر نبوی یا بقول علامہ ابن عقیل حنبلی مشہدِ معظم ہے، اس لئے وہی ساری اشیاءِ عالم میں سے سب سے زیادہ اشرف وافضل بھی ہے۔اور سیدالمرسلین اول الخلق بھی ہیں اور افضل الخلق بھی۔
نشر الطیب میں حضرت تھانویؒ نے مصنف عبدالرزاق سے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی حدیث نقل کی کہ حق تعالیٰ نے سب اشیاءِ عالم سے پہلے نبی کا نور پیدا کیا، پھر قلم، پھر لوح پھر عرش (ص ۵) اور یہ روایت بھی نقل کی کہ حق تعالیٰ نے فرمایا میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ میرے نزدیک مکرم ہو، میں نے ان کا نام عرش پر اپنے نام کے ساتھ آسمان وزمین اور شمس وقمر پیدا کرنے سے بیس لاکھ برس پہلے لکھا تھا۔الحدیث ص ص ۱۵۷)۔
قرآن مجید میں آیتِ میثاق بھی اس کی بڑی دلیل ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سب انبیاء علیہم السلام سے افضل تھے، اور آپ کی نبوت کا عہد سب سے لیا گیا تھا۔جبکہ خود تمام انبیاء علیہم السلام بھی دوسری تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ابتدا ہی سے خلعتِ نبوت سے سرفراز تھے اور خاتم النبیین بھی آپ ہی ہیں۔
پھر خیال کیا جائے کہ جو ذات مجمع الصفات آفرینش عالم سے بھی بیس لاکھ سال قبل سے مہبطِ انوارالہیہ اور مرکزِ فیوض وتجلیات ربانیہ ہمیشہ سے رہی اور ہمیشہ تک رہے گی، اس کی ذاتِ اقدس سب مخلوقات سے افضل ومشرف اور آپ سے مشرف شدہ سارے اماکن مقدسہ اور آپ کی موجودہ وآئندہ استراحت گاہیں سب اماکن سے زیادہ افضل واشرف کیوں نہ ہوں گی۔

فضل مولد نبوی وبیتِ خدیجہؓ

حتیٰ کہ آپ کے مولد[1] کو بھی بیت اللہ کے بعد مکہ معظمہ کی سب سے زیادہ افضل واشرف جگہ کہا گیا ہے۔اوراس کے بعد بیت سیدتنا ام المومنین حضرت حضرت خدیجہؓ کا درجہ ہے۔ جہاں حضور علیہ السلام نے مکہ معظمہ میں سکونت فرمائی تھی۔ حالانکہ ان دونوں جگہ کا تعلق آپ سے عارضی اور چندروزہ کا ہے البتہ قبرِ نبوی جو آپ کی برزخی دور کے لئے استراحت گاہ ہے۔اور ہر شخص جس مٹی سے پیدا ہوتا ہے، اسی میں دفن ہوتا ہے اس لئے جس مٹی سے آپ پیدا ہوئے تھے وہ بھی سب مٹیوں سے اشرف تھی ،اوراسی میں آپ دفن ہوئے ہیں۔

لہٰذا بہ لحاظ اس مٹی کے شرف کے بھی اور بہ لحاظ اس کے بھی کہ آپ کی اشرف الخلق ذات وہاں استراحت فرما ہے، اوراس لئے بھی کہ آپ لاکھوں برس سے تجلیات وانوارِ خداوندی سے منور ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ مشرف ومنور ہوتے رہیں گے، اس لئے کسی جگہ کو بھی اس جگہ سے زیادہ مشرف وفضل میسر نہیں ہے۔ رہا جو لوگ عرش کو خدا کا مستقر ومکان سمجھتے ہیں۔ وہ ضرور اس حقیقت کو ماننے سے انکار کریں گے،اسی کو حضرت تھانویؒ نے بیان کیا ہے۔

ارشاد حضرت تھانویؒ

حضرتؒ کا ایک وعظ ہے مسمّی " المحبور لنور الصدور " اس ۳۸صفحات کے وعظ میں حضرتؒ نے نہایت مفید علمی تحقیقی مضامین ارشادفرمائے ہیں، یہاں ان کا ضروری خلاصہ پیش ہے۔

" امتِ محمدیہ کو ایمان واعمالِ صالحہ کی دولت صرف نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی برکت واتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر آپ تشریف نہ لاتے تو ہم اس دولت سے محروم رہتے، اسی کو حق تعالیٰ نے بطریقِ امتنان واحسان جتا کر جا بجا قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے، مثلاً ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لا تبعتم الشیطانَ الا قلیلا، و لولا فضل اللہِ علیکم ورحمتہ لکنتم من الخاسرین۔

حضرت ابن عباسؓ نے ان مواقع میں فضل ورحمت کی تفسیر بعثت محمدیہ سے کی ہے۔یعنی بالخصوص صفات وذاتِ باری اور امورِ معاد کا علم ویقین تو بدون بعثتِ محمدیہ کے حاصل ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کا علم صرف عقل سے حاصل ہونا محال تھا۔اگرچہ خود عقل بھی ہمیں حضور علیہ السلام ہی کی بدولت ملی ہے، جو مستقل بڑی نعمت ہے، اس لئے کہ آپ واسطہ ہیں تمام کائنات کے وجود کے لئے۔

پھر یہ کہ حضور علیہ السلام کے نورِ مبارک کی برکات دو قسم کی ہیں، ایک صوری جو کہ تمام اشیاء عالم کے وجود وظہور کے متعلق ہیں، اگر آپ نہ ہوتے تو عالم کا وجود ہی نہ ہوتا، دوسری معنوی جن کا تعلق خاص اہل ایمان کے صدور وقلوب سے ہے کہ ایمان ومعرفت الٰہی سب کو حضور علیہ السلام ہی کے واسطہ سے حاصل ہوئی ہے۔ پہلی قسم کی برکات وآثار تو سب پر عیاں ہیں کہ دنیا کی ساری ترقیات، رونق اور چہل پہل کو سب دیکھ رہے ہیں، مگر دوسری قسم کی برکات وآثار وثمرات کا مشاہدہ قیامت کے دن اور جنت میں پہنچ کر ہوگا۔ یہاں ان سے ذہول وخفا ہے، حالانکہ رتبے میں وہی اعظم واعلیٰ ہیں۔آج کل لوگ ان کو بیان نہیں کرتے، حالانکہ زیادہ ضرورت ان ہی کے بیان کی ہے، کیونکہ ظہورِ صوری پر صرف اسی قدر اثر ہوا کہ ہم حضور علیہ السلام کے وجود باوجود کی برکت سے موجود ہوگئے مگر صرف موجود ہو جانے سے کچھ زیادہ فضیلت حاصل نہیں ہوسکتی، پوری فضیلت ایمان ومعرفتِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے انسان کو حیوانات پر شرف ہے، نیز یہ کہ جو اثرات نورِ مبارک کے ظہورِ صوری پر ہوئے وہ متناہی اور محدود ہیں، کیونکہ تمام موجودات عالم اپنی ذات کے اعتبار سے متناہی ہیں اور صدور وقلوب پر جو حضور علیہ السلام کے نورِ مبارک سے اثرات

---

[1] مسجد حرام کے شمال مشرقی میں محلہ غزہ اوراس سے شمال میں شعب بنی عامر تھا، جہاں مولد نبوی اوراسی کے قریب ابوطالب کا مکان تھا جو مولدِ حضرت علیؓ ہے۔ خاندان ابوالمطلب کے مکانات اسی محلہ میں تھے۔مسجدِ حرام کے مشرق میں دارارقم اور دارسیدتنا خدیجہؓ تھا۔ جو تقریبا ۲۵ سال مسکن مقدس نبوی رہا ہے۔وہ بڑا عالیشان مکان تھا جس کے سات بڑے کمرے اورایک بہت بڑا صحن تھا۔افسوس ہے کہ دونوں مقدس یادگاروں کو

ہوتے ہیں۔وہ غیر متناہی ہیں کہ معرفتِ الٰہی کے مراتب اوران کے ثمرات غیر متناہی ہیں جو ہم کو جنت میں نصیب ہوں گے۔

لہٰذا حضور علیہ السلام کے نور مبارک کی وہ برکات وثمرات زیادہ بیان کرنے کے قابل ہیں جو مومنین کے قلوب پر متجلی[1] ہیں اوراس آیت(ویوم تقوم الساعة) میں ان ہی ثمرات کا ذکر ہے، کہ مومنوں کوان کے ذریعہ پوری طرح خوش کردیا جائے گا، حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اس آیت کے شروع میں جواس امر کا بیان ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو جدا کردیا جائے گا۔یعنی مومنوں کا گروہ کافروں سے الگ ہوجائے گا،اور پھر جنت ودوزخ میں بھی الگ رہیں گے یہ وہاں کی جدائی بھی حضور علیہ السلام کے ہی نورِ مبارک کا ایک ثمرہ ہوگا کہ ایمان واعمال صالحہ والے دوسروں سے الگ ہوجائیں گے،دنیا کی ملی جلی آبادی والا معاملہ وہاں نہ ہوگا۔اسی کی طرف حدیث" محمد فرق بين الناس" سے اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد حضرتؒ نے قبرِ مبارک نبوی کے فضل وشرف پر بھی روشنی ڈالی ہے اور فرمایا کہ قبرِ مبارک کا شرف اس لئے ہے کہ جسدِ اطہر نبوی اس کے اندر موجود ہے، بلکہ حضور علیہ السلام خود یعنی جسدِ مبارک مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں،قریب قریب تمام اہلِ حق اسی پر متفق ہیں،صحابہ کا بھی یہی اعتقاد ہے،حدیث شریف میں بھی نص ہے" ان نبی الله حی فی قبره يرزق" کہ آپ اپنی قبر میں زندہ ہیں اورآپ کو رزق بھی پہنچتا ہے۔مگر یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے،وہ دوسری قسم کی حیات ہے،جس کو حیاتِ برزخیہ کہتے ہیں۔جس کے مختلف مراتب ہیں،ایک مرتبہ تو تمام جماعتِ مومنین کو حاصل ہے،جس کے ذریعہ نعیم قبر کی ہر مسلمان کو حس ہوگی اور یہ حیاتِ برزخیہ حیاتِ ناسوتیہ سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ واقویٰ ہوگی۔

دوسری حیات شہداء کی ہے، یہ مومنین والی حیاتِ برزخیہ سے زیادہ اقویٰ ہوگی۔اس کا اثر وثمرہ یہ ہے کہ زمین ان کے اجاد کو نہیں کھا سکتی۔اس لئے ان کے جسم محفوظ رہیں گے۔

تیسرا درجہ جو سب سے زیادہ قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہے کہ اس کے علاوہ کہ ان کے اجسام بھی محفوظ رہتے ہیں،ان کی ازواجِ مطہرات سے ان کے بعد کوئی امتی نکاح بھی نہیں کرسکتا،اوران کی میراث بھی تقسیم نہیں ہوتی۔

قبرِ نبوی کا فضل وشرف عرش وغیرہ پر

حضرتؒ نے فرمایا: علماء نے تصریح کی ہے کہ وہ بقعہ جس سے حضور علیہ السلام کا جسمِ مبارک مع الروح مس کئے ہوئے ہیں،وہ عرش سے بھی افضل[2] ہے، کیونکہ عرش پر معاذ اللہ حق تعالیٰ بیٹھے ہوئے نہیں ہیں،اگر بیٹھے ہوتے تو بیشک وہ جگہ سب سے افضل ہوتی مگر خدائے تعالیٰ مکان سے منزہ ہیں، اس لئے عرش کو مستقر خداوندی نہیں کہا جاسکتا،اوراس سے یہ بھی سمجھا آگیا ہوگا کہ" استوى على العرش" کے معنی استقراء کے ہرگز نہیں ہوسکتے۔

---

[1] حضرت تھانویؒ نے یہاں جن تجلیات وانوارِ محمدیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے،واقعہ ہے یہ کہ وہ دنیا کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہیں،اس ظلماتی دنیا میں جتنا نور کروڑوں اربوں ستاروں کے ذریعہ پھیلایا ہے، واللہ باللہ اس کو نورِ اعظم سید دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادنیٰ نسبت بھی حاصل نہیں ہے،اور حق تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نورِ اعظم کی شعاعیں ہر قلبِ مومن میں موجود ہیں،جس کی طرف شیخ عبدالعزیز دباغؒ کی ابریز میں اور حضرت اقدس مولانا نانوتویؒ کی آبِ حیات میں اشارات موجود ہیں۔اور اپنا خیال یہ بھی ہے واللہ اعلم کہ ادنیٰ درجے کے مومن کے قلب میں محض خدا کے فضل وانعام سے جو نورِ ایمان موجود ہے اس کی ایک کرن بھی اگر اس دنیا میں ظاہر ہوسکے تو سارے عالم کی مجموعی روشنی کو ماند کرسکتی ہے، پھر اعلیٰ درجہ کے مومنین اور اولیائے کاملین، پھر ملائکہ مقدسین۔انبیاء کرام اور سب سے بڑھ کر اول الخلق وافضل الخلق نور الانوار سرورِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کے نورِ اعظم کی عظمت وجلالت کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟! البتہ امید ہے کہ جہاں بہت سے علوم وانکشافات صرف جنت میں جاکر حاصل ہوں گے، وہاں ان مخفی درمخفی امور کا بھی انکشاف ہوگا،ان شاء اللہ اگرچہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ بعض امور مثلاً تقدیر کے رازوں کا انکشاف کما حقہ وہاں بھی نہ ہوسکے گا۔واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔"مؤلف"۔

[2] یہی بات حضرت شیخ الحدیثؒ نے بھی فضائل حج ص ۱۷۱/۱۷۰ میں لکھی ہے،آپ نے لکھا کہ قبرِ نبوی کی فضیلت میں کوئی اختلاف علماء کا نہیں ہے،وہ بالاتفاق سب علماء کے نزدیک سب جگہوں سے افضل ہے۔ابن عساکر،قاضی عیاض وغیرہ حضرات نے اس پر ساری امت کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پھر اگرچہ متاخرین نے بہ مصلحت وقت اور سمجھانے کے لئے اس کے معنی میں تاویل کی ہے مگر میرا رجحان سلف کے ساتھ ہے کہ اس کی کیفیت بیان کرنے سے سکوت کیا جائے، اور اس کے ساتھ میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ استوی علی العرش کے بعد یدبر الامر آیا ہے، اس کو استواء کا بیان سمجھا ہوں، جس طرح کہا جاتا ہے کہ ولی عہد تخت نشین ہو گیا، مطلب اس کا یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ حکمرانی کرنے لگا، اس کے لئے بھی خاص تخت پر بیٹھنا ہی ضروری نہیں ہوتا، اسی طرح یہاں بھی ہو سکتا ہے کہ عرش پر استواء ہوا اور تدبیر امر ہونے لگی۔ یعنی زمین وآسمان کو پیدا فرما کر حق تعالیٰ شانہ اس میں حکمرانی اور تدبیر وتصرف کرنے لگے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

غرض بوجہ مانعات عقلیہ استواء متعارف (استقرار) کا حکم نہیں کیا جا سکتا، اس لئے عرش کو محل استقرار حق تعالیٰ ہونے کی وجہ سے فضیلت نہ ہوئی، ورنہ وہ بقعہ شریفہ (قبر نبوی) سے ضرور افضل ہوتا۔ بلکہ اس کو صرف اس وجہ سے دوسرے اماکن پر فضیلت ہے کہ وہ ایک تجلی گاہ ہے، اور ظاہر ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون تجلی گاہ الٰہی ہوگا، پس اس حیثیت کے اثر سے بھی بقعہ شریفہ خالی نہ رہا۔ اس لئے ہر طرح وہ جگہ جہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ سب سے زیادہ اشرف ہوئی۔ کیونکہ تجلیات حق بواسطۂ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اس جگہ تمام اماکن سے زیادہ فائض ہوتی ہے۔ اس کے بعد حضرتؒ نے تبرکات کا بیان اور غلط رسوم وعقائد کے سلسلہ میں مفصل ومدلل ارشاد کیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

فتویٰ علماءِ حرمین، مصر وشام وہند

۱۹۰۹ء بمطابق ۱۳۳۹ھ میں ۳۶ سوالات کے جوابات مرتبہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب مہاجر مدنیؒ مع تصدیقات وتصویبات علماء حرمین شریفین وعلمائے مصر وشام وہند۔ ''التصدیقات رفع التلبیسات'' کے نام سے شائع ہوئے تھے، ان میں سے پہلے، دوسرے سوال کے جواب میں یہ لکھا گیا:

ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک زیارتِ قبر سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کی قربت اور سبب حصول درجات ہے بلکہ واجب کے قریب ہے کہ شد رحال اور بذل جان ومال سے نصیب ہو، اور سفر کے وقت آپ کی زیارت کی نیت کرے اور ساتھ میں مسجد نبوی اور دیگر مقامات زیارت ہائے متبرکہ کی بھی نیت کر کے بلکہ بہتر وہ ہے کہ جو علامہ شیخ ابن الہمامؒ نے فرمایا کہ خالص قبر شریف کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اتفاق اور اجماع نقل کیا ہے کہ یہ حصہ زمین کا بیت اللہ شریف سے بھی افضل ہے بلکہ قاضی عیاض نے لکھا کہ عرش معلیٰ سے بھی افضل ہے (شرح المواہب) جس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، مکان سے بے نیاز ہے، اور زمین کے اس حصہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک موجود ہے، اس کے بعد مکہ مکرمہ میں کعبہ شریف حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے علاوہ دنیا کی سب جگہوں سے بالاتفاق افضل ہے اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ (کذا ذکرہ ابن حجر فی شرح مناسک نوویؒ) اس کے ساتھ فضائل حج کے صفحات ۱۲۴ اور ۱۸۵ بھی ملاحظہ کئے جائیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ زمین میں کعبہ معظمہ کو سب جگہوں سے حتیٰ کہ موضع قبر نبوی سے بھی افضل کہتے ہیں، اور آسمانوں پر عرش کو افضل کہتے ہیں، وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ کعبہ مکرمہ قبر شریف کو مستثنیٰ کر کے (یعنی اس کے بعد) دنیا کی سب جگہوں سے بالاتفاق رائے افضل ہے، خواہ وہ جگہیں زمین پر ہوں یا آسمانوں پر۔

علامہ محدث صاحب درمختار م ۱۰۸۸ھ نے مطلب فی تفضیل قبرہ المکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے تحت لکھا کہ مکہ معظمہ قول راجح میں مدینہ طیبہ سے افضل ہے، بجز اس حصہ کے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اعضاء شریفہ مقدسہ کے ساتھ ملاحق ہے کیونکہ وہ مطلقاً افضل ہے کعبہ سے اور عرش وکرسی سے بھی پھر اسی عبارت درمختار کی شرح میں علامہ شامی م ق ۱۳۶۰ھ نے دوسرے اکابر امت سے بھی اس امر پر اجماع نقل کیا، اور علامہ ابن عقیل حنبلی (ممدوح ومتبوع علامہ ابن تیمیہ) کا بھی قول نقل کیا کہ بقعۂ مبارکہ عرش سے بھی افضل ہے۔ جس کی تائید سادات کبار بکریین نے بھی کی ہے (ردالمحتار ص ۲/ ۲۵۷)۔

صاحب روح المعانی علامہ ابن تیمیہ کے خلاف: علامہ آلوسیؒ کی تفسیر میں حذف والحاق کی کارروائی کر کے کئی جگہ ان سے علامہ ابن تیمیہ کے تفردات کی تائید ثابت کی جاتی ہے، مگر ان کی نظر شاید تفسیر روح المعانی ص ۱۵/ ۲۳۹ پر نہیں پہنچ سکی، جس میں موصوف نے جمہور سلف وخلف کی طرح بقعۂ مقدسہ قبر نبوی کو عرش سے افضل قرار دیا ہے۔ شرح مواہب میں یہ بھی ہے کہ وہ جگہ جو انبیاء علیہم السلام کے مبارک بدنوں سے متصل ہے وہ آسمانوں سے افضل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم جو لوگ عرش پر خدا کو مستقر ومتمکن کہتے ہیں، وہ لوگ اس حقیقت سے بالکل منحرف ومنکر ہیں۔ (مؤلف)

زیارت کی ہی نیت کرے۔ پھر جب وہاں حاضر ہوگا تو مسجد نبوی کی بھی زیارت حاصل ہو جائے گی۔ اس صورت میں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم زیادہ ہے، اور ہمارے نزدیک وہابیہ کا یہ قول مردود ہے کہ مدینہ منورہ کی جانب سفر کرنے والے کو صرف مسجد نبوی کی نیت کرنی چاہئے، ہم سمجھتے ہیں کہ حدیث شدرحال والی سے ممانعت سفر زیارۃ نبویہ نہیں نکلتی، بلکہ یہ حدیث بدلالۃ النص جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ مساجد ثلاثہ کے سفر کا حکم ان کی فضیلت کی وجہ سے ہے اور فضیلت زیادتی کے ساتھ بقعۂ شریفہ میں موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ حصہ زمین جو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اعضاءِ مبارکہ کو مس کئے ہوئے ہیں وہ علی الاطلاق افضل ہے یہاں تک کہ کعبۂ معظمہ اور عرش و کرسی سے بھی افضل ہے۔ چنانچہ فقہاءِ امت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اور اس مسئلہ کی تصریح ہمارے شیخ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی اپنے رسالہ **زبدۃ المناسک** میں فرمائی ہے۔ نیز حضرت شیخ المشائخ مفتی صدرالدین صاحب دہلویؒ نے **احسن المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال** لکھ کر وہابیہ اور ان کے ہم خیال لوگوں پر قیامت ڈھادی ہے۔

تیسرے سوال کے جواب میں لکھا کہ ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک دعاؤں میں انبیاءِ اولیاء، شہداء، وصدیقین کا توسل جائز ہے، ان کی حیات میں بھی اور بعد وفات بھی، جیسا کہ ہمارے شیخ مولانا محمد اسحق دہلوی مہاجر مکی اور حضرت گنگوہیؒ نے بھی اپنے فتاویٰ میں اس کو بیان فرمایا ہے۔

چوتھے سوال کے جواب میں لکھا کہ ہمارے نزدیک اور ہمارے مشائخ کے نزدیک حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قبرِ مبارک میں زندہ ہیں، اور آپ کی حیات دنیا کی سی ہے بلا مکلف ہونے کے، چنانچہ علامہ تقی الدین سبکیؒ نے فرمایا کہ انبیاء شہداء کی قبر میں حیات ایسی ہے جیسی دنیا میں تھی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبر مبارک میں نماز پڑھنا اس کی دلیل ہے کیونکہ نماز زندہ جسم کو چاہتی ہے الخ پس ثابت ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات دنیوی ہے اور اس معنی کو برزخی بھی ہے کہ عالم برزخ میں حاصل ہے۔ اور ہمارے شیخ مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا اسی مبحث میں مستقل رسالہ ''آبِ حیات'' لائق مطالعہ ہے۔

ان جوابات پر (مع دیگر جوابات کے) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صدر الاساتذہ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا احمد حسن امروہی۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، اور دوسرے ۱۲۲ اکابر دیوبند وسہارنپور کے تصدیقی دستخط ہیں، پھر ان جوابات پر تصدیقی وتائیدی بیانات اور دستخط بڑی تعداد میں اکابر علماء حرمین شریفین کے ہیں۔ پھر علماءِ جامع از ہر مصر، وحضرات علماءِ شام کے ہیں (کل تعداد ستر ہے)۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہ کو سفرِ زیارت نبویہ سے منع کرنے پر جیل میں محبوس کر دینا مناسب نہ تھا وہ یہ نہیں سوچتے کہ علماءِ شریعت نے کسی مستحب امر کو فرض وواجب کے درجہ میں سمجھ لینا اتنا برا نہیں بتایا جتنا کہ کسی امر مستحب کے حرام قرار دینے کو بتایا ہے، کما صرح بہ الملاعلی القاری وغیرہ غلطی پر دونوں ہیں، مگر دوسرے کی غلطی بہت بڑی ہے۔

چونکہ زیارتِ نبویہ کی اہمیت کچھ قلوب میں اتنی نہیں ہے جتنی ہونی چاہئے۔ اس لئے ہمیں اس مسئلہ پر پھر سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اب اس کو نئے اسلوب ودلائل کے ساتھ لکھنا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پوری بات اور تفصیل تو پھر ہوگی، یہاں اتنا عرض کرنا ہے کہ قریبی دور کے ان ستر اکابر علماء اسلام کے عقیدہ کے خلاف نظریہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ فضیلت زمین میں بیت اللہ کو ہے اور آسمان پر عرش کو۔ کیونکہ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم کا عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ عرش پر مستقر ہے، اور عرش کبھی کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ سے خالی نہیں ہوا، چنانچہ ابن القیم نے اپنے عقیدۂ نونیہ میں دوسروں کو طعنہ دیا ہے کہ تم لوگ عرش کو رحمان سے خالی مانتے ہو، حالانکہ وہ ساری مخلوق سے جدا اور عرش وکرسی پر ہے کہ کرسی پر اس کے دونوں قدم ہیں اور وہ اوپر ہی سے

سب کو دیکھتا ہے اسی نے شب معراج میں اپنے رسول کو اپنے پاس اوپر بلا کر اپنے قریب کیا تھا اور وہی ان کو قیامت کے دن اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔ اسی نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی حقیقۃً اپنی طرف اٹھالیا تھا۔ اور اس کی طرف ہر مصدق ومومن کی روح چڑھتی ہے۔ اور اس کے عرش میں اطیط ہے (یعنی بوجھل کجاوے کی طرح اللہ کے بوجھ کی وجہ سے چر چر کرتا ہے) اس نے اپنا کچھ حصہ طور پر بھی ظاہر کیا تھا اور اس کے چہرہ اور داہنا ہاتھ بھی ہے، بلکہ دونوں ہاتھ ہیں، اس کی ساری مخلوق اس کی انگلیوں پر رقص کرتی ہے۔

یہ بھی کہا کہ تعطیل والے جہالت ونامرادی کے مریض ان سب باتوں سے انکار کرتے ہیں۔ وہ یہود ونصاریٰ سے بھی زیادہ گمراہ ہیں، (جو لوگ ان باتوں کو نہیں مانتے ان کو ابن القیم وغیرہ تعطیل والے اس لئے کہتے ہیں کہ گویا وہ خدا کو ان لوازم وصفات سے خالی سمجھتے ہیں، حالانکہ معطلہ تو وہ ملحدین کا فرقہ ہے جو واقعی خدا کی صفات کا منکر ہے، اہل حق تو تمام صفات کو مانتے ہیں، صرف تشبیہ وتجسیم سے بچتے ہیں۔)

واضح ہو کہ اطیط والی حدیث اور عرش پر رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو بٹھانے کی حدیث دونوں شاذ ومنکر ہیں جن کا درجہ ضعیف سے بھی گرا ہوا ہے ایسے ہی آٹھ بکروں کے عرش کو اٹھانے والی حدیث بھی منکر وشاذ ہے، جب کہ یہ لوگ ابن القیم وغیرہ ان کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام سعی کرتے ہیں، اکابر محدثین نے ان کی پیش کردہ ایسی سب احادیث مکمل کلام کیا ہے، بلکہ مستقل تصانیف میں بھی ردِ وافر کیا ہے۔

علامہ ابن القیم حدیث معراج میں واقع بیت لحم (مولد سیدنا عیسیٰ علیہ السلام) پر براق سے اتر کر نماز پڑھنے کو بالکل غیر صحیح بتاتے ہیں (زاد المعاد ص ۲/ ۴۷ واقعہ اسراء ومعراج) "غیر صحیح البتۃ" کا مطلب یہ کہ کسی طرح بھی صحیح نہیں، یعنی یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ وہ اس کو ضعیف کا درجہ بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔ جبکہ اکابر محدثین نے کتب سیر میں اس کو ذکر کیا ہے لیکن خود ابن القیم زاد المعاد **فصل فی قدوم وفد بنی المنتفق** ص ۳/۵۴ میں ایک طویل حدیث لائے جو مع توثیق وتشریح کے کئی صفحات میں درج ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ قرب قیامت میں حق تعالیٰ کے حکم سے جب ساری دنیا فنا ہو جائے گی اور آبادیاں ختم ہو جائیں گی تو حق تعالیٰ زمین پر آ کر زمین میں گھومیں گے، پھر بارش ہو گی اور سب کو زندہ کیا جائے گا۔

یہ حدیث بھی تو غیر صحیح البتہ ہے، اور جس طرح اس کی توثیق کی گئی ہے، اس میں محدثین نے کلام کیا ہے، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس حدیث کی رو سے بھی تو عرش خالی ہو جائے گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ زمین پر اتر کر اس میں طواف کریں گے۔ اور **حدیث نزول آخر اللیل** میں بھی ان کے نزدیک نزول حقیقی ہے تو اس وقت بھی روزانہ عرش خالی ہو جاتا ہو گا۔ لہٰذا ہمارے ساتھ وہ بھی معطلہ بن جاتے ہیں کہ عرش کو رحمان سے خالی مان لیا۔

علامہ ابن تیمیہ سے جب کہا گیا کہ عرش تو حق تعالیٰ جل ذکرہ کی عظمت وجلالت کی شان کے لحاظ سے بہت چھوٹی چیز ہے، اس پر حق تعالیٰ کا **قعود و استقرار** سمجھ میں نہیں آتا تو فرمایا کہ واہ! خدا کی قدرت تو اتنی بڑی ہے کہ وہ چاہے تو مچھر کی پیٹھ پر بھی استقرار کر سکتا ہے۔

غرض یہ دونوں حضرات اور ان کے متبعین عرش پر خدائے تعالیٰ کا استقرار مانتے ہیں، اس لئے بقول حضرت تھانویؒ وہ عرش کی عظمت وفضیلت بھی تمام دوسری اشیاء عالم پر مانتے ہیں۔ لیکن جو حضرات اس عقیدہ کے قائل نہیں وہ زمین وآسمان کے سب اماکن سے افضل قبر نبوی کے بقعۂ شریفہ کو مانتے ہیں۔

چونکہ یہ بات علامہ ابن تیمیہ کے نظریہ کے خلاف تھی، اسی لئے انہوں نے دعویٰ کر دیا کہ یہ بات قاضی عیاض نے چلائی ہے نہ ان سے پہلے کسی عالم نے یہ بات کہی تھی نہ بعد والوں نے کہی ہے۔ چلئے ہو گیا فیصلہ، حضرت علامہ محدث بنوریؒ نے معارف السنن جلد سوم میں علامہ کا یہ دعویٰ نقل کر کے اس کا مکمل ومدلل رد کیا ہے اور راقم الحروف نے بھی انوار الباری جلد ششم میں رد کیا ہے۔ جہاں ان دونوں کا خلاصہ یکجا درج کیا جاتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ: علامہ نے لکھا: ذاتِ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے اکرم تو اللہ نے کسی مخلوق کو پیدا نہیں کیا، لیکن تربت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کعبہ سے افضل نہیں ہے، بلکہ کعبہ اس سے افضل ہے اور ترابِ قبر کی افضلیت کو سب سے پہلے قاضی عیاض نے پہچانا ہے، ان سے پہلے کسی

نے نہیں اور نہ کسی نے ان کی موافقت کی ہے۔ واللہ اعلم۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱/ ۲۴۹) طبع مصر۔

مکہ افضل بقاع اللہ ہے، یہی قول ابوحنیفہ و شافعی کا ہے اور ایک قول امام احمد کا بھی ہے، میرے علم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے تربتِ نبویہ کو کعبہ پر فضیلت دی ہو بجز قاضی عیاض کے، اور ان سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی، نہ کسی نے ان کی موافقت کی ہے (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۲/۲۶۳)

علامہ نے یہ نہیں بتایا کہ دوسرا قول امام احمدؒ کا کیا ہے اور نہ امام مالک کا قول نقل کیا، اگر دوسرا قول امام احمد کا اور امام مالک کا بھی وہی ہے جو قاضی عیاض کا ہے، تو کیا وہ دونوں قاضی صاحب سے پہلے نہیں تھے؟!

علامہ کی عادت ہے کہ ادھوری بات نقل کیا کرتے ہیں یا کئی باتوں کو بے ضرورت ایک جگہ کر کے سب پر یکساں حکم کر دیا کرتے ہیں۔ جس کی مثالیں ہم نے انوارالباری میں بھی پیش کی ہیں۔

یہاں گزارش ہے کہ علامہ نے اپنے فتاویٰ وغیرہ میں علامہ ابن عقیل حنبلیؒ کے اقوال کا بیسیوں جگہ حوالہ دیا ہے اور ان کے علم پر بہت زیادہ اعتماد کرتے ہیں، اور وہ واقع میں قدمائے حنابلہ میں سے بہت بڑے متبحر عالم تھے، جن کی تالیف التذکرہ اور کتاب الفنون جو آٹھ سو مجلد میں بتاتے ہیں۔ بہت مشہور ہیں۔

انہوں نے بھی تربتِ نبویہ کو جملہ سماوات وارض اور عرش و کعبہ سے بھی افضل کہا ہے، جس کو ابن القیم نے بھی "بدائع الفوائد" کی تیسری جلد میں نقل کیا ہے، اور اس پر کوئی نقد بھی نہیں کیا۔ بلکہ بطور فائدہ نقل کیا ہے۔

قاضی عیاض مالکی کی وفات ۵۴۴ھ میں ہوئی ہے اور ابن عقیل حنبلی کی ۵۱۳ھ میں، تو علامہ ابن تیمیہ کی بات کہاں گئی کہ قاضی عیاض سے پہلے یہ بات نہ کوئی جانتا تھا اور نہ کسی نے کہی ہے اور عجیب بات یہ کہ علامہ کے تلمیذِ رشید ابن القیم نے بھی اس کو نقل کر دیا، شاید ان کو معلوم نہ ہوا ہوگا کہ استاذِ محترم اتنا بڑا دعویٰ کر چکے ہیں۔

پھر یہ کہ قاضی عیاض سے بہت عرصہ پہلے علامۂ محقق و محدث ابوالولید باجی م ۴۷۴ھ بھی یہی بات (اجماع والی) کہہ چکے تھے، اور قاضی عیاض نے تو اس مسئلہ پر اجماع نقل کیا ہے، (شفاء ص ۲/۱۶۳) اب اوپر چلئے۔

مولانا المحدث البنوریؒ نے لکھا: امام مالک نے فرمایا کہ جس بقعہ میں جسدِ نبوی موجود ہے وہ ہر شی سے افضل ہے حتیٰ کہ کرسی و عرش سے بھی، اس کے بعد کعبۂ مکرمہ ہے، پھر مسجدِ نبوی، پھر مسجد حرام، پھر پورا مدینہ افضل ہے پورے مکہ معظمہ سے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی مدینہ طیبہ کے لئے ڈبل برکت کی خاص دعا کی وجہ سے مسجد نبوی کی نماز کا بھی مسجد حرام سے دوگنا ثواب ہے، یعنی دو لاکھ۔ لیکن اس خاص معاملے میں جمہور کی رائے یہی ہے کہ مسجد حرام کی نماز کا ثواب مسجدِ نبوی سے زیادہ ہے۔

مولانا بنوری نے کہا کہ ابوالولید باجی وغیرہ کے بعد قرافی مالکی وغیرہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے، پھر ابن عساکر اور شافعیہ میں سے علامہ سبکی کبیر و صغیر و حافظ ابن حجر وغیرہ نے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ اور حنفیہ میں سے علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری جلد سوم میں، ملا علی قاری نے مرقاۃ ص ۲۸۴/ ۲۶۹ جلد سوم میں، اور در مختار، رد المحتار، (قبیل النکاح) اور تنقیح الحامدیہ باب الحظر والاباحہ وغیرہ میں بھی اسی طرح ہے۔

علامہ نے یہ بھی کہا: حدیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ابدان، اہلِ جنت کے اجسام پر بنائے گئے ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ جنت کا ایک ذرہ بھی دنیا و مافیہا سے بہتر و افضل ہے۔

اس کے بعد موصوف نے لکھا کہ اس تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ جو کچھ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا، وہ کھلی غلطی ہے۔ یہ ابوالید باجی م ۴۷۴ھ قاضی عیاضؒ سے بہت پہلے ہیں، وہ کبار مالکیہ میں سے ہیں جن کے فضل و علم کا انکار نہیں کیا جا سکتا، انہوں نے وہی بات کہی جو قاضی عیاض نے کہی ہے اور ان سے ہی علامہ سمہودی م ۹۱۱ھ نے اپنی دونوں تالیفات قیمۃ الوفاء اور خلاصۃ الوفاء

میں نقل کیا ہے۔ پھر ابن عقیل حنبلی م ۵۱۳ھ تو وہ ہیں کہ ان پر اصول و فروع میں حنابلہ کی سیادت ختم ہوئی ہے جیسا کہ علامہ ابن الجوزی حنبلی نے اقرار کیا ہے۔ ابن ابی یعلی نے اس کو اپنی طبقات میں نقل کیا ہے۔ وہ ابن عقیل بھی وہی بات کہہ گئے ہیں جو بعد کو قاضی عیاض نے کہی ہے۔

آخر میں علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ مزید تفصیل و تحقیق کے لئے ملاحظہ ہوں فتح الملہم ص ۳/۳۱۹، اور نسیم الریاض للخفاجی م ۱۰۶۹ھ جلد ثالث عمدہ للعینی، قواعد الاحکام لعز الدین بن عبد السلام، الوفاء، وخلاصۃ الوفاء للسید السمہودی م ۹۱۱ھ وغیرہ۔

اس کے بعد علامہ نے لکھا کہ امام مالک نے حدیث بخاری و مسلم کی دعاء برکۃ سے استدلال کیا ہے کہ مکہ معظمہ سے دوگنی برکت مدینہ طیبہ کو حاصل ہو، جس میں برکت ظاہری و مادی اور برکتِ باطنی و روحانی دونوں آجاتی ہیں۔ اور دوسری احادیث بھی صحاح میں ہیں، جن کو صاحب الوفاء نے جمع کیا ہے۔ اور علامہ عینی نیز ان سے پہلے قاضی عیاض نے بھی شفاء میں حدیثِ موقوف سیدنا عمرؓ سے استدلال کیا ہے۔ لہٰذا مسجد نبوی میں ۱۲ لاکھ کا ثواب ثابت ہوا، (معارف ص ۳/۳۲۶)۔

یہ حدیث موقوف موطا امام مالک میں بھی ہے، باب جامع ماجاء فی امر المدینۃ (ص ۶/۱۴۱ اوجز) اس طرح کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عیاش مخزومی کو بلا کر فرمایا کیا تم کہتے ہو کہ مکہ بہتر ہے مدینہ سے؟ انہوں نے کہا کہ وہ حرم اللہ وامنہ ہے اور اس میں بیت اللہ بھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں بیت اللہ یا اس کے حرم کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ پھر فرمایا کہ کیا تم یہی کہتے ہو کہ مکہ بہتر ہے مدینہ سے؟ انہوں نے پھر کہا کہ وہ حرم وامن خداوندی ہے اور اس میں اس کا بیت بھی ہے، حضرت عمرؓ نے پھر فرمایا کہ میں حرمِ خداوندی و بیت کے بارے میں کچھ نہیں کہتا پھر وہ دوسرے کام میں چلے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام مالک وغیرہ جو تفصیل مدینہ منورہ کے قائل ہوئے تھے، وہ حضرت عمرؓ وغیرہ صحابہ کی رائے سے بھی واقف تھے، کیونکہ کسی صحابی نے حضرت عمرؓ کی بات پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ یہی اجماع کی شکل ہوتی ہے۔

اس موقع پر اوجز میں لکھا کہ اس بارے میں سلف کا اختلاف ہے، اکثر تفضیل مکہ کے قائل ہیں، امام شافعی ابن وہب، مطرف، ابن حبیب بھی اسی کے قائل ہیں اور اس قول کو ابن عبد البر، ابن رشد، ابنِ عرفہ نے بھی اختیار کیا ہے اور حضرت عمر، ایک جماعت، اور اکثر اہلِ مدینہ، امام مالک واصحاب تفضیلِ مدینہ کے قائل ہیں، اس کو بعض شافعیہ نے بھی اختیار کیا ہے دلائل دونوں طرف بکثرت ہیں۔ حتیٰ کہ محدث ابن ابی جمرہ نے دونوں طرف کے دلائل کی وجہ سے دونوں شہروں کو برابر کر دیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ تعارض ادلہ کی وجہ سے توقف بہتر ہے تفضیل سے، لیکن دل کا میلان تفضیل مدینہ ہی کی طرف ہے۔ اور اگر غور و تامل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فضیلت کی چیز چھوٹی یا بڑی بھی ایسی نہیں جو مکہ کو دی گئی ہو، اور مدینہ کو نہ دی گئی ہو اور علامہ سیوطیؒ نے خصائص میں تفضیلِ مدینہ پر جزم بھی کر لیا ہے۔

بقعۂ مبارکہ قبر نبوی

علامہ نے اس کے بعد لکھا کہ جو کچھ بھی اختلاف اوپر ذکر ہوا ہے وہ بقعۂ نبویہ (قبر نبوی) کے علاوہ میں ہے، کیونکہ وہ اجماعی فیصلہ سے تمام بقاع ارض وسماوات سے افضل ہے کما حکاہ عیاض وغیرہ پھر دوسرے درجہ پر کعبہ معظمہ افضل ہے اور وہ باقی مدینہ طیبہ سے بھی افضل ہے۔ کما قال الشریف السمہودی، اور اسی کی طرف حضرت عمرؓ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ (اوجز ص ۶/۱۴۳) عمدۃ القاری ص ۲/۶۸۷)۔

لمحۂ فکریہ: علامہ سیوطیؒ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے بھی بقعۂ شریف قبر نبوی کی وجہ سے مدینہ کو مکہ معظمہ پر فضیلت دی تھی، اور تمام صحابہ نے اس پر سکوت کیا تو یہی اجماع کی صورت بن گئی تھی، اور پھر امام مالک وغیرہ نے بھی اسی کو اختیار کیا، بلکہ انہوں نے تو ثواب بھی زیادہ مان لیا بہ نسبت مکہ معظمہ کے۔

بہرحال! اوپر کی تفصیل سے یہ بات تو پوری طرح وضاحت میں آ ہی گئی کہ اس وقت صحابۂ کرام کے ذہنوں میں بس یہ بات تھی کہ بقعۂ مبارکہ کی وجہ سے ہی مدینہ کی فضیلت مکہ پر ہے، اور اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں تھا پھر تفضیلِ مدینہ والوں کے نزدیک بھی پورے شہر مدینہ کی فضیلت مکہ پر علاوہ کعبۂ معظمہ کے تھی۔ جس طرح تفضیلِ مکہ والوں کے نزدیک مدینہ پر فضیلت علاوہ بقعۂ نبویہ کے تھی۔ کیونکہ ایک حدیث مؤطأ امام مالک میں خود رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ زمین پر کوئی بقعۂ ایسا نہیں ہے جو مجھے اس کے لئے محبوب و پسندیدہ ہو کہ وہاں میری قبر ہو بجز مدینہ طیبہ کے۔ (اوجز کتاب الجہاد ص۴/۷۵)۔

اس حدیث کے بعد موطا میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں آپ سے چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت نصیب کر اور مجھے اپنے رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے شہر میں وفات دے۔

علامہ باجیؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ مدینہ طیبہ کو تمام بقاعِ مکہ وغیرہ پر ترجیح و تفضیل دیتے تھے کیونکہ اگر مکہ ان کے نزدیک افضل ہوتا تو وہ تمنا اس طرح بھی کر سکتے تھے کہ مکہ میں جا کر بحالت مسافرت یا حج کے لئے جا کر قتل ہوں، اس لئے کہ یہ بات ہجرت کے بھی منافی نہ ہوتی اور اس کے علاوہ بھی حضرت عمرؓ کی رائے تفضیلِ مدینہ کی معلوم ہو چکی ہے اور یہ بھی سب نے بالاتفاق مان لیا ہے کہ آپ کی دعا قبول ہوئی اور آپ شہید ہوئے۔ (اوجز ص۴/۷۶)۔

اوجز ص۶/۱۱۰ میں باب ماجاء فی سکنی المدینۃ میں تربتِ نبویہ کے فضائل ومحامد کے بارے میں قاضی عیاض کی شفا سے بہترین مفید واثر انگیز ارشادات نقل کئے گئے ہیں، اور دوسری ابحاثِ علیہ بھی بڑی قیمتی ہیں مجاورۃ مکہ افضل ہے یا مجاورت مدینہ طیبہ اس کی بحث بھی کافی وشافی آ گئی ہے۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

علامہ ابن تیمیہ نے جو اپنے فتاویٰ میں یہ کہا تھا کہ امام ابوحنیفہ وشافعی واحمد (ایک قول میں) کہتے ہیں کہ مکہ افضل بقاع اللہ ہے، یہ بھی مغالطہ ہے، کیونکہ یہ بات اوپر بھی لکھی گئی اور سب ہی نے لکھی ہے کہ امام ابوحنیفہ وغیرہ نے جو مکہ کو افضل کہا ہے، وہ مدینہ کی قبرِ نبوی کے بقعۂ کو مستثنیٰ کرتے ہیں، اور حضرت عمرؓ وامام مالک وغیرہ نے جو مدینہ کو مکہ پر فضیلت دی ہے، وہ بھی مکہ میں سے کعبہ معظمہ کو مستثنیٰ کرتے ہیں۔ غرض ہمارے علم میں ابھی تک ایسی کوئی تصریح نہیں آئی کہ کسی نے بھی کعبہ معظمہ کو بقعۂ نبوی پر فضیلت دی ہو۔ بجز ابن تیمیہ وغیرہ کے جنہوں نے آٹھویں صدی میں آ کر دوسری بہت سی نئی باتوں کی طرح یہ بھی کہی ہے۔

ایک چیز یہ بھی ذہن میں رکھی جائے کہ حضرت عمرؓ ثواب کی زیادتی کے بارے میں تو مسجدِ حرام کا ثواب زیادہ ماننے والوں میں سے ہیں، پھر بھی وہ حسبِ روایت موطأ امام مالکؒ مکہ پر مدینہ کی افضلیت کے بھی قائل ہیں، اور امام مالک کا ثواب کے بارے میں دوسرا مسلک ہے۔ اس کے باوجود دونوں کا مکہ پر فضیلتِ مدینہ کا قائل ہونا صرف تربتِ نبویہ کی وجہ سے ہے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ اس بارے میں دو رائے نہیں تھیں، اور یہ بات صحابہ کے دور سے ہی اجماعی رہی ہے۔ اس لئے ہی سارے اکابرِ امت نے اس پر اجماع کو نقل کیا ہے۔

کتنی حیرت کا مقام ہے کہ پھر بھی ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں کئی جگہ یہ دعوے کر گئے کہ تربتِ نبویہ کی افضلیت کا قائل بجز قاضی عیاض کے کوئی نہیں تھا، اور ان کے اجماعی امر کہنے پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔

راقم الحروف کے علم میں قاضی عیاض کے علاوہ اس معاملہ میں اجماع کو نقل کرنے والے بہ کثرت اکابرِ امت ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) امام ہبۃ اللہ اللالکائی م۴۱۸ھ آپ نے ''توثیقِ عری الایمان'' میں اجماع کو نقل کیا ہے (دفع الشبہ للحصنی ص۶۲)

(۲) ابوالولید الباجی مالکی م۴۷۴ھ مؤلف کتاب التعدیل والتجریح لرجال البخاری (الرسالہ ص۱۶۸)

(۳) ابن عقیل حنبلیؒ م ۵۱۳ھ مؤلف التذکرہ وکتاب الفنون ۸سو جلد

(۴) قاضی عیاض مالکیؒ م ۵۴۴ھ مؤلف مشارق الانوار علی صحاح الآثار۔شرح صحیح مسلم الشفا بتعریف حقوق المصطفیٰ وغیرہ۔

(۵) حافظ ابن عساکر شافعی م ۵۷۱ھ مؤلف ثواب المصائب بالولد و تاریخ دمشق ۸۰ جلد اطراف غرائب مالک موافقات وغیرہ (تذکرۃ الحفاظ ص ۱۳۲۸)۔

(۶) عزالدین بن عبدالسلام م ۶۶۰ھ مصنف الامام فی ادلۃ الاحکام۔ ہدایۃ السؤل فی تفضیل الرسول۔القواعد الکبریٰ فی الفروع۔ رسالہ فی القطب والابدال وغیرہم۔ الفتاویٰ المصریہ وغیرہ (البدایہ والنہایہ۔ النجوم الزاہرہ شذرات الذہب) (نوٹ) خاص طور سے ابن تیمیہ کے بڑے ممدوح و معتمد تھے۔ خفاجی نے ان کا قول بھی موافق جمہور نقل کیا۔ (معارف ص ۳/۳۲۵)۔

(۷) علامہ نووی م ۶۷۶ھ شارح مسلم شریف وغیرہ۔

(۸) علامہ محدث شیخ الاسلام تقی الدین سبکی م ۷۵۶ھ۔صاحب السیف الصقیل وشفاء السقام وغیرہ۔

(۹) علامہ تاج الدین سبکی م ۷۷۱ھ صاحب طبقات الشافعیہ وغیرہ (مقدمہ انوار الباری وغیرہ)۔

(۱۰) علامہ محدث سراج الدین بلقینی شافعی م ۸۰۵ھ (ذیل طبقات الحفاظ میں امام الائمہ، شیخ الاسلام علی الاطلاق، وغیرہ القاب عالیہ اور طویل تذکرہ۔ احادیثِ احکام وفقہ کے بےنظیر حافظ تھے، مؤلف شرح البخاری والترمذی وغیرہ (ص ۷/۲۱۷/۲۰۶)۔

(۱۱) علامہ محدث برماوی شافعی م ۸۳۱ھ شارح صحیح البخاری، وغیرہ مشہور محدث (مقدمہ انوار الباری وبستان المحدثین وغیرہ)۔

(۱۲) علامہ ابن حجر عسقلانی م ۸۵۲ھ مشہور و معروف محدث ومحقق بحر العلوم والفنون، شارح صحیح بخاری۔

(۱۳) علامہ بدرالدین عینی م ۸۵۵ھ مشہور و معروف محدث و محقق بحر العلوم والفنون، شارح صحیح بخاری۔

(۱۴) علامہ سیوطی م ۹۱۱ھ مشہور و معروف محدث و محقق بحر العلوم والفنون، مؤلف کتب کثیرہ نافعہ جدًا۔

(۱۵) علامہ سمہودی م ۹۱۱ھ صاحبِ وفاء الوفاء وخلاصۃ الوفاء وغیرہ تالیفاتِ جلیلہ قیمہ

(۱۶) علامہ قسطلانی م ۹۲۳ھ شارحِ بخاری وصاحب "المواہب اللدنیہ" وغیرہ۔

(۱۷) علامہ ملا علی قاری حنفی م ۱۰۱۴ھ شارحِ مشکوٰۃ شریف وموطأ امام محمد ومسند الامام الاعظم وجامع صغیر وشفاء قاضی عیاض وفقہ اکبر وغیرہ۔

(۱۸) علامہ خفاجی مصری حنفی م ۱۰۶۹ھ شارح شفاء قاضی عیاض (۴ جلد) مؤلف حواشی تفسیر بیضاوی وغیرہ۔

(۱۹) علامہ زرقانی مالکی م ۱۱۲۲ھ شارح موطأ امام مالک ومواہب لدنیہ۔

یہاں چند سطریں علامہ سمہودی شافعیؒ م ۹۱۱ھ کی وفاء الوفاء سے نقل کی جاتی ہیں۔ آپ نے تفضیلِ مدینہ منورہ کے دلائل میں سب سے پہلی دلیل یہی پیش کی ہے کہ اعضاءِ شریفہ نبویہ کے کعبہ منیفہ پر افضل ہونے کے لئے اجماع امت ہو چکا ہے، پھر دونوں مقدس شہروں میں سے کون سا افضل ہے، حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمر، امام مالک اور اکثر مدنی حضرات تفضیلِ مدینہ منورہ کے قائل ہیں۔ لیکن محلِ خلاف علاوہ کعبہ معظمہ کے ہے، کہ وہ تربتِ نبویہ کے سوا باقی مدینہ منورہ سے افضل ہے، اور اجماع کی بات قاضی عیاض نے اور ان سے پہلے ابوالولید باجی نے نقل کی ہے۔ جیسا کہ خطیب من جملہ اور ابوالیمن بن عساکر وغیرہم نے ذکر کیا ہے انہوں نے صراحت کے ساتھ کعبہ شریفہ پر فضیلت بتائی ہے، بلکہ التاج السبکی نے ابن عقیل حنبلی سے نقل کیا کہ تربتِ نبویہ عرش سے بھی افضل ہے، اور التاج الفاکہی نے فرمایا: علماءِ امت نے کہا ہے کہ تربتِ نبویہ علی الاطلاق زمین کی سب جگہوں سے افضل ہے حتیٰ کہ موضع کعبہ مکرمہ سے بھی۔

ہمارے شیخ محقق بن امام الکاملیہ نے تفسیر سورۂ صف میں فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے مواضع وارواح زمین وآسمان کی سب چیزوں

سے افضل ہیں اور جو کچھ خلاف ہے ان کے سوا میں ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام بلقینی نے ثابت کیا ہے۔ علامہ زرکشیؒ نے فرمایا کہ تربتِ نبویہ کی افضیلت مجاورۃ کی وجہ سے ہے، جس طرح بے وضو کو جلد مصحف کا چھونا حرام ہے۔

علامہ قرافی نے فرمایا کہ بعض فضلاء کو اجماع مذکور کے بارے میں تامل ہوا اور کہا کہ تفضیل تو اعمال پر کثرتِ ثواب کی وجہ سے ہوتی ہے اور عمل قبرِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جائز نہیں، ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ اسباب تفضیل کا انحصار ثواب پر نہیں ہے، چنانچہ یہاں تفضیل ثواب کی وجہ سے نہیں بلکہ مجاورۃ کے سبب سے ہے۔

چونکہ حضور علیہ السلام قبر مبارک میں زندہ ہیں اور آپ کے اعمال دوسروں کے اعتبار سے ثواب میں بہت ہی زیادہ ہیں۔ لہٰذا فضیلت کے لئے ہمارے اعمال کی وہاں ضرورت نہیں ہے، پھر آپ پر تو غیر متناہی رحمتوں اور برکتوں کی ہر آن اور ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے، تو اس کا فیض امت کو بھی ضرور پہنچتا ہے تو ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے قبر شریف افضلِ بقاع کیوں نہ ہوگی؟!

حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میری وفات بھی تمہارے لئے بہتر ہے، کیونکہ مجھ پر تمہارے اعمال پیش ہوتے رہیں گے، اگر خیر دیکھوں گا تو شکر کروں گا، اور تمہارے لئے استغفار کروں گا، لہٰذا آپ کی جناب میں حاضر ہو کر اور آپ کی مجاورت افضلِ قربات ہے اور آپ کے قریب میں دعائیں قبول ہوتی ہیں اور مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

علامہ ابن الجوزی حنبلی نے الوفاء میں حدیث نقل کی ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے دفن کے بارے میں اختلاف ہوا کہ کس جگہ کریں تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ زمین پر کوئی حصہ بھی خدا کے نزدیک اس جگہ سے مکرم و افضل نہیں ہے، جہاں آپ کی وفات ہوئی ہے اور اس بات کو سب نے مان لیا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ تفضیلِ قبرِ شریف پر سارے صحابہ کا اجماع واتفاق ہو گیا تھا۔ کیونکہ سب نے سکوت کر کے اسی جگہ دفن کیا ہے۔

نسائی اور شمائل ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا گیا کہ کہاں دفن کریں؟ تو آپ نے فرمایا کہ جہاں آپ کی وفات ہوئی ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کی قبضِ روح مکانِ طیب ہی میں کی ہے۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور ابویعلیٰ موصلی نے ان الفاظ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نبی کی روح اسی جگہ قبض کی جاتی ہے جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب جگہ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہی چیز خدا کو بھی محبوب ہوگی، اسی لئے میرے نزدیک مکہ پر مدینہ کی فضیلت ہے کیونکہ حدیثِ صحیح یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے دعا فرمائی یا اللہ! ہمارے لئے مدینہ کو محبوب کردے جیسا کہ مکہ ہے، بلکہ اس سے زیادہ، حاکم کی روایت یہ بھی ہے کہ اے اللہ! آپ نے مجھ کو اس جگہ سے نکالا جو مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی، اب تو مجھے ایسی جگہ ساکن کر جو تجھے سب سے زیادہ محبوب ہو۔ الخ (وفاء الوفاء ص ۱/۱۹)۔

اس میں علامہ زرکشی، التاج الفاکہی اور قرافی مالکی، کا ذکر بھی آ گیا، یہ سب ۲۱۔ اکابر امت ہوئے جنہوں نے خاص طور سے تربتِ نبویہ کے افضل البقاع علی الاطلاق ہونے پر اجماع نقل کیا۔ اور ۱۹۰۹ء میں جو التصدیقات شائع ہوئی اس پر اس دور کے ۷۰ علماءِ کبار کے دستخط ہیں، جو دنیائے اسلام کے سب سے چوٹی کے علماء تھے اور سب نے ہی تربتِ نبویہ کے کعبہ اور عرش وکرسی پر فضیلت کا عقیدہ ظاہر کیا اور سفرِ زیارتِ نبویہ کو افضل القربات بتایا ہے۔

اس کے بعد انصاف کیا جائے کہ علامہ ابن تیمیہ کے مندرجہ بالا فتاویٰ کی عبارتیں کیوں کر صحیح ہو سکتی ہیں؟ اور فتح الملہم ص ۳/۴۱۸ میں ابن تیمیہ کی ایک اور عبارت بھی نقل ہوئی ہے، (اس میں کہا کہ تربتِ نبویہ کے لئے میرے علم میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ مسجدِ حرام یا مسجدِ نبوی یا مسجدِ اقصیٰ سے افضل ہے بجز قاضی عیاض کے، انہوں نے اس کو اجماعی مسئلہ ظاہر کیا ہے جب کہ ان سے پہلے کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی، اور نہ اس پر کوئی دلیل ہے البتہ بدنِ نبی علیہ السلام ضرور مساجد سے افضل ہے، لیکن جس چیز سے آپ پیدا کئے گئے یا جس میں آپ

دفن کئے گئے تو یہ ضروری نہیں کہ آپ کی وجہ سے وہ بھی افضل ہو جائے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بدنِ عبداللہ آپ کے باپ کا ابدان انبیاء سے افضل ہے اور حضرت نوح نبی کریم ہیں اور ان کا بیٹا ڈوبنے والا کافر ہے، حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن ہیں اور ان کے باپ آذر کافر ہے، پھر جن نصوص سے تفضیلِ مساجد معلوم ہوتی ہے وہ مطلق ہیں جن میں سے قبورِ انبیاء وصالحین کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔ اگر تفضیلِ تربتِ نبویہ والوں کی بات حق ہوتی تو ہر نبی کا مدفن بلکہ ہر صالح آدمی کا بھی مساجد سے افضل ہو جاتا حالانکہ وہ سب بیوت اللہ ہیں۔ اور مخلوقین کے گھر خالق کے گھر سے افضل ہو جاتے، جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان کو بلندی عطا کی ہے۔

لہٰذا یہ قول تفضیلِ تربتِ نبوی والا دین میں ایک بدعت پیدا کی گئی ہے جو اصولِ اسلام کے مخالف ہے" صاحب فتح الملہم نے علامہ ابن تیمیہ کا قولِ مذکور نقل کر کے لکھا کہ مواہب لدنیہ اور اس کی شرح میں بھی لکھا ہے کہ سب نے تربتِ نبویہ کے افضل بقاع الارض ہونے پر اجماع کیا ہے الخ آگے مفصل و مدلل ردِ ابن تیمیہ کا قابلِ مطالعہ ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص ۱/ ۴۴۷ اور میں بھی بقعۂ مبارکہ قبر نبوی کی افضلیت کعبہ وعرش پر نقل کی ہے۔

لمحۂ فکریہ: علامہ ابن تیمیہ نے اپنی عقلِ خالص سے افضلیت زیر بحث پر فیصلہ دیا ہے، مسئلہ صرف تربتِ نبویہ کا تھا، تو اس کے ساتھ دوسرے انبیاء بلکہ اولیا کو بھی ساتھ ملا کر اپنی بات منوانے کی سعی کی ہے۔ اور مدینہ طیبہ میں جو تربتِ نبویہ والی جگہ سب سے افضل تھی اور جس کی وجہ سے حضرت عمر و ابن عمر و امام مالک واکثر اہلِ مدینہ نے بھی اس کو تمام بقاع الارض والسماء پر فضیلت دی تھی، اس کو بے حیثیت ثابت کیا گیا ہے۔ اس میں بدعت کیا ہو گئی اور اصولِ اسلام کی مخالفت کہاں سے نکل آئی۔ ایسے ہی مواقع میں ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ (علامہ کشمیری) فرمایا کرتے تھے کہ شاید ابن تیمیہ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ دین خدا کا ان کی ہی عقل کے معیار پر اترا ہے۔

افسوس ہے جو چیز شروع اسلام سے مسلّم چلی آ رہی تھی اور اس وقت سے اب تک کے سب علماءِ اسلام اس کو مانتے رہے ہیں اس کو آٹھویں صدی کے چند لوگ مخالفت کر کے ختم کرانا چاہتے تھے، تو یہ بات اتنی آسان نہ تھی جتنی سمجھ لی گئی تھی، اور اب بھی کچھ لوگ ایسا سوچتے ہیں۔ والحق یعلی والا یعلے۔ ان شاء اللہ وبہ نستعین۔

اہم نظریاتی اختلافات کی نشاندہی

یہاں ہمیں چند باتوں کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اسلام میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ عقائد واصول کا ہے، اور اس کے اہم مباحث کی نشاندہی سب سے پہلے امام اعظمؒ نے کی ہے، اور جس طرح وہ ایک فقہ اعظم کے بانی تھے، بلاشبہ وہی اصول وعقائدِ اسلام کے بارے میں بھی امام اعظم تھے، اور سب سے پہلے انہوں نے اس طرف توجہ فرمائی تھی۔ پھر فقہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے، ان کے بعد اس کی جانب امام احمد نے توجہ فرمائی تھی، امام مالک وشافعیؒ کی اس سلسلہ میں کوئی خاص خدمت نہیں ہے، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے چند اختلافی مسائل کے علاوہ چاروں مذاہب کے اندر عقائد واصول کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن ان کے بعد علامہ دارمی ہجری ۲۸۰ھ نے عقائد میں کتاب النقض لکھی (یہ دارمی سمرقندی صاحب السنن مشہور محدث م ۲۵۵ھ کے علاوہ تھے) امام احمد کے صاحبزادے شیخ عبداللہ م ۲۹۰ھ نے کتاب السنہ تالیف کی، محدث ابن خزیمہ م ۳۱۱ھ نے کتاب التوحید لکھی (جو بقول امام رازی کتاب الشرک ہے کیونکہ وہ ضرور بڑے محدث تھے مگر علمِ اصول وعقائد کے فاضل نہ تھے) ان تینوں کی کتابیں سلفیوں کی کوشش سے مصر میں چھپ گئی ہیں، اور ان میں تشبیہ وتجسیم کا مکمل سامان موجود ہے۔ ان تینوں کا وافی رد بھی علامہ کوثری کے مقالات میں شائع شدہ ہے۔

ان سب نے متاخرین حنابلہ کی ترجمانی کی ہے جو امام احمدؒ کے عقائد سے ہٹ گئے تھے۔ ان کے بعد ابو عبداللہ بن حامد م ۴۰۳ھ،

قاضی ابویعلی م ۴۵۸ھ اور ابن الزاغونی م ۵۲۷ھ آئے، انہوں نے بھی تشبیہ وتجسیم کا ارتکاب کیا، جن کا مکمل رد علامہ محدث ابن الجوزی حنبلی م ۵۹۷ھ نے دفع شبہ التشبیہ لکھ کر کیا، پھر علامہ تقی حصنی م ۸۲۹ھ نے اپنے زمانہ تک تمام متاخرین حنابلہ کا (مع ابن تیمیہ وابن القیم کے) رد لکھا "دفع شبہ من تشبہ وتمرد ونسب ذلک الی السید الجلیل الامام احمد" نیز شیخ الاسلام تقی سبکی م ۷۵۶ھ۔ مؤلف "شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام" نے خاص طور سے ابن القیم کے عقیدۂ نونیہ منظوم کا کامل ومکمل رد لکھا اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی م ۴۵۸ھ میں بھی تشبیہ وتجسیم کے رد میں کافی مواد موجود ہے، جو پہلے ہندوستان میں بغیر حاشیہ کے اور پھر علامہ کوثری کے حواشی کے ساتھ بیروت سے شائع ہوگئی ہے۔

یہ سب کتابیں شائع شدہ ہیں: ہر عالم دین کا فرض ہے کہ وہ اصول وعقائد کی قدیم کتابوں کا مطالعہ کرے اور خاص طور سے اکابر کی جن غلطیوں کی نشاندہی اوپر جیسی محققانہ کتابوں میں کی گئی ہے ان کا بھی بہ نظرِ انصاف وتحقیق ضرور مطالعہ کرے۔ اس زمانہ میں فتاوے ابن تیمیہ اور ان کی نیز ابن القیم کی تالیفات سے بھی واقفیت ضروری ہے، تاکہ ان کے علوم نافعہ سے بھی استفادہ کرے، اور بقول حافظ ابن حجرؒ شارح بخاری۔ ان کے تفردات واغلاط سے اجتناب بھی کرے۔

توسل وطلبِ شفاعت سے انکار

ہم یہاں بطور مثال علامہ ابن تیمیہ کے مذکورہ بالا نظریہ پر بحث ونظر کریں گے، اور اس سے پہلے ان کے اور ان کے متبعین کے چند اہم اختلافی نظریات کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) یہ لوگ اتنی بات میں تو جمہور علماء سے متفق ہیں کہ انبیاء واولیاء کے لئے بہ نسبت عام مسلمانوں کے خدا کے یہاں ایک خصوصیت وامتیاز کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور روزِ قیامت میں بھی، اور اس لئے ان کے توسل اور طلبِ شفاعت بھی ان دونوں حالتوں میں جائز ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کے لئے ان کی قبور میں حیات بھی مانتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ وہ حیاتِ برزخی ہے جو دنیا وآخرت کی حیات سے کم درجہ کی ہے اور اس برزخی حیات کے زمانہ میں ان سے توسل یا طلبِ شفاعت وغیرہ جائز نہیں ہے۔

جمہور علماءِ امت نے ان کی اس رائے کو غلط قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب انبیاء واولیاء خدا کے برگزیدہ مقبول بندے ہیں اور ان کے تقربِ خداوندی سے ہم دنیا وآخرت میں توسل وطلبِ شفاعت کرسکتے ہیں تو درمیانی برزخی زندگی میں وہی بات کیسے ناجائز یا شرک ہوسکتی ہے؟ ہر مسلمان کا عقیدہ جس طرح دنیا کی زندگی میں کسی ولی کے بارے میں اس کی مقبولیت ومقربیت عنداللہ کا ہوتا ہے اور اس کی الوہیت کا ہرگز نہیں ہوتا جو مومن کی شان ہے، تو اس کی حیاتِ برزخی کے زمانہ میں اس کی الوہیت ومعبودیت کا عقیدہ کیسے کرلے گا، کہ اس زمانہ میں اس سے توسل مطلب شفاعت کو شرک قرار دے دیا جائے!!

بقول مولانا علی میاں صاحب دام ظلہم کے یہ خیال صرف سلفیوں کی ذکاوت حس ہے اور کچھ نہیں، اور جمہور یہ بھی کہتے ہیں کہ برزخی حیات دنیا کی حیات سے کہیں زیادہ اقویٰ واعلیٰ واصفی ہے واز کی ہے، خاص طور سے اولیائے امت اور ان سے بڑھ کر شہدا کی اور سب سے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام کی۔ پھر ان میں سے بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ برزخی کو تو تمام اکابر امت نے دنیوی حیات سے بہت ہی زیادہ اقویٰ واعلیٰ کہا ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ ہفتہ میں دوبار امت کے اعمال آپ کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں۔ آپ کی جناب میں جو شخص حاضر ہوکر اپنا یا دوسرے کا سلام عرض کرتا ہے تو اس کو حضور علیہ السلام خود سنتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں جو شخص حاضر ہوکر اپنے گناہوں کی مغفرت خدا سے چاہے تو آپ کے قرب کی برکت سے وہ قبول ہوتی ہے اور آپ سے شفاعت چاہے تو آپ اس کے لئے شفاعت بھی کرتے ہیں۔ جس طرح قیامت میں بھی سب کے لئے کریں گے۔

اگر قیامت میں آپ سے طلب شفاعت شرک نہ ہوگا تو یہاں شرک کیوں ہوگیا؟ ان سلفیوں کی عقل بھی عجیب ہے ایک طرف تو یہ تشدد ہے، دوسری طرف اس امر پر اصرار ہے کہ یہ عقیدہ ضرور رکھو اور اس سے بالکل انکار نہ کرو کہ حق تعالیٰ قیامت کے دن عرش پر اپنے پاس حضور علیہ السلام کو بٹھائے گا۔ اور یہی مقام محمود کی تفسیر ہے۔

اور عرش پر حضرت حق جل ذکرہ کو بٹھانے کے عقیدہ کو زیادہ سے زیادہ صحیح و یقینی باور کرانے کے لئے جیسی جیسی رکیک باتیں حافظ ابن تیمیہ وابن القیمؒ نے کہی ہیں وہ سب اگر منظر عام پر آجائیں تو کوئی دانشمند ان حضرات کی بڑائی اور جلالت قدر کو مانتے ہوئے باور کرنے میں دس بار تامل کرے گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے، کچھ فقہاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک مسئلہ فقہیہ پر اپنی فہم و علم کے مطابق اپنا کر پھر حدیث میں اس کی تائید تلاش کرتے ہیں، گویا یہ لوگ فقہ سے حدیث کی طرف چلتے ہیں اور یہ طریقہ قطعاً غیر صحیح ہے، بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ پہلے ایک مسئلہ کے بارے میں ساری احادیث ماثورہ مع متون واسناد اور تمام آثار صحابہ پر نظر کریں، اور جو ان کے مجموعہ سے اس مسئلہ کا فیصلہ مستنبط ہو اس کو اپنا فقہی مختار قرار دیں، یہ طریقہ حدیث سے فقہ کی طرف چلنے کا ہے اور یہی صواب ہے۔

بات لمبی ہوئی جاتی ہے مگر بہت کام کی ہے، اس لئے اس وقت ایک مثال سمجھ میں آئی، وہ بھی گرہ میں باندھ لیجئے، امام بخاری کی جلالت قدر فن حدیث ورجال میں مسلم در مسلم ہے کہ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر ان کی فقہ کا حال یہ ہے کہ اس کو امام ترمذی جیسے ان کے تلمیذ رشید نے بھی نقل نہیں کیا۔ جبکہ وہ ائمہ اربعہ کے علاوہ سفیان ثوری وغیرہ کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں، اور نہ کسی دوسرے محدث وفقیہ نے ان کی فقہ کا مجموعہ ائمہ اربعہ کی فقہ کی طرح مدون کیا۔

ان کی شان بھی بہت سے مسائل فقہیہ میں ایسی ہی ہے کہ وہ اپنی فقہ کے تحت احادیث سے دلائل پیش کرنے کی سعی فرماتے ہیں بلکہ دوسروں کے احادیثی ذخیرہ و دلائل کو پیش بھی نہیں کرتے، جبکہ دوسرے محدثین۔ امام مسلم امام ترمذی، امام نسائی وابوداؤد وغیرہ سب ائمہ مجتہدین کو مابہ الاستدلال احادیث وآثار پیش کرنے کا التزام کرتے ہیں، بلکہ حد یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں صرف مجرد صحیح لانے کا التزام کیا، مگر اپنے ترجمۃ الباب میں جو اپنے فقہی مختار کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اگر اس کے لئے مرفوع حدیث ان کو ان کی شرط کے موافق نہ ملے تو صرف آثار صحابہ سے استدلال کر لیتے ہیں، اور اپنے خلاف جو احادیث مرفوعہ صحیحہ وارد ہیں ان کو وہاں ذکر نہیں کرتے۔

مثلاً جمہور محدثین وفقہاء نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ رکوع و سجود میں قراءت قرآن مجید ممنوع ہے اور اس ممانعت پر صحیح مسلم و ترمذی میں احادیث مرفوعہ صحیحہ موجود ہیں مگر امام بخاری سب کے خلاف اس کو جائز فرماتے ہیں (ہدایۃ المجتہد ص ۱/۱۱۰)۔

حائضہ اور جنبی کو محض آثار کی وجہ سے تلاوت قرآن مجید کی اجازت دیتے ہیں، حالانکہ جمہور کے پاس ممانعت تلاوت کی حدیث مرفوع موجود ہے۔ اور صحیح بخاری کے علاوہ جو دوسرے رسائل مسائل اور کتب رجال و تاریخ میں اپنی علمی جلالت قدر کے خلاف بہت سی باتیں لکھا گئے ہیں، ان کی مثالیں بھی انوار الباری وغیرہ میں آتی رہتی ہیں۔ یہاں عرض یہ کرنا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ وابن القیم کے ہم خیال چند سابقین ولاحقین نے جو تفردات فروعی مسائل کے علاوہ اصول وعقائد میں بھی اختیار کئے ہیں۔ ان پر کڑی نظر اس لئے رکھنی پڑ رہی ہے کہ تقریباً چھ سو سال کے بعد ان کی اشاعت بطور اصول مسلمہ ومتفقہ بڑے پیمانہ پر کی جا رہی ہے، اور مسلک جمہور کی اشاعت کم سے کم ہو رہی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کا طریقہ بھی ایسا ہی تھا کہ ان کے دماغ میں جو بات آجاتی تھی، پھر وہ یہ دیکھتے ہی نہ تھے کہ جمہور امت کا نظریہ کیا ہے اور ان کے پیش کردہ دلائل واحادیث کو بھی بلا تامل رد کر دینے کے عادی تھے۔ بقول حضرت علامہ کشمیریؒ وعلامہ شاء اللہ امرت سری اپنی ہی دھنتے ہیں دوسروں کی نہیں سنتے۔

پھر اپنی دانش و عقل پر اتنا زیادہ اعتماد کرتے تھے کہ چاہتے تھے دین کو بھی اپنی عقل کی کسوٹی پر اتاریں، جبکہ کئی اکابر علماءِ امت کو یہ رائے بھی قائم کرنی پڑی کہ علامہ ابن تیمیہ کا علم ان کی عقل سے زیادہ تھا۔ (کان علمہ اکثر من عقلہ) ان کے دل و دماغ پر یہ بات مسلط ہوگئی تھی کہ زائرینِ قبور کو برائیوں سے روکنا محال ہے جب تک کہ ان کو یہ عقیدہ نہ کرادیں کہ مقبورین کی حیات برزخی دنیا کی حیات سے بھی کم درجہ کی ہے۔ اس لئے دنیا و آخرت میں جو ان سے توسل و طلب شفاعت جائز تھی اور آئندہ ہوگی، وہ اس درمیانی دور میں بے سود لاحاصل، بلکہ ناجائز و شرک ہے۔ حالانکہ کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شرعی حدود و فیصلوں کو کسی بھی مصلحت کے تحت نیچا اور اونچا کردے بلکہ جو درجات فروعی و اصولی مسائل کے شریعت نے مقرر کردیئے ہیں وہی رہیں گے، پھر برائیوں خرابیوں اور بدعات و رسوم جاہلیت کو ہٹانے کی سعی بھی پوری طرح کرنی پڑے گی۔

چونکہ علامہ ابن تیمیہ اپنے کسی خیال سے بھی ہٹنے کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے تو ان کو جمہور کی پیش کردہ بہت سی احادیث و آثار کو رد کرنا پڑا۔ اور اپنے خیال کے مطابق روایات منکرہ، شاذہ تک کو بھی قبول کرنا پڑا۔

اسی طرح وہ مجبور ہوئے کہ اپنی تائید کے لئے اگر ایک دو رائے بھی مل گئیں تو ان کو پیش کردیا۔ اور آئمۂ مجتہدین میں سے کوئی نقل گری پڑی بھی ہاتھ لگی تو اس کو پیش کردیا۔ مثلاً حق تعالیٰ کے لئے جہتِ فوق اور استقرار علی العرش کے قائل ہوگئے، تو علامہ ابن عبدالبر کے قول سے تائید لی۔ جبکہ اکابر ملت نے ان کے اس ول پر خود ہی نکیر کی ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے ایک ساقط روایت اس کی مل گئی کہ قبر نبوی پر حاضر ہوکر آپ کے مواجہہ میں سلام کرے تو ان سے پشت کرکے قبلہ رخ ہوجائے، حالانکہ اس روایت کی اکابر حنفیہ نے تغلیط کی ہے۔ بحث توسل کی ہورہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اقسام باللہ کو جوڑ کر دونوں کو ناجائز و شرک قرار دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

علامہ ابن تیمیہ سے قبل علامہ ابن الجوزی حنبلیؒ نے ان سب عقائد کی تردید کردی تھی۔ جو متاخرین حنابلہ نے امام احمدؒ کے خلاف اختیار کر لئے تھے، اور علامہ ابن تیمیہ نے ان کی کتاب مذکور اور ان کے دلائل کا کوئی جواب نہیں دیا ہے، جبکہ ان کے وسعتِ مطالعہ سے بہت ہی مستبعد ہے کہ وہ ان کے مطالعہ میں نہ آئی ہو۔ پھر علامہ تقی حصنی نے بھی مستقل تالیف ان عقائد کے رد میں لکھی، جس کا جواب ابھی تک نہیں دیا جاسکا اور حیرت زیادہ اس پر ہے کہ اس دور کے بعض سلفی الخیال اب بھی یہ کہتے ہیں کہ علامہ ابن تیمیہ نے تو صرف گنے چنے مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا تھا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ تفردات کا صدور تو بڑے بڑے اکابر سے بھی ہوچکا ہے وغیرہ حالانکہ تفردات کی اتنی بڑی تعداد یعنی سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی کیا نظر انداز کرنے کے لائق ہوسکتی ہے؟ علامہ ذہبی جو علامہ ابن تیمیہ کے بڑے مداحین و مدافعین میں سے گزرے ہیں، فرماتے ہیں کہ میں علامہ کے نہ صرف فروعی بلکہ اصولی و عقائد کے مسائل میں بھی مخالف ہوں، دوسرے تلمیذ علامہ ابن رجب حنبلی نے بھی ان کے تفردات کا رد مستقل طور سے کیا ہے اور تیسرے تلمیذ ابن کثیر نے بھی بہت سے مسائل میں ساتھ نہیں دیا۔

ایک تلمیذِ رشید صرف ابن القیم ایسے تھے کہ انہوں نے اپنے استادِ محترم کی ہر بات پر صاد کی ہے، اور بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ انہوں نے علامہ ابن تیمیہ کے سارے تفردات کی تاویل و جوابدہی کی مگر علماء نے ان کی تاویلات کو قبول نہیں کیا۔ اس لئے اگر اب بھی کوئی عالم ابن تیمیہ پر اعتراض کرتا ہے تو وہ قابلِ ملامت کیوں ہو؟ (فتاویٰ عزیزی)۔

جہاں تک اہلِ بدعت کی قبر پرستی اور رسومِ جاہلیت کے اتباع کا تعلق ہے، ہم بھی ان کے سخت مخالف ہیں اور اسی لئے ہمیں بھی وہ لوگ ''وہابی'' ہونے کا طعنہ دیا کرتے ہیں، جس پر حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان لوگوں سے قیامت میں مواخذہ ہوگا کہ وہ نبذ بالالقاب کے مرتکب ہیں، جبکہ ہم شیخ محمد بن عبدالوہاب سے نہ نسبی تعلق رکھتے ہیں نہ مسلک و مشرب میں ان کے ساتھ ہیں۔

غرض یہ کہ علامہ ابن تیمیہ اور ان کے ہم خیال لوگوں کا یہ نظریہ جمہور امت کے بالکل خلاف ہے کہ اولیاء و انبیاء کا توسل اس برزخی حیات میں جائز نہیں، اور خاص طور سے سرورِ دو عالم، افضل المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی توسل و طلب شفاعت اور انکی قبر مبارک کے پاس دعا ناجائز ہے۔

(۲) برزخی حیات اور فرقِ حیات و مماتِ نبوی

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحبؒ نے لکھا کہ وہابیہ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کے واسطے حیات فی القبور ثابت نہیں، بلکہ وہ بھی مثلِ عامہ مومنین متصف بالحیوٰۃ البرزخیہ اس مرتبہ میں ہیں جو حال دوسرے مومنین کا ہے، اسی لئے وہ لوگ مسجدِ نبوی میں آتے ہیں تو نماز پڑھ کر نکل جاتے ہیں اور روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام اور دعاء وغیرہ پڑھنا مکروہ و بدعت خیال کرتے ہیں۔ (الشہاب ص ۲۴۴ طبع لاہور، پاکستان)۔

آپ نے لکھا کہ (ہمارے اکابر کے نزدیک) حضور علیہ السلام کی قبرِ مبارک میں حیات نہ صرف روحانی بلکہ جسمانی بھی از قبیلِ حیاتِ دنیوی بلکہ بہت وجوہ سے اس سے قوی تر ہے (مکتوبات شیخ الاسلام ص ۱/۱۳۰)۔

وہ) وہابی) وفاتِ ظاہری کے بعد انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ جسمانی اور بقاءِ علاقہ بن الروح والجسم کے منکر ہیں اور یہ (علماءِ دیوبند) صرف اس کے قائل ہی نہیں بلکہ مثبت بھی ہیں اور اس پر دلائل قائم کرتے ہیں (نقشِ حیات ص ۱/۱۰۳)

حضرت نانوتویؒ نے لکھا کہ انبیاء علیہم السلام کو ابدانِ دنیا کے حساب سے زندہ سمجھیں گے (لطائفِ قاسمیہ ص ۴) انبیاء کرام کو ان ہی اجسامِ دنیاوی کے تعلق کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں، یہ نہیں کہ مثلِ شہداء ان ابدان کو چھوڑ کر اور دوسرے ابدان سے تعلق ہو جاتا ہے۔ (رر)

حضرت مولانا تھانویؒ نے فرمایا: ارواحِ انبیاء کو بدن کے ساتھ علاقہ بدستور رہتا ہے بلکہ وہ اطراف وجوانب سے سمٹ آتی ہے، اس لئے حیاتِ جسمانی کو نسبت سابق سے اس طرح قوت ہو جاتی ہے جیسے کسی شمع پر سرپوش رکھ دینے کے بعد شمع کے شعلہ میں نورانیت بڑھ جاتی ہے۔ الغرض بقاءِ حیاتِ انبیاء ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی ازواج کو نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں، اور ان کے اموال میں میراث بھی جاری نہیں ہوتی (المصالح العقلیہ ص ۲/۲۱۲)۔

یہی بات زیادہ مفصل و مدلل طور سے حضرت نانوتویؒ نے آبِ حیات میں تحریر فرمائی ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ''المورد الفرخی فی المولد البرزخی'' میں فرمایا کہ حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات مقدسہ جو درحقیقت ولادتِ ملکوتیہ ہے، ولادتِ ناسوتیہ سے اہم واعظم ہے، کیونکہ یہ اقویٰ واتقی واصفی واکمل ہے، اقویٰ اس لئے کہ جو تصرفات وافعال اس حیات کے زمانہ میں صادر ہوتے ہیں وہ حیاتِ ناسوتیہ میں صادر نہیں ہوتے الخ (ص ۲۱) ولادتِ ناسوتیہ کے وقت انسان کو کوئی کمال بھی حاصل نہیں ہوتا، بخلاف ولادتِ ملکوتیہ کے کہ اس سے متصل ہی آدمی جامع کمالات ہو جاتا ہے، غرض حیاتِ ملکوتیہ بہ نسبت حیاتِ ناسوتیہ کے ادوم بھی ہے اور اتم بھی، اقوم بھی ہے اور افضل بھی، اکمل بھی ہے اور اجمل بھی، اقویٰ بھی ہے اور اتقی بھی، اعلیٰ بھی ہے اور اصفی بھی، ازکی بھی ہے اور اسنیٰ بھی، انفع بھی ہے اور ارفع بھی، اوسع بھی ہے اور اعلیٰ بھی، اشفی بھی اور احلیٰ بھی، وغیرہ وغیرہ (ص ۴۱)۔

حضرتؒ کا یہ پورا وعظ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات (ولادتِ ملکوتیہ) کے مناقب عالیہ اور فضائلِ مبارکہ کے بیان میں ہے، جو اپنے موضوع میں نہایت ہی مکمل و مدلل ایمان افزاء، علومِ نبوت کا بحرِ بیکراں اعلیٰ غذاءِ روح، بار بار پڑھنے اور حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے۔

حضرتؒ نے تصرفات وافعال سے اشارہ افاضہ واستفاضہ کی طرف کیا ہے، جس کی بڑی دلیل ہمارے قریبی دور کے شیخ الکل حضرت شاہ ولی اللہؒ کی فیوض الحرمین اور الدر الثمین وغیرہ ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کی حیات علماءِ امت کے یہاں متفق علیہ ہے اور اس میں کسی کا خلاف نہیں ہے کہ وہ بہ نسبت حیاۃِ شہداء کامل تر اور قوی تر ہے کیونکہ شہداء کی زندگی معنوی واخروی ہے، اور حیاتِ انبیاء حیات حسی دنیاوی ہے، احادیث وآثار سے یہی بات ثابت ہے (مدارج النبوۃ ص ۲/۴۴۷)۔

شیخ نورالحق دہلویؒ نے لکھا کہ جمہور کے نزدیک طے شدہ حقیقت اور مختار قول یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام بعد وفات کے دنیوی زندگی کے ساتھ متصف ہیں (تیسیر القاری شرح بخاری ص ۲/۳۶۲)۔

پاکستان کے عالم جلیل حضرت مولانا عنایت اللہ بخاری خطیب جامع مسجد گجرات نے ایک جوابی فتویٰ صادر کیا، جس پر پچاس دیگر اکابر علماءِ پاکستان کے بھی تصدیق وتائید کے دستخط ہیں۔ آپ نے لکھا کہ اس دنیا سے انتقال کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو عالمِ برزخ میں مثل شہداء بلکہ ان سے بھی اعلیٰ وارفع حیات برزخیہ عطا فرمائی گئی ہے، وہ حیاتِ دنیویہ نہیں بلکہ اس سے بدرجہا اعلیٰ وارفع، اجل وافضل حیات برزخیہ ہے، یہ جمہور اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، جس پر کتاب اللہ اور احادیثِ صحیحہ وارشاداتِ صحابہؓ شاہد ہیں (تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتی فی القبور ص ۲۷۶)۔

مؤلفِ تسکین الصدور حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب عم فیوضہم نے اس کتاب مستطاب میں نادر علمی جواہر پاروں کو یکجا کر کے امتِ محمدیہ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے، جزاہم اللہ خیر الجزاء۔ نیز ملاحظہ ہو شفاء السقام للعلامۃ المحدث التقی السبکیؒ۔

منکرینِ توسل وطلبِ شفاعت جو مقبورین کو معطل ومحبوس یا ان کی حیات کو بے حیثیت سمجھتے ہیں، ان کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا مندرجہ ذیل ارشاد لائقِ مطالعہ ہے، آپ نے فرمایا کہ مقبور صالح کی قبر کو تنگ قید کی طرح نہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ اس کے لئے وہاں فرش و لباس اور رزق سب اسباب راحت میسر ہوتے ہیں، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر سیر بھی کرتا ہے اور اپنے پیشرو مرنے والے عزیزوں سے ملاقاتیں بھی کرتا ہے اور وہ اس کو کبھی بطور ضیافت اور کبھی تفریح وموانست وتہنیت وغیرہ کے لئے اپنے مکانوں پر بھی لے جاتے ہیں، اس طرح ہر روز وہاں اس کی دل بستگی کا سامان مہیا کرتے ہیں تا کہ اس دارِ فانی کی یاد اس کے دل سے بھلا دیں۔

پھر یہ کہ اہلِ نجات کے لئے وہاں چار قسم کے مکان ہوتے ہیں ایک تو اپنے رہنے اور شب باشی کا خاص مکان دوسرا اپنے وابستگان و عقیدت مندوں سے ملاقات کا درباری دیوان، تیسرے سیر وتماشا وتفریح کے مقامات جیسے آبِ زم زم، مساجد متبرکہ اور دوسری دنیا وعالمِ برزخ کی نزہت گاہیں۔ چوتھے دوستوں اور ہمسایوں سے ملاقات کرنے کے دیوان خانے اور لان وغیرہ۔ اور جب تک کسی کے لئے اس کی بودوباش کا مکان مہیا نہیں کرا دیا جاتا، اس کو دنیا سے نہیں لے جاتے، یعنی یہ سب مکانات اس کی آخر عمر میں تیار کرائے جاتے ہیں۔

اس پوری تفصیل کے بعد یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ یہ سب مکانات اس کی تنگ قبر کے اندر ہیں، بلکہ یہ تو ان مکانات کے لئے داخل ہونے کا دروازہ ہے، جبکہ بعض ان مکانوں میں سے آسمان وزمین کی درمیانی فضا میں ہیں، بعض آسمان دوم وسوم میں ہیں، اور شہیدوں کے لئے عرش کے ساتھ لٹکے ہوئے بڑے بڑے پرنور قندیلوں میں ہیں۔

لوگ وہاں عالمِ برزخ میں ذکر وتلاوت، نماز وزیاراتِ مکانات متبرکہ میں مشغول رہتے ہیں، اور قوم کے بزرگ یہاں سے گئے ہوئے کنوارے بچوں کی نسبتیں اور رشتے طے کرتے ہیں تا کہ یومِ آخرت میں ان کی شادیاں کی جائیں وہاں (عالم برزخ میں) بجز لذتِ جماعت کے ساری لذتیں موجود ہیں اور سوائے روزہ کے سب قسم کی عبادتیں ہیں، وہ لوگ اوقاتِ متبرکہ مانند شبِ قدر وشب جمعہ میں آکر اپنے دنیا کے خاص عزیزوں کے ساتھ وقت بھی گزارتے ہیں۔ اور ان کو زندہ عزیزوں کے احوال بھی فرشتوں کے ذریعہ معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ وغیرہ (فتویٰ عزیزی ص ۲/۱۱۰)۔

غور کیا جائے کہ جب یہ سہولتیں اور راحتیں عالم برزخ میں عام مومنوں کے لئے ہیں، تو اولیاء وانبیاء کے واسطے پھر خاص طور سے سرورِ انبیاء اول الخلق وافضل الخلق صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کیا کچھ نہ ہوں گی، اور اس کے ساتھ کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ آپ کی جناب میں حاضری کے وقت ہم عرض حال کریں، اپنے گناہوں کی مغفرت خدا سے آپ کے توسل سے چاہیں اور آپ کی شفاعت چاہیں تو یہ

بات ناجائز یا شرک ہو جبکہ یہی بات دنیا میں بھی جائز تھی اور آخرت میں بھی درست ہوگی، بلکہ ایک حدیث[1] میں تو اس کی صراحت بھی ہے کہ میری زندگی تمہارے لئے خیر ہے اور میری وفات بھی خیر ہوگی۔ کیونکہ تمہارے اعمال میرے سامنے پیش ہوتے رہیں گے، اگر اچھے اعمال ہوں گے تو خدا کی حمد کروں گا، ورنہ میں تمہاری مغفرت کے لئے جناب باری میں عرض معروض کرتا رہوں گا۔ آپ کو تو ہر زمانہ میں ہمارے لئے شفاعت کرنے کی حق تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہو، مگر ہمیں عالمِ برزخ کے زمانہ میں آپ سے طلبِ شفاعت جائز نہ ہو۔ یہ بات کسی صحیح عقل میں نہیں آسکتی۔

(۳) علامہ ابن تیمیہ کسی بات پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر ساتھ کرنے سے بھی روکتے ہیں کیونکہ اس میں ان کو شرک کی بو آتی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایسا کئی جگہ آیا ہے، مزید تفصیل انوار الباری ص ۱۱/ ۱۵۶ اور دفع الشبہ للعلامۃ المحدث التقی الحصنی ص ۶۳ میں دیکھی جائے۔

(۴) مشاہد مقدسہ کے بارے میں بھی علامہ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کا مسلک جمہور سے الگ ہے، اسی لئے سعودی دورِ حکومت حرمین کے مشاہدِ مقدسہ کے نام ونشان سب مٹ چکے ہیں۔

احکام وفضائلِ حج وزیارت میں جتنی کتابیں تالیف ہوئی ہیں، ان میں مقاماتِ اجابۃ دعاء کی تفصیل بھی ملتی ہے، مثلاً مکہ معظمہ میں حضرت خدیجہؓ کا دولت کدہ جہاں حضرت ابراہیم کے علاوہ حضور علیہ السلام کی سب اولادِ اطہار پیدا ہوئیں، اور ہجرت تک ۲۸ سال حضور علیہ السلام کا قیام اسی مکان میں رہا۔ علماء نے لکھا ہے کہ مسجدِ حرام کے بعد مکہ کے تمام مکانات میں سے یہ مکان افضل ہے۔ اس سے پہلے آپ بیت ابی طالب میں رہتے تھے جو آپ کا اور ان کا مشترک مکان تھا۔ ۲۵ سال کی عمر تک آپ وہاں رونق افروز رہے۔

اسی طرح حضور علیہ السلام کی پیدائش کی جگہ جو مولد النبی کے نام سے مشہور ہے (فضائل حج تالیف شیخ الحدیث ص ۱۰۱) مرقاۃ شرح مشکوۃ ص ۱/ ۴۴۷ وص ۳/ ۲۸۴ مناسک ملا علی قاری ص ۳۵۱ اور جذب القلوب شیخ محدث دہلوی ص ۱۸ بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ نے خود لکھا ہے کہ ایسے مکان میں مجاورت وسکونت جس میں ایمان وتقوے کی زیادتی ہوتی ہے، سب سے افضل ہے، جہاں بھی وہ ہو۔ (فتاویٰ ص ۴/ ۴۶۳)۔

کیا ایسے دو مشاہد مقدسہ، جن میں افضل الخلق وسید المرسلین، محبوب رب العالمین صلے اللہ علیہ وسلم کا قیام ۲۸۔ اور ۲۵ سال رہا ہے، یعنی ۵۳ سال تک وہ تجلی گاہِ رب العالمین اور مہبط انوار و برکات غیر محدود رہے ہیں اور اکابرِ علماء امت نے وہاں کی زیارت اور دعا کو اقرب الی الاستجابۃ کہا تھا، کیا وہ اسی امر کے مستحق تھے کہ نہ اب وہاں کسی کو حاضر ہونے کی اجازت ہے اور نہ ان کی نشاندہی کی جاسکتی ہے، **والی اللہ المشتکی**.

مندرجہ بالا چند امور کو ہم نے کسی قدر تفصیل ووضاحت کے ساتھ صرف اس لئے بیان کیا ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح روشن ہو جائے کہ علامہ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کے نظریات جمہور وسلف کے نظریات ...... سے الگ ہیں، اور انکے بیسیوں مسائل اسی طرح ہم سے الگ ہیں، یہ سب امور چونکہ اب تک صرف عربی کتابوں میں ہیں، اس لئے غیر علماء ان سے کم واقف ہیں اور اسلئے وکلاءِ سلفین کو موقع ملا کہ وہ اس اختلاف کو بہت ہلکا اور غیر اہم باور کرانے کی سعی کیا کرتے ہیں۔ اور اسی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے حضرت تھانویؒ نے کئی جگہ اس کی صراحت کی ہے کہ ہمارا سلفیوں اور غیر مقلدوں سے اختلاف صرف فروعی مسائل میں نہیں ہے، بلکہ اصولی وعقائد میں بھی ہے۔

ہندوستان میں صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ علامہ ابن تیمیہؒ سے کچھ متاثر ہوئے تھے کیونکہ ان کے مطالعہ میں بہت سی تصانیف نہ آسکی تھیں، پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کی منہاج السنہ وغیرہ پر سخت تنقید کی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ نے سید احمد حسن عرشی قنوجی) برادرِ

---

[1] یہ حدیث شفاء السقام ص ۴۵ میں ہے اور جامع صغیر سیوطی میں اس کو حسن کہا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو انوار الباری ص ۱۱/ ۱۴۷ وص ۱۱/ ۱۵۳ حیاۃ ومماتِ نبوی کے فرقِ ابن تیمیہ کا رد انوار الباری ص ۱۱/ ۲۲۱ میں بھی قابل مطالعہ ہے (مؤلف)

نواب صدیق حسن خاں) کو سندِ حدیث دی تو اس میں لکھا کہ "ان پر واجب وضروری ہے کہ اللہ کے مقبول بندوں صوفیہ وفقہاء ومحدثین کے راستے پر چلیں جو راہِ مستقیم پر قائم رہے ہیں، ابن حزم وابنِ تیمیہ جیسوں کی اتباع نہ کریں۔"

پھر علامہ محدث مفتی صدر الدین صاحب اور حضرت مولانا عبدالحئی لکھنویؒ نے بھی علامہ ابن تیمیہ کے رد میں تصانیف لکھیں اور ہمارے اکابر دیوبند میں سے حضرت شاہ صاحب وحضرت مدنیؒ بھی علامہ کے تفردات کا رد کیا کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے استواء عرش وغیرہ کئی مسائل میں ردِ وافر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو بوادر النوادر۔ وغیرہ)۔

علامہ ابن تیمیہ کے تفردات میں سے بعض کو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی سیرۃ النبی میں اختیار کرایا تھا۔ مگر بعد کو ان سے رجوع کرلیا تھا۔ اگرچہ اب بھی وہ رجوع شدہ غلطیاں ہی طبع ہورہی ہیں۔ (ملاحظہ ہو انوار الباری ص ۸۳/۹) اس میں سید صاحب کے رجوع کی تفصیل دی گئی ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے ۲ ذی قعدہ ۹۲ھ کے ایک مکتوب میں راقم الحروف کو لکھا تھا کہ حافظ ابن تیمیہ کے متعلق حضرت شیخ الاسلام (مولانا مدنیؒ) کا تشدد تو مجھے خوب معلوم ہے، ان کے متعلق بذل میں کہیں کہیں "شیخ الاسلام" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، حضرت مدنیؒ نے اس کی وجہ سے مجھے کئی بار ڈانٹا حالانکہ وہ لفظ میرا نہیں تھا میرے شیخ کا تھا، بہرحال! حضرت مدنی تو ان کے بارے میں بہت زیادہ متشدد تھے اور بندہ کے خیال میں ان کے تفردات کو چھوڑ کر باقی چیزیں معتبر ہیں، البتہ جس نے ان کی کتابیں دیکھی ہیں وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ ائمہ حدیث وفقہ کی شان میں ان کا سب وشتم بہت زیادہ موجب اذیت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سعودی حکومت ان دونوں (ابن تیمیہ وابن القیم) کی کتابوں کو بہت کثرت سے شائع کررہی ہے۔ اوران دونوں کے خلاف کوئی لفظ سننے کے لئے تیار نہیں، یہ بھی آپ نے صحیح لکھا کہ ان کے یہاں حدیث کی صحت وضعف کا مدار ائمہ حدیث کے بجائے ان دونوں کے قول پر ہے، آپ نے توسل وغیرہ کے مسئلہ میں حافظ ابن تیمیہ وغیرہ کے اقوال کا رد کیا ہے، یہ تو بہت مناسب ہے، لیکن لب ولہجہ سخت نہ کریں تو بہتر ہے، اوراس سلسلہ میں میری فضائل حج کی آٹھویں فصل کے شروع میں بھی یہ مضمون بہت مفصل ہے اسے بھی ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

بذل المجہود کے حواشی میں حدیث الاستشفاع پر حضرت شاہ صاحب کشمیری نوراللہ مرقدہ کی طرح سے میں نے بہت سے اشارات اس مسئلہ کے لکھے ہیں وہ چونکہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں اس لئے آپ کے لئے نقل کرتا ہوں تا کہ ان ماخذ میں سے کوئی چھوٹ گیا ہو تو آپ دیکھ لیں۔ اس کے بعد حضرتؒ کا وہ طویل حاشیہ ہے جس میں بہت سی اہم کتب تفسیر وحدیث کے حوالوں سے توسل وطلب شفاعت کا جواز و استحباب ثابت کیا ہے۔ ارادہ ہے کہ مکتوب گرامی کا وہ حصہ کسی دوسرے موقع پر انوار الباری میں نقل کرادیا جائے گا۔ بلکہ وہ پورا مکتوب ہی شائع کرادیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

یہاں موقع ومحل کی مناسبت سے اتنی بات اور لکھنی ہے کہ استاذی حضرت مدنیؒ کا لفظِ شیخ الاسلام کے بارے میں اتنا تشدد بھی بے وجہ نہیں تھا، درحقیقت انہوں نے علامہ ابن تیمیہ کی وہ غیر مطبوعہ تالیفات بھی ملاحظہ کی تھیں جو علامہ کوثریؒ کے مطالعہ میں بھی آچکی تھیں، اسی لئے ان دونوں حضرات کے لہجہ میں زیادہ سختی آگئی تھی۔

شیخ الاسلام کا لقب

امتِ محمدیہ میں بہت سے اکابر علماءِ امت کو دیا گیا ہے، مگر الحق احق ان یقال کسی بھی دوسرے شیخ الاسلام کے حالات میں اتنی بڑی کثرت سے، اور نہایت اہم اصول وعقائد کے مسائل میں بھی تفردات کی یہ نوعیت ہمارے مطالعہ میں نہیں آسکی، جو ان کے یہاں ہے۔ یعنی ایسے تفرداتِ خاصہ اصولیہ وفروعیہ کو بجز چند افراد کے نہ ان سے پہلے کوئی ان کا قائل ہوا نہ ان کے وقت کے علماء نے ہمنوائی کی اور نہ بعد

کے محققین امت نے ان کی تصویب کی۔ بلکہ مستقل تصانیف ان کے ردود میں لکھی گئیں۔اس پر بھی کوئی اگر یہ کہے کہ ان کے تفردات دوسروں جیسے تھے یا بہت کم تھے، یا معمولی درجہ کے تھے وغیرہ تو یہ محض لاعلمی ہے یا مغالطہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

گزشتہ سالوں میں علماءِ نجد نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ طبقاتِ ثلاثہ بلفظ واحد کے مسئلہ میں علامہ ابن تیمیہ وابن القیم سے غلطی ہوئی، اور سب نے فیصلہ کیا کہ جمہور ائمہ وسلف ہی کی رائے درست تھی۔ اور اب نجد وحجاز میں خدا کا شکر ہے صحیح مسئلہ ہی رائج ہوگیا ہے، خواہ اس کو ہندوستان کے سلفی غیر مقلدین تسلیم کریں یا نہ کریں۔ اسی طرح رفیق محترم مولانا محمد یوسف بنوریؒ مجھ سے کہتے تھے کہ علماء نجد میں بہت حد تک اکابر امت کے صحیح فیصلوں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور جو بلا تعصب وسیع مطالعہ کررہے۔ وہ ان شاء اللہ جلد دیگر مسائل میں بھی جمہور ائمہ وسلف کے مسائل کی حقیقت کو تسلیم کرلیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان تک حق بات ہمارے علماءِ جرأت وہمت کے ساتھ پہنچادیں۔ بڑی کمی ہمارے یہاں بھی علم کے ساتھ اظہارِ حق کی ہوگئی ہے۔ اور مصالح ومفادات کی طرف رجحان علماء کے طبقہ میں بھی کافی ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ مولانا بنوری ہی کی طرح راقم الحروف بھی علماءِ نجد سے مایوس نہیں ہے، اوران میں خدا کا فضل ہے اس وقت بلند پایہ اہلِ علم موجود ہیں۔ جن میں بہت سے ہم سے بھی زیادہ علوم سابقین کا مطالعہ کررہے ہیں۔ اس لئے ان سے قبول حق وصواب کی توقع بہت زیادہ ہے۔

واللہ یقول الحق ویھدی الی صراط مستقیم.

ہم نے بجز چند افراد کی بات اس لئے کہی ہے کہ علامہ ذہبی جیسا مداحِ ابن تیمیہ اور ابن رجب ایسا تلمیذ ابن تیمیہ بھی ان سے اختلاف ظاہر کرنے پر مجبور ہوگیا تھا، اور بقول حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صرف علامہ ابن القیم ایسے رہ گئے، جنہوں نے اپنے استاذ کی ہر مسئلہ میں تصویب وتاویل کی کوشش کی ہے مگر ان کی تاویلات کو علماءِ امت نے قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔

ایک سب سے بڑی منقبت ان کے غالی مداحین نے یہ پیش کی تھی کہ وہ علم حدیث ورجال کے ایسے بحرِ ناپیدا کنار ہیں کہ جس حدیث کو صحیح کہہ دیں، وہی صحیح ہے اور جس کو رد کردیں وہ صحیح نہیں۔ مگر یہ بات بھی نہ چل سکی، کیونکہ حافظ ابن حجر جیسے ناقدِ حدیث نے ان پر سخت نقد کردیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ منہاج السنہ میں بہت سی صالح احادیث کو علامہ نے رد کردیا ہے اور زیارتِ نبویہ کے استحباب کی ان احادیث کو جو بہت سے طرق ومتون کے اجتماع کی وجہ سے ضعف سے نکل کر حسن کے درجہ میں ہوگئی ہیں، ان سب کو موضوع وباطل قرار دیدیا ہے اور **ابراھیم و آلِ ابراھیم** کے اجتماع والی حدیثِ بخاری کا انکار کرگئے، ہم نے انوارالباری جلد ۱۱ میں بھی بہت سی احادیث ایسی دکھائی ہیں، جو ضعیف وحسن تھیں اور علامہ نے ان کو گرادیا ہے، پھر اس کے مقابل علامہ ابن القیم حدیثِ اطیط، حدیثِ ثمانیہ اوعال، حدیث طواف فی الارض وغیرہ کی توثیق کرگئے جو شاذ ومنکر اور غیر معتمد ہیں خصوصاً فی الاصول والعقائد۔ اور علامہ ابن القیم کو تو فنِ رجال میں ضعیف علامہ ذہبی بھی لکھ گئے ہیں۔

بعض علماء نے علامہ ابن تیمیہ کی نفی کردہ احادیث ثابتہ کو مستقل رسالہ میں جمع بھی کردیا ہے، مگر وہ ابھی تک شائع نہیں ہوا، اور راقم الحروف کے اندازہ میں بھی ان احادیث ثابتہ کی تعداد چالیس پچاس سے کم نہ ہوگی۔ جن کو علامہ نے موضوع وباطل کہہ کر رد کردیا ہے۔

واضح ہو کہ احادیثِ ثابتہ میں صحیح کے علاوہ حسن وضعیف بھی ہیں۔ موضوع وباطل احادیث ان میں داخل نہیں ہوتیں، اور احادیثِ منکرہ وشاذہ بھی احادیث ثابتہ کے دائرہ سے خارج ہیں، اور کم از کم ان سے مسائل وعقائد کا اثبات تو صحیح ہوتا ہی نہیں۔ جبکہ علامہ ابن تیمیہ ابن القیم نے ایسی احادیث منکرہ سے عقائد بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

علمی تعصب: یہ چونکہ تمام تعصّبات سے زیادہ بدتر اور مضرتر بھی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا چلن اس وقت مقدس ارضِ حجاز ونجد میں بھی ہے کہ وہاں صرف ان کے خیال سے موافقت کرنے والا لٹریچر شائع ہوسکتا ہے اور ان کے خلاف والی کوئی کتاب وہاں نہیں جاسکتی، اس پر سخت سنسر ہے۔ سعودی حکومت کا بڑا سرمایہ صرف اپنے خیال کی کتابوں کی اشاعت پر صرف ہوتا ہے یہاں تک کہ جو ہندوپاک کے علماء ان کے

خیال کی تائید میں لکھتے ہیں، ان کی اردو کتابیں بھی وہاں کی حکومت خرید کر ہندو پاک کے حجاج کو اپنی کتابوں کی طرح مفت عطا کرتی ہے۔ اور ہمارے خیال کے لٹریچر کو وہاں ہندو پاک کے مقیمین بھی نہیں منگا سکتے نہ پڑھ سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ تشدد و تعصب کب تک رہے گا؟! جبکہ جلالۃ الملک شاہ فہد خود بھی اس کے خلاف ہیں۔

یہاں چونکہ بات قبرِ نبوی کی افضلیت سے چلی تھی اور علامہ ابن تیمیہؒ نے اس کا رد تین جگہ اپنے فتاویٰ میں کیا ہے۔ اس لئے اس کا جواب بھی لکھ دینا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کو نقل تو سب کرتے ہیں اور اپنے دلائل بھی پیش کرتے ہیں مگر علامہ کے "دلائلِ قاہرہ" کا مفصل جواب ابھی تک ہمارے مطالعہ میں نہیں آیا ہے۔ اور جب تک ان کا رد نہیں ہوگا۔ لوگ مغالطہ میں پڑے رہیں گے، اور پورا فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ حق کیا ہے اور غلط کیا؟

تنقیح دلائل علامہ ابن تیمیہؒ

(۱) آپ نے فرمایا کہ تربتِ نبویہ کی کعبہ معظمہ پر افضلیت کی بات قاضی عیاض کے علاوہ کسی نے نہیں کہی نہ ان سے پہلے نہ بعد۔ ہم نے اس دعوے کی غلطی اوپر ذکر کی ہے کہ ان سے پہلے بھی متقدمین نے یہی بات کہی تھی اور بعد کو بھی اب تک سارے علماءِ امت کا یہی فیصلہ ہے، خواہ وہ کسی کو بھی ناپسند ہو۔

(۲) تربت و خاک یا کسی کے مبداء پیدائش کو کسی نے بھی مسجد پر فضیلت نہیں دی، نہ دے سکتا ہے، یہاں بحث صرف نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تربتِ مبارکہ کی ہے، جہاں ابن تیمیہ کے نزدیک بھی افضل الخلق کا مدفن ہے کیا افضل الخلق تمام مساجد سے بھی افضل نہ تھے، اگر تھے تو ان کے مسکنِ برزخی کے افضل البقاع بلا استثناءِ مساجد ہونے میں کیوں اشکال ہے؟

(۳) کیا عبداللہ کا بدن، ابدانِ انبیاء سے افضل ہوسکتا ہے؟ یہاں ابدانِ انسانی کی بحث کیونکر درمیان میں آگئی، یہ تو جب مناسب تھا کہ انسانوں کا باہمی تفاضل زیر بحث ہوتا، یہاں تو زمین کے کچھ حصوں کی فضیلت دوسرے حصوں پر بتائی جارہی ہے۔

(۴) علامہ نے اس موقع پر نقل کیا کہ مکہ افضل بقاع اللہ ہے۔ اور یہی قول ابوحنیفہ، شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کا ہے، اول تو یہاں علامہ نے دوسری روایت وغیرہ کا ذکر نہیں کیا، جبکہ حضرت عمرؓ کے نزدیک اور دوسری روایت امام احمد سے اور امام مالک کا مذہب بھی یہ ہے کہ مدینہ افضل ہے مکہ مکرمہ سے، دوسرے یہ کہ جو کچھ اختلاف ہے وہ علاوہ قبرِ نبوی اور کعبہ معظمہ کے ہے یعنی تفضیلِ شہرِ مکہ والے قبرِ نبوی کو اور تفضیلِ شہرِ مدینہ والے کو کعبہ معظمہ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے بقعۂ مبارکہ قبرِ نبوی کے افضل البقاع ہونے پر سب ہی متفق ہیں۔ یہ سب تفصیل یا تو علامہ کے علم میں نہیں آئی یا دانستہ اس موقع پر اس سے صرفِ نظر فرمالی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۵) نصوص سے عامۂ مساجد کی فضیلت ملتی ہے، جس سے نہ قبورِ انبیاء کو مستثنیٰ کیا گیا نہ قبورِ اولیاء کو، اگر عیاض کی بات صحیح ہوتی تو ہر نبی و ولی کا مدفن مساجد سے افضل ہوجاتا، حالانکہ یہ بیوت لوگوں کے ہیں اور وہ خدا کے گھر میں لہٰذا عیاض کا یہ قول مبتدع فی الدین کا قول ہے اور مخالفِ اسلام ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو صرف عیاض کی بات نہیں، بلکہ انہوں نے تو اس پر علماءِ امت کا اجماع و اتفاق نقل کیا ہے، تو کیا وہ سب ہی مبتدع فی الدین تھے اور مخالفِ اسلام امر کے مرتکب ہوگئے تھے۔ اور اب تک بھی سب علماءِ مذاہب اربعہ اس بات کو مانتے چلے آئے ہیں جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

رہی بات نصوص کی، تو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بدن کی بیت اللہ اور دیگر بیوت اللہ (مساجد) پر افضلیت کے لئے بھی علامہ نے کوئی نص پیش نہیں کی ہے، جبکہ وہ خود بھی آپ کو افضل الخلق مانتے اور تمام مساجد سے بھی افضل مانتے ہیں۔

بعض حضرات نے جو تربت نبویہ کو کعبۂ معظمہ پر فضیلت دی ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی تخلیق خانۂ کعبہ کی مٹی سے ہوئی تھی۔

پھر جس وقت آپ کے مدفن کا مسئلہ صحابۂ کرام میں زیر بحث تھا تو حضرت علیؓ کے ارشاد کی رہنمائی میں سب نے ہی حجرۂ سیدنا عائشہؓ میں آپ کی قبر مبارک کی جگہ کوز مین کے سب حصوں سے افضل مان لیا تھا، جس کوارشادالساوی ص ۳۵۳ میں بھی اتفاق فعلی اور اجماع سکوتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ حضور علیہ السلام کو حطیم کعبہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح دفن کیا جاتا، مگر تمام صحابہ کے ذہنوں میں افضل البقاع صرف وہی جگہ تھی جہاں سب نے دفن کرنا پسند کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کے علاوہ تفضیل قبر نبوی کی وجہ مجاورتِ جسم مبارک نبوی بھی کہی گئی ہے،) قالہ الزرکشی۔ وفاص ۱/ ۲۰ اور بعض اکابر امت نے اس کی وجہ حضور علیہ السلام کا شرف قدر اور مکرم عنداللہ ہونا بھی لکھی ہے (شرح الشفاءص ۲/ ۱۶۲)۔

علامہ ابن تیمیہ کی عادت ہے کہ وہ کسی ایک وجہ کو سامنے لاکر اعتراضات کر دیا کرتے ہیں اور دوسری وجوہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آخران ہی کے نہایت ممدوح ومعتمد ابن عقیل حنبلی نے تربتِ نبویہ کو عرش سے افضل کیسے مان لیا تھا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ عرش کو مستقرِ خداوندی بھی نہیں مانتے تھے جبکہ ابن تیمیہ اس کے بھی قائل ہوئے ہیں۔

(نوٹ) ہم نے جو تنقیح صرف ایک مسئلہ پر کی ہے۔ یہ بطور مثال ہے، کیونکہ اسی قسم کے دلائل عقلی ونقلی علامہ نے اپنے ہر تفرد کے لئے اختیار کئے ہیں۔

یہ بات بھی پہلے آچکی ہے کہ کسی جگہ میں شرف وفضل اس کے اندر ذکر اللہ یا عبادت وغیرہ سے آتا ہے اور اسی لئے مساجد اور بیت اللہ کا بھی شرف ہے، نہ اس لئے کہ وہ خدا کے گھر ہیں، دوسرے یہ کہ تمام مساجد وبیت اللہ بھی حق تعالیٰ کی تجلی گاہیں ہیں، جہاں اس کی رحمتوں اور برکتوں اور انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے، اسی لحاظ سے دنیا میں بیت اللہ کا درجہ دوسری مساجد سے زیادہ بھی ہے، مگر بقعۂ قبرِ نبوی کا مرتبہ اس لحاظ سے بھی سب سے بڑھا ہوا ہے، کیونکہ وہ علاوہ مسکنِ افضل الخلق ہونے کے اذکار، اوراد، انوار وتجلیاتِ الٰہی کا بھی سب سے اعلیٰ وارفع مقام ہے کہ کعبۂ معظمہ اور عرش الٰہی کا مقام بھی اس کے برابر نہیں ہے، البتہ جو لوگ عرش الٰہی کو خدا کا مستقر ومکان جانتے ہیں یا بیت اللہ کا خدا کا واقعی گھر، تو انہیں ضرور اس حقیقت کے ماننے میں تردد ہوسکتا ہے۔

ہر موقع پر نصوص کا مطالبہ اور اجماعِ امت کا انکار کیا مناسب ہے، کیا جتنی باتیں علامہ ابن تیمیہ کی ممدوح کتابوں میں مثلاً محدث ابن خزیمہ کی کتاب التوحید، شیخ عبداللہ بن الامام احمدؒ کی کتاب السنہ۔ دارمی سنجری کی کتاب النقض اور خودان کی کتاب التاسیس وکتاب العرش میں حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں درج کی گئی ہیں، وہ سب منصوص ہیں؟؟ انصاف ووسعتِ نظر کے ساتھ علامہ کوثری کے انتقادات جو مقالات کوثری اور تعلقات کتاب الاسماء والصفات بیہقیؒ میں شائع شدہ ہیں مطالعہ کئے جائیں۔

علامہ ابن القیم اپنے عقیدۂ نونیہ میں عرش کو خدا کی ذات سے خالی ماننے والوں پر سخت نکیر کرتے ہیں اور اپنی کتاب بدائع الفوائد ص ۳/ ۳۹ میں دار قطنی کے یہ اشعار بھی پسند کر کے نقل کرتے ہیں کہ حدیث میں حضور علیہ السلام کو حق تعالیٰ کا عرش پر بٹھانا وارد ہوا ہے۔ لہٰذا اس سے انکار مت کرو۔ اور حدیث کو اپنے ظاہر پر رکھو، اور نہ اس سے انکار کرو کہ خدا خود عرش پر بیٹھا ہے اور نہ اس سے انکار کرو کہ وہ حضور علیہ السلام کو اپنے عرش پر بٹھائے گا۔

علامہ نے یہ بھی لکھا کہ اس قول کے قائلین نے امام التفسیر مجاہد کے تباع میں یہ بات کہی ہے۔ ص ۱۴۰ السیف الصقیل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے ساتھ حضور علیہ السلام کو عرش پر بٹھانے کا قول مجاہد سے بہ طرق ضعیفہ مروی ہے، جبکہ مقام محمود کی تفسیر شفاعت کے ساتھ تواترِ معنوی سے ثابت ہے اور بہت سے آئمہ حدیث نے اس قول مجاہد کو باطل قرار دیا ہے الخ۔

روح المعانی ص ۱۵/ ۱۴۲ میں بھی اثرِ مذکورہ، مجاہد پر مفسر واحدی کا تعقب نقل کیا ہے، تفسیر ابن کثیر ص ۳/ ۵۴ میں مجاہد کا اثرِ مذکور ذکر بھی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اثرِ مجاہد یہ ذکر کیا کہ مقام محمود سے مراد مقام شفاعت ہے۔

افسوس ہے کہ ان حضرات نے جمہور سلف وخلف کے خلاف اپنے الگ الگ مزعومات بنائے اور نہایت ضعیف ومنکر احادیث وآثار سے استدلال کیا۔ضرورت ہے کہ اس دور کے اکابر علماءِ امت مکمل مطالعہ اور چھان بین کے بعد خالص دین قیم کے لئے رہنمائی کریں اور زوائد کواو لے بالحذف قرار دیں۔واللہ الموفق۔

''عقیدۂ توحید کی تجدید''

ہم نے طوالت سے احتراز کرتے ہوئے بطور مثال چند اختلافی نظریات کی طرف نشاندہی کی ہے ان کو سامنے رکھ کر خدا کے لئے انصاف سے فیصلہ کریں کہ کیا عقیدۂ توحید کی تجدید کا یہی راستہ تھا جو متقدمین ومتاخرین،اور سلف وخلف سب سے الگ،سب سے مختلف اور ان کے نظریات کی ضد پر قائم کیا گیا'' کیا'' ما انا علیه و اصحابی '' کا اطلاق دو الگ راستوں پر بھی ممکن ہے؟'' بینوا توجروا''

عقیدۂ توحید کی تجدید صرف قبر پرستی کی بیخ کنی ومخالفت میں منحصر نہیں ہے، یہ بھی ضرور بہت اہم وضروری خدمت دین ہے،جس کی تائید ہم بھی کرتے ہیں،مگر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہر تعظیم شرک نہیں ہوسکتی،اس میں سلف کا اتباع کرنا ہوگا۔اور مثبت انداز میں خدائے برتر کی ذات وصفات کے بارے میں بھی صرف سلف کے عقیدہ کو اپنانا ہوگا۔

خدا کے لئے جہت وجسم کا ادعا،اس کے ساتھ حوادث لا اول لہا اور قیامِ حوادث بذاتہ تعالیٰ کا عقیدہ استقرار ذاتِ باری علی العرش، اقعادِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم علی العرش مع اللہ تعالیٰ شانہ۔

حاملین عرش فرشتوں پر رحمان کا اول دن میں بہت بھاری ہونا جبکہ مشرکین شرک کرتے ہیں اور جب تسبیح کرنے والے عبادت کرتے ہیں تو ان کا بوجھ ہلکا ہوجانا،(کتاب السنہ کعبداللہ بن ''الامام احمد ص ۱۴۳)۔

اللہ تعالیٰ ہر مخلوق سے بڑا ہے کہ اس کو عرش بھی اپنی عظمت وقوت کے باوجود نہیں اٹھا سکتا،نہ حاملین عرش اپنی قوت کے بل پر اٹھا سکتے ہیں،البتہ خدا کی قدرت سے وہ اٹھاتے ہیں اور وہ بالکل عاجز تھے تا آنکہ ان کو لاحول ولا قوۃ الا باللہ کی تلقین کی گئی تو پھر وہ خدا کی قدرت وارادہ کے تحت اٹھانے کے قابل ہوگئے،ورنہ نہ وہ اٹھا سکتے تھے نہ سموات و ارض نہ وہ سب جو ان میں ساکن ہیں۔اور اللہ وہ ہے کہ وہ چاہے تو ایک مچھر کی پشت پر بھی استقراء کرسکتا ہے۔

پھر عرش عظیم کا تو کہنا ہی کیا ہے کہ وہ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں سے بھی زیادہ بڑا ہے۔(التاسیس فی رد اساس التقدیس، لابن تیمیہ''غیر مطبوعہ موجود خزانہ ظاہریہ دمشق)۔

اور ایسے ہی دوسرے عقائد جو سلف سے ثابت نہیں،اور ان کی تردید علامہ ابن الجوزی حنبلی،علامہ تقی سبکی،علامہ تقی حصنی،علامہ ذہبی، حافظ ابن حجر عسقلانی،حضرت شاہ عبدالعزیز،حضرت شاہ عبدالغنی،حضرت علامہ عبدالحیٔ لکھنوی،علامہ کوثری،حضرت علامہ کشمیری،حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی،حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ ودیگر اکابر نے کردی ہے،ان کے باوجود عقیدۂ توحید کی تجدید کا غیر معمولی فضل وامتیاز کسی کے لئے ثابت کرنا،بہت بڑی غلطی ہے یا محض متاعِ قلیل کی خاطر کتمانِ حق کی صورت ہے۔

اگر ان عقائد کی تغلیط یا ان سے برأت کی جائے تو چشم ما روشن،دل ما شاد۔ہم صرف اتنی بات ضرور کہیں گے کہ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ تجسیم کا اجتماع،اجتماعِ ضدین ہے۔

سفرِ زیارۃ نبویہ کے اسباب ووجوہ

(۱) مساجدِ ثلاثہ کی طرح فضیلتِ قبر نبوی (انوار المحمود) اس کی پوری تفصیل اوپر ہوچکی ہے نیز ملاحظہ ہو فضائل حج حضرت شیخ

الحدیث ص۱۴۴وص ۱۷۱/۱۷۰‘‘(۲)بوجہ حسانات کثیرہ عظیمہ نبویہ، وقال اللہ تعالیٰ ہل جزاء الاحسان الا الاحسان (۳)حضورعلیہ السلام نے بہ کثرت احادیث میں خود بھی زیارت کی ترغیب دی ہے۔

زیارۃ نبویہ کی فضیلت میں بہ کثرت احادیث مروی ہیں، جن کی تفصیل اوررجال ورواۃ کی توثیق پر بھی محدثین نے مفصل کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہوعلامہ تقی سبکی کی شفاء السقام وغیرہ، ان احادیث میں وہ بھی ہیں جن میں صرف زیارۃ نبویہ کی نیت سے سفرکرنے کی ترغیب ہے۔لہٰذا یہ بات بھی مرجوح ہوجاتی ہے کہ اگر مدینہ منورہ کا سفرکرے تو صرف مسجد نبوی کا ارادہ کرے۔ پھر وہاں پہنچ کرحضور کی زیارت بھی کرے جیسا کہ ابن تیمیہ وابن القیم کہتے ہیں۔حافظ ابن حجر صاحب فتح الباری شرح البخاری اور دوسرے کبارمحدثین نے فرمایا کہ اگر چہ فضیلت زیارۃ نبویہ کی احادیث میں ضعف بھی ہے، مگروہ بہ کثرت روایات کے سبب سے ختم ہوگیا ہے، اوران سب احادیث کوقوت حاصل ہوگئی ہے۔

علامہ ابن تیمیہ وابن القیم

یہ بات بھی بڑی عجیب ہے کہ ان دونوں حضرات نے احادیث زیارۃ نبویہ کو درجۂ اعتبار سے ساقط کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے، جبکہ ان دونوں کواحادیث پرحکم لگانے میں محدثین نے متشدد ومتعنت قرار دیا ہے، اوراس بارے میں ایک جگہ ثبوت دیکھنا ہوتو موضوعات کبیر ملاعلی قاری کا مطالعہ کرنا چاہئے جس میں علامہ قاری نے احادیث موضوعہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے اور پھر علامہ ابن القیم سے نقل شدہ ۴۹فصل ذکر کیں، جن میں بہت بڑی تعداد کوعلامہ نے موضوع، باطل یا فتح الموضوعات تک کہا ہے اوراس بارے میں اپنے شیخ علامہ ابن تیمیہ کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن علامہ قاری نے ان میں سے ۴۷احادیث کے بارے میں علامہ ابن القیم کی تغلیط کی ہے اور فرمایا کہ ان کوضعیف تو کہا جاسکتا ہے، مگر موضوع نہ باطل نہیں قرار دے سکتے۔

بطور مثال عرض ہے کہ علامہ ابن القیم نے لکھا کہ ابدال واقطاب واغواث ونقباء ونجباء واوتاد کے بارے میں جتنی بھی احادیث روایت کی گئی ہیں۔وہ سب باطل ہیں۔بجز ایک حدیث کے جس کوامام احمد نے ذکر کیا ہے مگر وہ صحیح نہیں کیونکہ وہ منقطع ہے۔

اس پر علامہ قاریؒ نے لکھا کہ ان کے بارے میں صحیح احادیث وآثار مرفوعہ وموقوفہ صحابۂ کرام وتابعین عظام سے مروی ہیں۔جن کو علامہ سیوطیؒ نے مستقل رسالہ میں جمع کردیا ہے، جس کا نام ہے’’الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال‘‘۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی شدید تنقید بھی ہم نے دوسری جگہ فتاویٰ عزیزی سے نقل کی ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے جو ابدال وقطب کا انکار کیا ہے اور زیارت نبویہ وغیرہ کا اس کے سبب ہمیں ان سے سخت اختلاف ہے۔

(۴)علماءِامت نے مالداروں پرزیارت نبویہ کوواجب قراردیا ہے(۵)حضور علیہ السلام کی خدمت بابرکت میں ہدیہ سلام پیش کرنا، جس کا التزام ہمیشہ ساری امت نے کیا ہے۔اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا معمول تھا کہ قاصدوں کے ذریعہ سلام کا تحفہ پیش کرتے تھے اور دوسرے ملوک وامراءِاسلام کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔(۶)استغفار واستشفاع کے لئے کہ یہ بھی اولیائے امت کا طریقہ رہا ہے۔رہا یہ کہ علامہ ابن تیمیہ نے کہا کہ حضور علیہ السلام کی جناب میں پہنچ کرصرف سلام عرض کرے، اور وہاں دعا بھی نہ کرے، اور نہ دعا کسی سے ثابت ہے تو یہ بھی غلط ہے جس طرح یہ دعوے کہ ساری دنیا سے لوگ صرف مسجد نبوی کے ارادہ سے سفرکرتے تھے، قبرنبوی کی زیارت کے لئے نہیں، پھر جبکہ حدیث مسلم شریف میں عام زیارۃ قبور کے وقت نسئل اللہ لنا ولکم العافیہ وارد ہے تو اپنے لئے عافیت طلب کرنا حضورعلیہ السلام کی زیارت کے وقت بھی بدرجۂ اولیٰ جائز بلکہ مامور ہوا۔اور طلب عافیت سے بڑی دعا کیا ہوسکتی ہے؟ اور حضرت شیخ محدث دہلویؒ کی جذب القلوب ص۱۶۵میں حدیث نسائی کے الفاظ اللھم لا تحرمنا اجرھم ولاتفتنا بعدھم ہیں کیا یہ بھی دعا نہیں ہے؟ نیز سارے اکابر امت

نے دعا عند القبر النبوی اور طلب شفاعت کی ہدایت کی ہے، حتیٰ کہ ممدوح ومعتمد ابن تیمیہ ابن عقیل حنبلیؒ نے بھی طویل دعا لکھی ہے اوران سے اس نعمت پر شکر بھی مروی ہے کہ حق تعالیٰ نے اس مشہدِ مقدس پر حاضری کی توفیق دی۔ پھر بھی یہ دعویٰ کہ قبرِ نبوی کے پاس دعا نہیں ہے۔

(۷) ردِ جفاو بے مروتی کے لئے کہ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جو میری زیارت کو نہ آیا۔اس نے میرے ساتھ بے مروتی کا معاملہ کیا۔

(۸) قبرِ مبارک پر حاضری مشہدِ مقدس پر حاضری ہے، جس کی طرف لیشهـد و امنـافـع لهـم میں اشارہ ہے کہ اپنے منافع کی جگہوں پر حاضر ہوں، اوردینی منافع جس طرح مکہ معظمہ منیٰ وعرفات میں حاصل ہوتے ہیں۔ تربتِ نبویہ مقدسہ پر حاضری سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ جس کے لئے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی ترغیب دی ہے اور آپ نے جو چار شعائر اللہ کا ذکر حجۃ اللہ میں کیا ہے، ان میں بھی ایک نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے، جن کی تعظیم رکن اسلام ہے۔ (۹) روحِ مبارک نبوی سے اخذِ فیوض کے لئے ،جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے اکابر امت نے فیوضِ روحانی حاصل کئے ہیں ملاحظہ ہو فیوض الحرمین وغیرہ۔

(۱۰) قبرِ مبارک نبوی محلِ اجابت دعا ہے۔ علماء امت نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور اس جگہ دعاؤں کے لئے ترغیب دی ہے۔ ملاحظہ ہوں کتبِ حج وزیارت۔

(۱۱) قلبِ مبارک نبوی، قلوبِ مومنین کے لئے مرکزِ ایمان ہے جس کو الابریز للشیخ الدباغ اور آبِ حیات للشیخ النانوتویؒ میں دیکھا جائے۔

(۱۲) توسل کے لئے کہ توسل بجاہ الانبیاء والاولیاء کو صاحب روح المعانی اور صاحبِ تقویۃ الایمان نے بھی تسلیم کیا ہے۔

علامہ آلوسی نے کئی مسائل میں ابن تیمیہ کا قول اختیار کیا ہے یا ان کی تفسیر میں وہ باتیں حذف والحاج کے طور سے درج ہوگئی ہیں، اور تقویۃ الایمان پر بھی سلفی حضرات بھروسہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا حوالہ دیا گیا۔

تاریخ دعوت وعزیمت ص ۲/۲۲۳ میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اکثر ائمہ وعلماء نے توسل کے مسئلہ میں ابن تیمیہ سے اختلاف کیا ہے۔

(۱۳) سفرِ زیارۃ نبویہ کے جواز پر اجماعِ امت علامہ سبکی وغیرہ سے معارف السنن للعلامۃ المحدث البنوریؒ ص ۳/۳۲۹ میں ہے۔

(۱۴) افضلیتِ موضعِ قبرِ نبوی بوجہ مجاورت نبی اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کہ آپ افضل الخلق ہیں حتیٰ کہ کعبہ وعرش سے افضل ہیں۔ آپ کے فضائل میں ایک نہایت اہم کتاب ''فتح العلیم بحل اشکال التشبیہ المعظم'' مکتبہ امدادیہ ملتان (پاکستان) سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں محترم مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی استاذِ جامعہ اشرفیہ لاہور نے ۴۲۱ صفحات میں بہترین معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ ۲۴۳ ابواب قائم کئے ہیں۔ اور ہر باب میں حضور علیہ السلام کی فضیلت کو الگ الگ نوعیت سے مدلل ومکمل کیا ہے۔ البتہ ص ۵۸ پر جو وجہ نمبر ۳۷ میں علامہ ابن القیم سے آپ کی فضیلت میں حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ آپ کو عرش پر بٹھانے کی بات نقل کی گئی ہے، وہ حدیثِ قوی سے ثابت نہیں ہے اس لئے ہمارے نزدیک وہ نظر ثانی کی محتاج ہے۔

(۱۵) قبرِ مبارک نبوی کے تجلّی گاہِ اعظم ومہبطِ انوار وبرکات لامحدود ہونے کی وجہ سے۔

(۱۶) حضور علیہ السلام کا تا قیامت مسکن ہونے کے مشرف کی وجہ سے، یعنی جب مولد النبی مکہ معظمہ اور دارِ خدیجہ چند سال حضور علیہ السلام کا مسکن رہنے کے سبب مسجدِ حرام کے بعد افضل اماکن مکہ معظمہ ٹھہرے تو قبرِ مبارک کی زیارت اور اس کے قرب میں دعا کیوں نہ افضل و اعلیٰ واقرب الی الاجابہ ہوگی۔

(۱۷) ساری دنیا کے کروڑوں اربوں مومنین واولیائے مقربین کی صلوات طیبات وتسلیماتِ مبارکہ کا مورد ہونے کی وجہ سے۔

(۱۸) سیدنا حضرت عمر وسیدنا حضرت عائشہ اور امام مالکؒ سے جس مرقدِ مبارک کی تعظیم۔ ادب واحترام اور غیر معمولی تعلق ومحبت نقل کیا گیا ہے، اور جبکہ حضرت عمرؓ نے خاص طور سے ملکِ شام سے مدینہ منورہ کے سفر اور زیارۃ نبویہ کے لئے ترغیب دی ہے تو اس کے لئے

ہر مومن ومحب رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا سفر کیوں نہ ضروری ہوگا۔

(۱۹) سارے اکابر علماءِ امت نے صلوٰۃ وسلام پڑھنے کے وقت استقبالِ قبر نبوی کی ہدایت کی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت استقبالِ کعبہ معظمہ سے استقبالِ قبرِ معظم افضل ہے۔ جبکہ کسی بھی دوسری جگہ پر ایسا نہیں، اس سے بھی زیارۃ نبویہ کی نہایت عظمت واہمیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور چونکہ یہ بات بھی علامہ ابن تیمیہ کی افتادِ طبع کے خلاف تھی اس لئے انہوں نے ایک غلط روایت سے فائدہ اٹھانے کی سعی کی ہے جو امام اعظمؒ کی طرف منسوب ہوگئی ہے۔

(۲۰) جس طرح مساجد انبیاء علیہم السلام (مسجد حرام، مسجد نبوی ومسجد اقصیٰ) کی فضیلت بوجہ فضیلت انبیاء وارد ہے اسی طرح شہر مدینہ طیبہ کے جتنے فضائل وارد ہوئے ہیں وہ سب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قبرِ مبارک میں موجود ہونے کی وجہ سے ہیں، للہٰذا اسی کی نیت سے سفر کرنا اور آپ کی جناب میں حاضر ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنا اور اپنی حاجات کے لئے دعائیں کرنا افضل المستحبات ہے اور اس سے انحراف یا انکار، بہت بڑی محرومی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

اوجز المسالک جلد اول ص ۳۶۶/۳۶۴ میں پندرہ احادیث بابت فضیلت زیارۃ نبویہ مع اسناد وکلام فی الرجال لائق مطالعہ ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ان احادیث کو باطل یا موضوع قرار دینا کسی طرح قابلِ اعتنا نہیں ہے۔

حاصلِ مطالعہ: اب تک کا یہ ہے کہ عقائدِ حقہ کے بارے میں مذاہب اربعہ باہم کا صرۃ واحدۃ ہیں۔ اور عقائد واصول میں چاروں میں کوئی بھی اختلاف نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ فروعی مسائل میں ہے۔ البتہ چند متاخرین حنابلہ نے امام احمدؒ کے جادۂ مستقیمہ سے انحراف کر کے اختلاف کی بنیاد ڈالی تھی، ان کا مکمل رد بھی علامہ جلیل ومحدث نبیل ابن الجوزی حنبلی م ۵۹۷ھ نے کر دیا تھا، مگر پھر علامہ ابن تیمیہ آئے تو وہ بھی متاخرین حنابلہ کے راستہ پر چلے اور بکثرت مسائل اصول وفروع میں ائمہ اربعہ سے الگ مسلک اختیار کیا۔

چونکہ ان کے تمام افکار ونظریات مدتوں تک زاویۂ خمول میں پڑے رہے، اس لئے بہت سے علماء تو ان سے مطلع بھی نہ ہو سکے جیسے علامہ عینی حنفی وغیرہ۔ البتہ حافظ ابن حجر شافعی وغیرہ بہت سے پر مطلع ہو چکے تھے اسی لئے فتح الباری اور دوسری تصانیف میں بھی رد کیے گئے ہیں۔ تا آنکہ ہمارا قریبی دور آیا تو علامہ شوکانی نے بھی توسل وغیرہ مسائل میں ابن تیمیہ کے خلاف لکھا۔

ہمارے اکابر میں سے حضرت شاہ ولی اللہ کا مطالعہ بھی بقول علامہ کوثری کے کتب متقدمین کا کم تھا، اور علامہ ابن تیمیہ سے کچھ متاثر بھی زیادہ ہوگئے تھے، اس لئے مداح رہے۔ اور غالباً ان کے تفردات سے پوری طرح واقف بھی نہ ہو سکے تھے، ہمارے نزدیک کچھ ایسا ہی حال شیخ محمد بن عبدالوہاب کا بھی رہا ہے، کہ رد بدعت ورسوم شرک کے باب میں انہوں نے ابن تیمیہ کے تشدد کو اپنے مزاج کے موافق پایا، اس لئے ان سے مناسبت ہوگئی ورنہ ہمیں اب تک ان کے اصولی تفردات میں ہمنوائی اور امام احمدؒ کی مخالفت نہیں مل سکی ہے۔ اور خیال یہی ہے کہ وہ امام احمد کے اصول وفروع میں پورے مقلد ومتبع تھے، اور اگر وہ اسلاف دیوبند کے عقائد ونظریات سے واقف ہو سکتے تو ان سے ہی زیادہ قریب ہوتے کیونکہ ہم نے انوار الباری میں پہلے بھی لکھا ہے کہ ردِ بدعت ومخالفتِ رسوم شرک میں حنابلہ، حنفیہ سے زیادہ قریب ہیں، بہ نسبت شافعیہ ومالکیہ کے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصہ سے حنفیہ میں سے ایک گروہ رضاخانی نے بدعات ورسوم کو اپنانے کے باوجود فقہ حنفی کو اپنا مسلک بنا لیا ہے۔ اور ناواقف یا متعصب غیر مقلدین، ہم دیوبندی المسلک لوگوں کو بھی ''قبوری'' کہہ دیتے ہیں یا بریلوی رضاخانی متعصب لوگ ہمیں ''وہابی'' کہتے ہیں۔

۳۷ھ میں جب راقم الحروف نے محترم مولانا بنوریؒ کے ساتھ حرمین ومصر وترکی کا سفر کیا تھا، تو مصر آتے جاتے دونوں حج کے زمانہ میں کئی ماہ مکہ معظمہ میں بھی قیام رہا تھا۔ اور اس وقت کے رئیس ہیئۃ الامر بالمعروف والنہی عن المنکر علامہ شیخ سلیمان الصنیع سے بہ کثرت ملاقاتیں رہیں اور تبادلۂ خیالات ہوتا رہا، وہ اعتراف کرتے تھے کہ اکابر دیوبند کا مسلک نہایت معتدل ہے اور کہتے تھے کہ جب یہاں کے

نجدی علماء وسعتِ خیال کے ساتھ آپ لوگوں کے علوم ونظریات کا مطالعہ کریں گے تو وہ آپ لوگوں سے بہت قریب ہو جائیں گے۔

اس کے بعد احقر کا سفرِ حرمین تو کم ہی ہوا۔ مولانا بنوری برابر آتے جاتے رہے اور علماءِ نجد وحجاز سے ملاقاتیں اور علمی مذاکرات کرتے رہے۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ بہت سے مسائل میں وہ مائل بہ اعتدال ہو گئے ہیں اور اختلافی خلیج بڑی حد تک ختم ہو سکتی ہے۔

احقر نے بھی اسی قسم کا اندازہ اپنے حالیہ کئی اسفارِ حرمین شریفین میں وہاں کے علماء سے مل کر کیا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ کے بارے میں بھی وہ پہلا جیسا اعتقاد واعتماد نہیں رہا ہے، جس کا ثبوت طلقاتِ ثلاث کے مسئلہ میں علامہ کے خلاف علماء نجد کے فیصلہ سے واضح ہے۔

احقر نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے رسائل توحید کا بھی کئی بار غور سے مطالعہ کیا ہے، ان میں ''فوق عرش'' والی حدیث بھی ذکر کی گئی ہے، جس کے بارے میں حاشیہ کتاب الاسماء والصفات بیہقی ص ۴۳۰ میں ہے کہ یہ لفظ کسی مشہور حدیث میں وارد نہیں ہوا ہے۔ اور حدیث اصابع والی پر بھی کتاب مذکور ص ۳۳۳ تا ص ۳۴۱ میں امام بیہقی نے مفصل کلام کیا ہے اور محدثِ شہیر علامہ خطابی کی رائے پیش کی ہے کہ ایسی احادیث کو ظاہر پر محمول کرنے سے بہتر یہ ہے کہ توقف کیا جائے، کیونکہ ان کا ظاہر اصول متفق علیہا کے خلاف ہے۔ لہٰذا نفی تشبیہ کے ساتھ اصول الدین کے مطابق تاویل کی جائے گی۔

ایسے ہی شیخ نے علامہ ابن تیمیہ کے اتباع میں یا ان پر اعتماد کر کے حدیث ثمانیہ اوعال اور حدیثِ اطیط بھی باب عقائد میں پیش کی ہے، ان دونوں پر اکابر محدثین نے نقدِ شدید کر کے ان کو ضعیف بلکہ منکر وشاذ قرار دے دیا ہے، لہٰذا ایسی احادیث کا فضائل میں بھی اعتبار نہیں ہوتا، نہ احکام میں، اور بابِ عقائد کے لئے تو حدیثِ مشہور ومتواتر صحیح وقوی ہی کی ضرورت ہے۔ کما لا یخفیٰ علی اہل العلم بالحدیث والاصول۔

علامہ ابن القیم نے بھی حدیثِ اقعاد النبی علی العرش اور حدیث طواف اللہ تعالیٰ فی الارض وغیرہ پر اعتماد کر لیا تھا، جبکہ ایسی ضعیف احادیث صرف فضائلِ اعمال تک ہی کارآمد ہیں۔

ایسی ہی فروگذاشت ہمارے اکابر میں سے حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ سے بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے بھی تقویۃ الایمان میں اطیط عرش لاجل الرب تعالیٰ والی حدیث نقل کر دی ہے، جبکہ وہ نہایت ضعیف، شاذ ومنکر ہے اور اس کو باب العقائد میں پیش کرنا درست نہ تھا۔

اگر ایسے چند اختلافی امور باہمی تبادلۂ خیالات سے طے کر لئے جائیں، جو اکابر محدثین کی ابحاث وتحقیقات کی روشنی میں بہت سہولت سے حل ہو سکتے ہیں، اسی طرح بطور اصولِ مسلمہ اکابرِ علماءِ نجد وحجاز یہ امر بھی تسلیم کر لیں کہ جن مسائل اصول وفروع میں علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے امام احمد کے خلاف فیصلے کئے ہیں، وہ سب نہ صرف یہ کہ ان کے لئے ضروری التسلیم نہ ہوں گے، بلکہ ان میں امام احمدؒ ہی کے کسی قول کے موافق فیصلوں کو ترجیح ہو گی، اور حکومت کی طرف سے بھی اعلان کر دیا جائے کہ حجاز ونجد میں قوانین اسلام فقہ امام احمدؒ کے مطابق جاری ہوں گے۔ تو اس صورتحال سے ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ ساری دنیائے اسلام کے مسلمان نہایت مطمئن ہو جائیں گے اور جمع کلمہ کی یہی صورت بہتر ہے۔ واللہ المیسر والموفق لکل خیر۔

واضح ہو کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے سترہ مسائل میں چاروں اماموں کی مخالفت کی ہے اور انتالیس مسائل میں جمہور واجماع امت کا خلاف کیا ہے۔ لہٰذا تاریخِ دعوت وعزیمت ص ۱۱۲/۲ میں یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ یہ مسائل جن میں علامہ ابن تیمیہ نے مجموعی طور پر ائمہ اربعہ سے اختلاف کیا ہے، وہ دو چار سے زیادہ نہیں۔

ابواب الکسوف

(۲۴۔ احادیث ۹۸۰ تا ۱۰۰۳) ص ۱۴۵/۱۴۱ بخاری

امام بخاریؒ نے حضورِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نمازِ کسوف کے متعدد ومتنوع احوال کو ۱۹ باب قائم کر کے ۲۴ حدیثوں میں بیان فرمایا

ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی زندگی میں صرف ایک بار سورج گرہن ہوا تھا، جو حسبِ تحقیق مشہور ماہر ریاضی محمود شاہ فرنساوی ۹ھ میں ساڑھے آٹھ گھنٹے تک رہا تھا۔

چونکہ یہ نماز حضور علیہ السلام نے سب نمازوں سے زیادہ طویل پڑھائی تھی، اور سورج کے گہن سے نکلنے تک پڑھاتے رہے تھے، اس لئے صحابۂ کرام نے طویل قیام، اور بہت لمبے رکوع وسجدوں کی کیفیت بھی بیان کی ہے، اور سب سے زیادہ قوی وصحیح روایت دو رکوع ایک رکعت میں ہونے کی وارد ہے، اور اسی لئے دوسرے ائمہ شافعی وحنبلی وغیرہ ۲ رکوع ہی کے قائل ہوئے ہیں، امام ابوحنیفہؒ اس نماز میں بھی ایک ہی رکوع ایک رکعت میں بتاتے ہیں اور حدیثِ قوی سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے نماز کسوف کے بعد آئندہ کے لئے اس کو نمازِ فجر کی طرح پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اور حضور علیہ السلام کے ایک رکعت میں کئی رکوع کرنے کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ وہ تعدد بہ سبب مشاہدہ آیاتِ الٰہیہ تھا، جو وقتی وعارضی چیز تھی۔مثلاً آپ نے اسی نماز میں دوزخ وجنت کا مشاہدہ بھی کیا جو آپ کے سامنے دیوارِ قبلہ میں متمثل کردی گئیں تھیں۔اور اسی لئے آپ بحالت قیام کچھ آگے بھی بڑھے اور پیچھے کو بھی ہٹے۔اور آیاتِ الٰہیہ کے مشاہدہ کے وقت رکوع یا سجدہ کرنا مشروع بھی ہے۔اس طرح یہ چیز گویا نماز سے الگ یا زائد ہوجاتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ۳۔۴ رکوع والی روایات صحیحہ ثابتہ کو گرادینا بھی صحیح نہیں ہے، جو علامہ ابن تیمیہ[۱] نے کیا کہ نمازِ کسوف پر مستقل رسالہ لکھا، جس میں بجز دو رکوع والی روایت کے سب کو صحت کے درجہ سے گرادیا۔حالانکہ ان کی اسانید بھی قوی ہیں۔

نمازِ خسوف وکسوف کی حکمت

علامہ سیوطیؒ نے فرمایا کہ دنیا کے بہت سے لوگ کواکب ونجوم کی پرستش کرتے ہیں، اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے سورج وچاند دو بڑے اور عظیم نورانی اجسام پر کسوف وخسوف طاری کرنے کا فیصلہ فرمایا تا کہ اپنی قدرت قاہرہ دکھا کر ان اقوام کی غلطی ظاہر کریں جو ان کو خدا مانتے ہیں اور بتلائیں کہ ان دونوں جیسے اور ان سے بھی بہت بڑے بڑے سیارے اور ستارے اور افلاک وعرش وکرسی کا خالق ومالک ہی عبادت کا مستحق ہے۔اور ان دونوں کا انتخاب اس لئے فرمایا کہ سورج کی گرمی سے تو سارے پھل، اناج وغیرہ انسانوں کی ضرورت کی چیزیں تیار ہوتی ہیں اور چاند سے ان چیزوں کے رنگ وروپ بنتے ہیں، الخ (اوجز المسالک ص ۲/۲۷۴)۔

---

[۱] **علامہ ابن تیمیہ واعلال الروایات الصحیحہ**: افسوس کہ علامہ موصوف کی یہ عادتِ مستمرہ اکثر مواضع میں کارفرما رہی ہے کہ وہ اپنے منفرد مسلک کے خلاف صحیح الاسناد روایات کو گرادیتے ہیں۔مثلاً صلوٰۃ الضحیٰ کی احادیث بہ سندِ صحیح ثابت ہیں، اور امام بخاری کے تلمیذِ حدیث امام ترمذی نے بھی مستقل باب اس پر قائم کیا۔اور کبار محدثین نے اس نماز کی احادیث کو ثابت وصحیح مانا ہے، چونکہ علامہ ابن تیمیہ اس نماز کی سنیت ومشروعیت سے منکر ہیں اس لئے ان روایات کو بھی گراتے ہیں (ملاحظہ ہو معارف السنن ص ۴/۱۷۲ وغیرہ)۔

اسی طرح امام ترمذی نے باب ماجاء فی صلوٰۃ التسبیح قائم کیا اور جو حدیث وہ لائے ہیں اس میں اور دوسری احادیثِ صلوٰۃ التسبیح کے بارے میں کبار محدثین کے مختلف اقوال ہیں، محدث ابن خزیمہ (جن کی حدیث پر ابن تیمیہ بہت اعتماد کیا کرتے ہیں) بلکہ عقائد تک میں ان پر کامل بھروسہ کیا ہے حالانکہ وہ علمِ اصول وعقائد میں نہایت کمزور تھے) اور حاکم وغیرہ ان کو صحیح مانتے ہیں، ابن المدینی، شیخ البخاری) اور امام مسلم، محدث منذری، تقی سبکی وغیرہ درجۂ حسن میں بتلاتے ہیں، امام احمد وغیرہ ضعیف قرار دیتے ہیں، علامہ ذہبی وغیرہ نے توقف کیا، لیکن علامہ ابن تیمیہ وغیرہ بعض حنابلہ...... نے موضوع کہا ہے گویا یہ لوگ امام احمد کی تضعیف سے متاثر ہوگئے، اور مزید تشدد حسبِ عادت اختیار کر کے موضوع تک کہہ دیا، حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ شاید امام احمدؒ کو پہلے صرف عمرو بن مالک والی سند کی حدیث پہنچی تھی اور مستمر بن الریان والی روایت نہ ملی ہوگی، حالانکہ وہ شیخ ثقہ ہیں۔اسی لئے جب ان کو یہ روایت پہنچی ہوگی تو اپنی تضعیف سے رجوع کرلیا ہوگا۔(معارف ص ۴/۲۸۴) مگر حیرت ہے کہ علامہ ابن تیمیہ اتنی صدیوں کے بعد بھی اپنی متشددانہ رائے پر ہی قائم رہے۔اور صلوٰۃ التسبیح کی سخت مخالفت کی ہے۔اور یہی تشدد روایات زیارۃ نبویہ وغیرہ کے بارے میں بھی ہے۔(مؤلف) علامہ عبدالحئی لکھنویؒ نے لکھا کہ متشددین میں سے ابن تیمیہ بھی ہیں، جنہوں نے ابن الجوزی وغیرہ کے اتباع میں بعض احادیث خیر اور بہت سی ضعیفہ کو موضوع کہہ دیا بلکہ بہت سی اختلافی موضوع احادیث کے اتفاقی موضوع ہونے کا اور اتفاقی ضعیف کے جھوٹی ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے الخ (اجوبہ فاضلہ ص ۱۷۳)

نمازِ جماعت: کسوفِ شمس کی نماز میں حنفیہ کے نزدیک جماعت مسنون ہے، اور جمعہ کی نماز پڑھانے والا امامت کرے گا، اور دیہات میں بلا جماعت پڑھیں گے۔ چاند گرہن کی نماز میں حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک جماعت مسنون نہیں ہے البتہ جائز ہے امام شافعی واحمدؒ کے یہاں اس میں بھی جماعت ہے کسوف کی طرح۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں چاند گرہن کئی بار رہا، مگر آپ سے منقول نہیں ہوا کہ جماعت سے نماز کرائی ہو (اوجز ص ۲/۲۷۸)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی نمازِ جماعت خسوف کا ذکر محدثین نے نہیں کیا، صرف سیرۃ ابن حبان میں اس کا ذکر ہے۔

قراءۃ نمازِ کسوف جہراً یا سراً

امام ابوحنیفہ کے نزدیک نمازِ کسوف میں قراءتِ سری ہے۔ یہی راجح ہے صاحبین (امام ابو یوسف و امام محمد) جہری کے قائل ہیں۔ کیونکہ اس میں خطبہ ہے، اور جس نماز کے ساتھ خطبہ ہو، اس میں قراءت جہری ہوتی ہے۔

امام بخاری اور صلوٰۃ کسوف میں جہری قراءت

امام بخاریؒ کا مسلک جہری قراءت ہے، جو مسلکِ جمہور کے خلاف ہے، کیونکہ شافعیہ مالکیہ، امام ابوحنیفہ و جمہور فقہ کا مسلک سری قراءت کا ہے، امام احمدؒ ابو یوسف ومحمد جہری قراءت کے قائل ہیں، یہاں امام بخاریؒ نے صلوٰۃ کسوف کے آخری باب میں قراءت جہری کے اثبات کے لئے حدیثِ حضرت عائشہؓ پیش کی ہے، مگر وہ حدیثِ سمرہ کے معارض ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نمازِ کسوف میں حضور علیہ السلام کی قراءت نہیں سنی، یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، وطحاوی وغیرہ میں ہے اور امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن صحیح کہا۔ حاکم نے کہا کہ یہ روایت بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

اسی طرح حدیث ابن عباس میں بھی یہ ہے کہ میں نمازِ کسوف میں حضور علیہ السلام کے قریب ہی تھا، میں نے آپ سے ایک حرف بھی نہیں سنا، اس روایت کو علامہ ابوعمر نے پیش کیا ہے اور امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے نمازِ کسوف میں قریب سورۂ بقرہ کے پڑھی، اس لئے کہ اگر آپ جہر کرتے تو اندازہ کی ضرورت نہ ہوتی، اور امام شافعیؒ نے تعلیقاً یہ بھی ذکر کیا کہ حضرت ابن عباس نے حضور علیہ السلام کے قریب نماز پڑھی تھی اور ایک حرف بھی آپ سے نہیں سنا۔ حدیث ابن عباس مسندِ احمد ومسندِ ابی یعلی وعلیہ ابی نعیم ومعجم طبرانی وغیرہ میں ہے۔

الحاصل محدثین نے فیصلہ کیا ہے کہ جہر کی روایت میں زہری منفرد ہیں اور امام بیہقی نے امام احمدؒ سے نقل کیا کہ جہر والی روایتِ حضرت عائشہ صرف زہری سے مروی ہے، اور دوسری روایت حضرت عائشہؓ سے اسراء کی بھی ہے جس میں ہے کہ میں نے اندازہ لگایا کہ حضور علیہ السلام نے سورۂ بقرہ پڑھی تھی۔ یہ حضرت ابن عباس وسمرہ دونوں صحابہ کی روایت کے مطابق ہے۔ پھر یہ تطبیق بھی ممکن ہے کہ اتنی طویل قراءت میں حضور علیہ السلام نے کبھی کبھی کوئی آیت جہر سے بھی پڑھی ہوگی۔ جس کی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے جہر کی روایت فرمائی ہے، جس طرح مروی ہے کہ صحابہ نے حضور علیہ السلام سے ظہر وعصر میں بھی ایک آیت یا دو آیت سنی ہیں اوجز ص ۲/۲۸۸) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فقہی مسائل میں صرف امام بخاری کی روایت کردہ احادیث اور ان کی ابواب ودعاوی پر انحصار کرنا محدثانہ نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے اور اسی لئے سلفی حضرات (غیر مقلدین) کا بہت سے مسائل میں صرف بخاری کی حدیث طلب کرنا یا پیش کرنا طریق اسلم وانسب نہیں ہے۔

صلوٰۃ کسوف کے بارے میں دوسری ابحاث بھی اوجز میں خوب مفصل ومدلل بیان ہوئی ہیں۔ **فلیطالع ھناک من شاء۔**

دوسرے مسائل: اس نماز کی کم از کم دو رکعت ہیں اور چار رکعت پڑھنا افضل ہے، یہ نماز عیدگاہ یا جامع مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔ اگر نماز

نہ پڑھیں، صرف دعا کریں تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر کسوف کے وقت کوئی جنازہ آجائے تو پہلے جنازہ کی نماز پڑھیں گے۔
چاند گہن کی نماز مستحب ہے اس میں جماعت نہیں ہے۔ جب تک گہن موقوف نہ ہو دعا میں مصروف رہنا چاہئے۔ البتہ ایسے وقت میں اگر کسی فرض نماز کا وقت آجائے تو دعا موقوف کر کے نماز پڑھی جائے۔ اگر ہولناک آندھی آئے، یا بارش لگاتار کثرت سے برسے اور بند نہ ہو یا برف کثرت سے پڑے اور اس کا گرنا بند نہ ہو، یا آسمان سرخ ہو جائے یا دن میں سخت تاریکی ہو جائے، یا رات میں یکا یک ہولناک روشنی آجائے، یا زلزلہ آئے، یا بجلیاں کڑکیں اور گریں یا ستارے بکثرت ٹوٹنے لگیں، یا وبائی امراض کثرت سے پھیل جائیں یا اسی طرح اور کوئی سخت ہولناک امر لاحق ہو تو ایسے حوادث کے دفعیہ کے لئے دو رکعت نماز اکیلے اکیلے اپنے گھروں میں یا مساجد میں پڑھیں، اور نماز کے بعد دعا کریں۔

امام زہری کا انفراد

یہاں یہ امر بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں ہے کہ حدیثی روایات تک میں بھی کسی بڑے سے بڑے حافظِ حدیث امام زہری جیسے کا بھی روایت میں انفراد قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا، تو ظاہر ہے کہ اصول وفروع کے مسائل میں بھی انفراد یا تفرد بدرجۂ اولیٰ پسندیدہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا اولیت وترجیح صرف جمہور کے مختارات کو ملنی چاہئے، اور اسی لئے ہم امام بخاری یا حافظ ابن تیمیہ وابن قیم وشوکانی وغیرہ کے تفردات کو بھی اکثر زیر بحث لاتے ہیں، اگرچہ ہم ان سب اکابر کی دل سے نہایت تعظیم بھی کرتے ہیں، اور خدانخواستہ ہمارے دل میں کسی ایک کی بھی جلالتِ قدر وخدماتِ جلیلہ کے اقرار واعتراف سے اباء وانکار نہیں ہے۔ اور یہی بات ہمیں اپنے بڑوں سے ورثہ میں ملی ہے، ملاحظہ ہو امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے کسی ایک کو بھی امام یحییٰ بن معین سے زیادہ محدثین کی توقیر وتعظیم کرنے والا نہیں پایا۔" (تاریخ ابن معین ص ۱/۲۲) آخر یہ یحییٰ بن معین بھی حسبِ تحقیق اصحابِ رجال حنفی المسلک ہی تو تھے۔

تاریخ ابن معین کی اشاعت

اس دور میں جہاں اکابرِ امت کی دوسری تالیفات بڑے اہتمام وشان سے طبع ہو کر شائع ہو رہی ہیں، علامۂ محدث موصوف کی تاریخ بھی منصۂ شہود پر آگئی ہے، جس کی اکابر محدثین تمنا کیا کرتے تھے، اور اس عظیم خدمت کے لئے الدکتور احمد محمد نور سیف استاذ مساعد کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ قابلِ مبارکباد ہیں، کہ آپ کی تحقیق وترتیب کے ساتھ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوگئی ہے۔
فالحمدللہ حمدا کثیرا علی ذالک.
نیز ادارۂ جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ بھی پوری امتِ مسلمہ کی طرف سے مستحقِ صد تشکر وامتنان ہے کہ ایسا قیمتی علمی ذخیرہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی اور علماء وعلمی اداروں کے لئے اس کو بلا قیمت کے وقفِ عام کیا۔ چنانچہ احقر کو بھی یہ بیش قیمت علمی خزانہ بلا قیمت حاصل ہوا۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء.

امام بخاری کا عظیم ترین علمی مقام

ہم نے امام ہمام موصوف کی علمی خدماتِ جلیلہ اور آپکے اوصافِ عالیہ کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے مقدمہ انوارالباری جلد دوم میں کیا تھا۔ اور جوں جوں ہم شرح بخاری شریف میں آگے بڑھ رہے ہیں، ہماری گردن ان کے اوصاف وکمالات کے اعتراف کے لئے زیادہ ہی زیادہ جھکتی جارہی ہے، اگرچہ ایسے مقامات میں جیسا ابھی گزرا ہمیں جواب دہی یا اظہارِ حق کے لئے کچھ لکھنا بھی پڑتا ہے، کیونکہ احقاقِ حق بھی ایک فریضہ ہے۔
امام بخاریؒ اپنے خاص مسلک کی ترجیح کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں اور اس کو عناوین الابواب میں بھی نمایاں کرتے ہیں اور باوجودیکہ

اپنی کتاب میں وہ جمع مجردِ صحیح کا ہی التزام کرتے ہیں، اور اقوال وافعالِ صحابہ کی حجیت کے بھی قائل نہیں ہیں، مگر اس ضمن میں ایسا بھی بہ کثرت ہوا ہے کہ وہ اپنے مسلک کے خلاف والی صحیح احادیث کو پیش نہیں کرتے اور صرف اپنے مسلک کی ہی پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، اور جمہور کے مسلک کی موید احادیث ہمیں مسلم شریف ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ وموطا امام مالک ومحمد اور کتب الآثار للامام ابی حنیفہ ومعانی الاثار للطحاوی وغیرہ میں تلاش کرنی پڑتی ہیں، پھر امام بخاری سے اپنے خاص فقہی مسلک کی تائید کے ضمن میں ان کے مولفہ رسائل میں زیادہ اور کچھ ابواب بخاری میں بھی جارحیت کا رنگ شامل ہوگیا ہے، اگرچہ بقول شاعر جوابِ تلخ مے زیبد لب لعلِ شکر خارا، ہمیں بدمزہ نہ ہونا چاہئے، اور بہت ہی نرمی اور شائستگی کے ساتھ جواب دہی اور احقاقِ حق کا فریضہ ادا کرنا چاہئے۔

مثلاً (۱) امام بخاری حالتِ رکوع وسجود میں قراءتِ قرآن مجید کی اجازت دیتے ہیں، جبکہ جمہورِ امت کا اس کی ممانعت پر اتفاق ہے اور مسلم وترمذی میں ممانعت کا عنوان قائم کر کے بہت سی احادیث صحاح پیش کی گئی ہیں گویا بقول ابن رشد امام بخاری کے یہاں ممانعت کی کوئی حدیث ہی صحیح نہیں ہے (فیض الباری ص ۲/۲۷۴ وبدایۃ المجتہد ص ۱/۱۱۰ وفتح الملہم ص ۲/۹۱)۔

(۲) امام بخاری اور اہلِ ظاہر کے نزدیک جنبی مرد اور حائضہ عورت کے لئے قرآن مجید کا مس کرنا جائز ہے، جبکہ امام مالک، امام ابو حنیفہ وشافعی وغیرہ کے نزدیک ناجائز ہے (بدایۃ المجتہد ص ۱/۳۵) حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ جمہور کے پاس ممانعتِ تلاوت کی حدیثِ مرفوع ہے اور امام بخاری محض آثار کی بنا پر اس کی اجازت دیتے ہیں۔

(۳) جمہور کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مقتدی اگر امام کو رکوع میں پالے تو اس نے وہ رکعت پالی، مگر امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ مدرکِ رکعت نہیں ہوگا۔

(۴) نمازِ وتر دو سلام کے ساتھ امام بخاری کے نزدیک بوجہ فعل ابن عمرؓ ہے بمقابلۂ احادیث وآثار صحیحہ (انوار المحمود ص ۳۱۰) قالہ الشیخ الانور۔ وکم مثلہ من الامثلہ، کمالا یخفی علی البصیر المتوقد.

سخن ہائے گفتنی: افسوس اس کا ہے کہ اس دور میں دورۂ حدیث چھوٹے مدارس میں بھی بڑی تیزی سے جاری ہوتا جا رہا ہے جبکہ ان کے شیوخ الحدیث یا شیوخ البخاری میں درسِ حدیث کی مکمل صلاحیت بھی نہیں ہوتی، درحقیقت فنِ حدیث اسناد ومتون ورجال کا غیر معمولی علم اور وسیع مطالعہ چاہتا ہے، اور سینکڑوں محدثین کبار کی تالیفات وشروح پر تحقیقی وتدقیقی نظر کا محتاج ہے، اور اسی لئے یہ فن تمام فنون تفسیر وفقہ واصول فقہ وغیرہ سے زیادہ دشوار ومحنت طلب ہے۔ مگر غلطی سے اس کو بہت آسان سمجھ لیا گیا۔

تخصص فی الحدیث کی ضرورت

بڑے بڑے دار العلوم جن میں اب بھی کچھ حضرات صحیح معنی میں شیوخ الحدیث کہلائے جاسکتے ہیں۔ اگر ان کی زیر تربیت ونگرانی دورۂ حدیث میں اول درجہ کے فارغ طلبہ کو ۲۔۳ سال تک تخصص کرایا جائے، تو ممکن ہے ہم اس اہم وجلیل القدر فنِ شریف کی حفاظت میں کامیاب ہوسکیں گے ورنہ موجودہ روز افزوں انحطاط نہایت مایوس کن ہے۔ دوسری طرف غیر منصف غیر مقلدین کی چیرہ دستیاں اور دراز لسانیاں بڑھ رہی ہیں، عرب ملکوں میں حنفیہ کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کر کے اور صرف اپنی جماعت کو اہلِ حق بتلا کر وہاں سے لاکھوں کروڑوں روپے لاکر اپنے دار العلوم بنا رہے ہیں اور کتابیں شائع کر رہے ہیں جن میں محض تلبیس ہوتی ہے وہ مہم ان کو مبارک ہو۔ ہمیں تو صرف علم و تحقیق کے میدان میں ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس سے غفلت ہرگز نہ ہونی چاہئے، واللہ المستعان۔

باب ماجاء فی سجود القرآن وسنتہا (بخاری ص ۱۴۶ تا ص ۱۴۷)

سجدہ تلاوت امام مالک، شافعی واحمد وغیرہ کے نزدیک سنتِ مؤکدہ ہے، اور امام ابوحنیفہ واصحاب کے نزدیک واجب ہے لقولہ

تعالیٰ واسجد واقترب و قولہ واسجد واللہ کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے اور قولہ تعالیٰ فما لھم لا یومنون واذا قری علیھم القرآن لا یسجدون، کیونکہ ترک پر ملامت ومذمت واجب پر ہی ہوتی ہے، اور جن اخبار میں تلاوت کے وقت سجدہ کرنے کی خبر دی گئی ہے، وہ بھی بمعنی علم کے ہیں۔

علامہ ابن القیم نے کتاب الصلوٰۃ میں لکھا کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان لوگوں کی تعریف کی جو اس کا کلام سن کر سجدہ میں گر جاتے ہیں اور ان کی مذمت کی جو اس کو سن کر بھی سجدہ نہیں کرتے، اس لئے واجب کہنے والوں کی بات دلیل کے اعتبار سے قوی ہے الخ حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس پر اچھا مواد پیش کردیا ہے۔ (اوجز ص ۲/۳۷۰)۔

تمام قرآن مجید میں ۱۴ جگہ سجدہ واجب ہے، جن میں سے چار سجدے قرآن مجید کے نصف اول میں ہیں اور دس نصف دوم میں۔ امام شافعی وامام احمد کے نزدیک بھی ۱۴ ہی ہیں، لیکن ان کے نزدیک سورۂ ص میں سجدہ نہیں ہے، اور سورۂ حج میں دو سجدے ہیں۔ امام اعظمؒ کے نزدیک سورۂ حج میں ایک سجدہ ہے، جو پہلے ہے کیونکہ دوسرا سجدہ سورت کے آخر میں نماز کا سجدہ ہے۔ امام مالک کے نزدیک صرف گیارہ سجدے ہیں، یعنی سورۂ نجم انشقت واقراء میں وہ سجدہ نہیں مانتے۔

شرائطِ سجدہ: سجدہ تلاوت کے لئے بھی نماز طہارت، استقبال قبلہ، نیت سجدۂ تلاوت، ستر عورت وغیرہ ضروری ہیں۔ کھڑے ہو کر سجدہ میں جائے تو بہتر ہے بیٹھ کر بھی کرے تو درست ہے۔ سجدہ میں کم سے کم تین بار سبحان ربی الاعلیٰ کہے۔

شرطِ طہارت اور امام بخاری وابن تیمیہ

امام بخاری نے باب سجود المسلمین مع المشرکین میں حضرت ابن عمر کے بغیر وضو سجدہ کرنے کا ذکر کیا جس سے یہ سمجھا گیا کہ ان کے نزدیک طہارت شرط نہیں ہے، حالانکہ طہارت کی ضرورت کو بجز شعبی کے سب ہی اکابر امت بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں، تو بخاری کے ایک نسخہ میں غیر کا لفظ نہیں ہے، لہٰذا حضرت ابن عمرؓ کا بھی سجدہ باوضو ہی ثابت ہوا، اور مشرکین کا سجدہ سرے سے عبادت ہی نہیں تو ان کے لئے وضو اور غیر وضو برابر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سفر میں ہوں اور تیمم سے سجدہ بھی ادا کیا ہو، اور بیہقی نے بہ اسنادِ صحیح حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا کہ آدمی بغیر طہارت کے سجدہ نہ کرے۔

اس تفصیل کے بعد یہ یقین کرلینا مشکل ہے کہ امام بخاری بھی بلا طہارت کے جوازِ سجدۂ تلاوت کے قائل تھے، بلکہ مشرکین کو نجس بتانا کہ ان کا وضو بھی صحیح نہیں، اس کا قرینہ ہے کہ وہ ابن عمر کے وضو سے ہی سجدہ کرنے کو بتا گئے ہیں اور مشرک نجس ہے تو اس کا وضو بھی نہ ہوا، اس لئے اس کا سجدہ بھی معتبر نہ تھا۔ تاہم شعبی کی طرح حافظ ابن تیمیہ ضرور اس کے قائل ہوئے ہیں اور انہوں نے امام بخاری کو بھی اپنے ساتھ خیال کیا ہے (ملاحظہ ہو باب سجود التلاوۃ فتویٰ کبری طبع مصر ص ۴/۴۲۴)۔

بحث مہم بابۃ تلک الغرانیق

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے جو روایت ابن عباسؓ کی پیش کی ہے، اس میں ہے کہ حضور نے سورۂ نجم کی آیتِ سجدۂ تلاوت کر کے سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مشرکین نے بھی سجدہ کیا اس کے بارے میں بعض مفسرین نے لکھا کہ اس وقت شیطان نے حضور کی زبان پر "تلک الغرانیق العلے وان شفاعتھن لترتجی" کے الفاظ جاری کرادیے تھے اس لئے مشرکوں نے بھی اس سے خوش ہو کر سجدہ کیا تھا۔ حالانکہ یہ واقعہ قطعاً غلط ہے۔ جب شیطان خواب میں بھی آپ کی صورت پر کسی کو نظر نہیں آسکتا تو اس کو حق تعالیٰ ایسی قدرت کب دے سکتے ہیں کہ وہ آپ کی زبان سے شرکیہ الفاظ جاری کرادے۔

پھر کچھ علماء نے یہ توجیہ کی کہ شیطان نے آپ کے لہجہ میں یہ کلمات اس وقت ساتھ میں کہہ دیئے، جس سے مشرکین کو مغالطہ ہوگیا کہ آپ ہی نے یہ الفاظ کہے ہیں، حالانکہ یہ بات بھی قطعاً غلط ہے، اور ایسا اس لئے بھی نہیں ہوسکتا کہ اس سے پوری شریعت کی طرف سے امان سے اٹھ جاتا ہے۔

میرے نزدیک لہجہ کے اقتباس کی تاویل بھی بے ضرورت ہے، کیونکہ مجامع ومجالس میں اس کے بغیر بھی مغالطے لگ جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب ابتدا میں سارے مشرکین بھی ایمان لے آتے تھے۔ چنانچہ حافظ نے طبرانی سے روایت کی کہ جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی طرف بلایا تو اہلِ مکہ اسلام لے آئے تھے حتیٰ کہ آپ آیتِ سجدہ پڑھتے تو وہ بھی سجدہ کرتے تھے، یہاں تک کہ لوگوں کے ازدہام کی وجہ سے بعض لوگوں کو سجدہ کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔

اس کے بعد وہ دور آیا کہ رؤسا قریش ولید بن المغیرہ اور ابوجہل وغیرہ طائف سے مکہ میں آئے تو ان کے گمراہ کرنے سے وہ مشرکین بھی لوٹ گئے۔

حافظ نے اگرچہ اس واقعہ میں تردد کیا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کرنے کی یہی صورت ہوئی ہوگی، پھر یہ کہ ان کو سجدہ کے باوجود مشرکین کیوں کہا گیا تو اس لئے کہ گو وہ سجدہ کے وقت اسلام لے آئے تھے لیکن بعد کو تو مرتد ہوگئے تھے لہٰذا نقلِ واقعہ کے وقت ان کو موجودہ حالت کی وجہ سے مشرکین ہی سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ اعتبار انجام کا ہے۔

امام طحاوی نے بھی بابِ فتح مکہ میں یہ روایت نقل کی ہے۔ (۱۹۶/۲) گو سند اس کی بھی ضعیف ہے۔ اس کے بعد میں نے یہی حکایت تاریخ ابن معین میں بھی دیکھی ہے۔ انہوں نے اس کو اپنی کتاب کے شروع میں نقل کیا ہے۔

تیسرے یہ کہ غرانیق سے مراد ملائکہ بھی ہوسکتے ہیں اور محمد بن اسحاق نے ایک مستقل رسالہ مفسرین کے نقل کردہ قصہ کی تردید میں لکھا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کے معاصر تھے، اور لوگوں نے ان کی تضعیف بھی کی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ وہ تو اگر باب المغازی میں بھی کوئی ضعیف بات نقل کردیں تو ان پر نقد وجرح کردی جاتی ہے اور دارقطنی باب احکام تک میں بھی آثار مختلط درج کردیں، تب بھی وہ امام رہتے ہیں۔

غالباً حضرت شاہ صاحبؒ نے تاریخ ابن معین کے قلمی نسخہ کا مطالعہ فرمایا ہوگا۔ کیونکہ شائع تو یہ اب ہوئی ہے۔ جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ یہ واقعہ مطبوعہ میں ص ۳۲۹/۱ پر درج ہے۔

حضرتؒ کا مطالعہ صرف مطبوعات تک محدود نہ تھا، ہندوستان کے بھی نوادر مخطوطات ملاحظہ فرمایا کرتے تھے اور کوشش کرکے حاصل کرتے تھے، اور حرمین شریفین میں کئی ماہ قیام فرما کر وہاں کی مخطوطات بھی ملاحظہ کی تھیں۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ بیسیوں سال تک عبارات و الفاظ تک یاد رہتے تھے، اور حوالے کبھی غلط نہ ہوتے تھے اور یہی حال ہم نے علامہ کوثریؒ کا بھی دیکھا، ان کی نظر بھی مطبوعات ومخطوطات سب پر یکساں تھی۔ دونوں حضرات علم کے بحرِ بے کراں تھے۔ ناز م بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است۔ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

ابواب تقصیر الصلوٰۃ (بخاری ص ۱۴۷ تا ص ۱۵۱)

حالت سفر میں قصر حنفیہ کے نزدیک واجب، بعض شافعیہ کے نزدیک قصر واتمام دونوں واجب کہ جس کو چاہے اختیار کرے۔ امام مالک کے نزدیک مشہورتر روایت میں سنت، اور امام شافعی کے نزدیک مشہورتر روایت میں رخصت ہے، (بدایۃ المجتہد ص ۱۴۲/۱)۔

پھر مسافتِ قصر میں بھی کافی اختلاف ہے، کہ امام مالک، شافعی واحمد اور جماعت کثیرہ کے نزدیک چار برید کی مسافت پر قصر ہے جو ایک دن کا سفر بہ سیر وسط ہے، امام ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور تمام کوفیوں کے نزدیک کم سے کم مسافتِ قصر تین دن کا سفر ہے۔ اہلِ ظاہر کہتے

ہیں کہ قصر ہر سفر میں ہے خواہ قریب کا ہو یا دور کا۔

چار برید کا مذہب بروایتِ امام مالک حضرت ابن عمر و ابن عباسؓ سے مروی ہے، اور تین دن کا حضرت ابن مسعود و حضرت عثمانؓ وغیرہ سے مروی ہے (ررص ۱/۱۴۳)

امام بخاریؒ نے باب فی کم یقصر الصلوٰۃ کے عنوان میں حضور علیہ السلام سے ایک دن رات کا سفر ذکر کیا اور حضرت ابن عمر وحضرت ابنِ عباسؓ سے قصرِ صلوٰۃ وافطار صوم کے لئے چار برید ذکر کئے اور ان کی تشریح بھی سولہ فرسخ (۴۸ میل) سے بتائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ آئمہ اربعہ کے لئے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے استدلال واضح ہے لیکن اہلِ ظاہر کے لئے یہاں کوئی مستدل نہیں ہے، کہ چند گھنٹے کا سفر ہو تو وہ بھی شرعی سفر بن جائے، جس میں نماز کا قصر اور روزے کس افطار جائز قرار پائے اور علامہ ابن تیمیہ بھی اس مسئلہ میں اہلِ ظاہر کے ہمنوا ہیں ان کا پورا ارشاد ملاحظہ ہو۔

("نماز کا قصر ہر سفر میں جائز ہے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر، اور اس کی کوئی تحدید وتقدیر نہ ہوگی، یہی مذہب ظاہریہ کا بھی ہے جس کی تائید صاحب المغنی نے بھی کی ہے اور خواہ وہ سفر مباح ہو یا محرم ہو، جس کی تائید ابن عقیل نے کی ہے اور اس کے قائل بعض متاخرین اصحاب امام احمد وشافعی بھی ہوئے، اور خواہ چار دن سے زیادہ کی بھی نیتِ اقامت کرلے یا نہ کرے۔ یہ بھی ایک جماعتِ صحابہ سے مروی ہے۔ (آگے لکھتے ہیں:۔)

ابوالعباس (ابن تیمیہ) نے ایک قاعدہ نافعہ مقرر کیا ہے کہ جس امر کو شارع نے مطلق رکھا ہے۔ تو اس کے مطلق مسمی و وجود کو باقی رکھیں گے اور اس کی تقدیر وتحدید کسی مدت کے ساتھ جائز نہ ہوگی، اسی لئے پانی کی دوقسم طاہر طہور یا نجس ہی ہوں گی، اقل حیض واکثر حیض کی کوئی حد مقرر نہ کریں گے، جب تک کہ وہ مستحاضہ نہ ہو جائے، اسی طرح نہ اقلِ سن کی تحدید کریں گے نہ اکثر کی، اور نہ اقلِ سفر کی، البتہ بستی سے باہر اپنی کسی اراضی کاشت کے لئے نکلنا۔ اور ایسے ہی حضور علیہ السلام کا قبا کی طرف نکلنا۔ اس کا نام سفر نہ ہوگا، اگرچہ ایک برید ہی ہو، اور اسی لئے اس کے واسطے نہ توشہ لے جاتے ہیں نہ سفر کی طرح تیاری کرتے ہیں۔ پھر اس کی مدت بھی کم ہوتی ہے، لہٰذا مسافت قریبہ جس میں مدت طویلہ صرف ہو وہ تو سفر کہلائے گی اور مسافتِ بعیدہ کم مدت والی سفر نہ کہلائے گی۔ الخ) فتاویٰ کبریٰ ص ۴/۴۴۳۔

یہاں ہم نے یہ اتنی طویل عبارت اس لئے نقل کی ہے تا کہ علامہ موصوف کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ ناظرین کے سامنے آجائے، اور معلوم ہو کہ موصوف کس کس طرح اپنی اجتہادی قوت وشان کا مظاہرہ کرتے تھے۔

یاد آیا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بعض مرتبہ علامہ کی کوئی رائے بتا کر اور اس پر تفصیلی نقد وتبصرہ کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ شاید علامہ ابن تیمیہ یہ سمجھتے تھے کہ شریعت میری عقل کے مطابق آئی ہے یا آنی چاہئے تھی۔ واللہ تعالیٰ علیم بمافی الصدور۔

علامہ ابن تیمیہ کے فتاویٰ کا ذکر

ہمارے مطالعہ میں مطبوعہ مصر قدیم نسخہ پانچ جلد کا ہے، اور سعودیہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ ۳۲ ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کا بھی ایک نسخہ مجھے مل گیا تھا، مگر افسوس کہ تقریباً نصف جلدیں حجاز سے نہ آسکیں۔ مطبوعہ قدیم کی تیسری جلد میں ۹۶/۹۵ میں کچھ مسائل کی فہرست دی گئی ہے، جس میں علامہ نے ائمہ اربعہ سے اختلاف کیا ہے، یا جن میں بعض کا اتباع کیا ہے۔ پھر چوتھی جلد میں صفحہ ۳۸۲ سے ۶۴۶ تک ۱۰۸ فقہی ابواب کے اندر جو علامہ نے جمہور کے خلاف رائیں قائم کی ہیں، وہ سینکڑوں مسائل بھی دکھائے گئے ہیں۔ ان میں دوسرے مشہور اختلافی مسائل زیادہ تر نبویہ، توسلِ نبوی، اور عقائد واصول سے متعلق مسائل وابحاث نہیں دکھائے ہیں، شاید اس لئے کہ ان پر مستقل تالیفات علامہ کی موجود ہیں۔

علماءِ نجد وحجاز کی خدمت میں

ضروری گزارش یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے "طلاقِ ثلاث بلفظ واحدہ کے لئے جمع ہوکر بحث تنقیح کا بیڑا اٹھایا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جمہور سلف وخلف کے خلاف علامہ ابن تیمیہ کی رائے صحیح نہ تھی۔ اسی لئے اس کو رد کر کے جمہور کے مطابق فیصلہ کر کے اس کو سعودیہ قلمرو میں نافذ وشائع بھی کر دیا، اسی طرح وہ دوسرے انفرادی مسائل پر بھی غور وتوجہ کریں۔ ہمارے نزدیک بیسیوں فروعی واصولی مسائل اب بھی ایسے ہیں کہ جن پر بحث وتنقیح کے بعد علامہ کی رائے کو مرجوع قرار دے کر جمہور ائمہ یا امام احمد کے مسلک کو ترجیح دی جائے گی۔ وہوالمقصود۔

ہمارے نزدیک چاروں ائمۂ عظام "کاسرۃ واحدہ" (ایک کنبہ وقبیلہ کی طرح) ہیں، اور ہم اس سے مطمئن ہیں کہ چاروں مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کے مطابق بھی شرعی حکم کا اجراء کرا دیا جائے تو وہ اس سے ہزار جگہ بہتر ہے کہ ان سے الگ ہوکر کوئی شرعی رائے انفرادی طور سے منوائی جائے۔

مسلک علماءِ دیوبند

ہمارا مسلک اگرچہ حنفی ہے، مگر ہم بہ نسبت دیگر مذاہب فقہیہ کے امام احمدؒ کے فقہی مسلک سے زیادہ قریب ہیں، اس کے بعد ہمارا مسلک مالکی مذہب سے بہت زیادہ قریب ہے، پھر یہ بات ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ردِ بدعت وشرک اور مخالفتِ عقائد باطلہ کو ہم اپنا سب سے بڑا فریضہ سمجھتے ہیں، اور اسی لئے ہندوپاک کے اہلِ بدعت میں سے بریلوی حضرات ہم سے بہت دور اور سخت ناراض ہیں اور ہماری تکفیر تک کرتے ہیں۔ تاہم اپنے موقف سے نہ اب تک ہم ہٹے ہیں اور نہ آئندہ ہم کبھی ہٹیں گے۔ ان شاء اللہ۔ لیکن دوسری طرف ہم ان لوگوں کے خیالات وعقائد پر بھی نقد وجرح کرنے پر مجبور ہیں جو کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ عرش نشین ہے اور عرش کو خدا کے وجود وجلوس سے خالی ماننے والے چنگیز خان کی طرح کافرِ مطلق ہیں۔ فلا تنکروا انه قاعد. ولا تنکروا انه يقعد (خدا کے عرش پر قاعد وجالس ہونے کا انکار مت کرو، اور نہ اس سے انکار کرو کہ وہ روزِ قیامت اپنے عرش پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بٹھائے گا) خدا صرف ایک جہتِ فوق میں محدود ہے، جو لوگ کسی اونچے پہاڑ پر ہیں وہ بہ نسبت ہمارے خدا سے قریب ہیں، کیونکہ خدا اوپر عرش پر ہے۔ ہم سے بہت دور ہے کہ زمین وآسمان درمیان میں خدا کا عرش قدیم بالنوع ہے کہ خدا کے ساتھ ایک نہ ایک عرش جلوس کے لئے ضرور ہمیشہ سے رہا ہے۔ جب دنیا فنا ہوگی تو خدا زمین پر آ کر چکر لگائے گا، خدا کا عرش آٹھ بکرے اٹھائے ہوئے ہیں، جن کے گھٹنوں اور کھروں کے درمیان زمین سے آسمان تک دوری کی مسافت ہے وغیرہ، ایک وقت آئے گا کہ جہنم فنا ہو جائے گی، یعنی کافروں کو ابدی عذاب نہ ہوگا، مقامِ محمود سے مراد حضور علیہ السلام کا روزِ قیامت خدا کے عرش یا کرسی پر اس کے پاس بیٹھنا ہے، صبح کے وقت شروع دن میں حق تعالیٰ کا بوجھ عرش پر مشرکین کے شرک کی وجہ سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پھر جب ملائکہ تسبیح کرتے ہیں تو وہ بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے خدا کرسی پر بیٹھتا ہے تو صرف چار انگل جگہ بچتی ہے۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے عقائد کتاب النقض للدارمی میں ذکر کئے گئے ہیں، جن کی اشاعت کے لئے علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے وصیت کی تھی اور شیخ عبداللہ ابن الامام احمد کی کتاب السنہ وغیرہ میں ہیں۔ اور ان سب کتابوں کو اس دور کے سلفی حضرات نے شائع کر دیا ہے۔ اور ان کے عقائد بھی یہی ہیں، الا ماشاء اللہ۔

بہر حال! سلفی حضرات کو بھی اہلِ بدعت کی طرح غلط عقائد ونظریات سے اجتناب کرنا چاہئے اور صرف ان عقائد ونظریات پر یقین کرنا چاہئے جو "ما انا عليه و اصحابي" کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ واللہ الموفق۔

علامہ ابن تیمیہ کے قاعدۂ نافعہ پر ایک نظر

علامہ نے سفرِ شرعی کے لئے مسافت کی بات درمیان سے بالکل اٹھادی اور مدار مدت پر رکھ دیا کہ کم مدت صرف ہو تو سفر نہیں، زیادہ صرف ہو تو وہ سفرِ شرعی ہے، حالانکہ شریعت نے سارا مدار مسافت پر ہی رکھا تھا، علامہ کی عقل نے یہ نئی اختراع کی یعنی ایک شخص ۱۵۔۲۰ میل پیدل چل کر جائے اور اس کے لئے زاد و توشہ ساتھ لے تو وہ سفر ہے اور چار دن سے زیادہ دن کی اقامت کا ارادہ کرے تب بھی مسافر ہی رہے گا۔ دوسرا مثلاً سو پچاس میل ہوائی جہاز سے جائے، اور توشہ ساتھ نہ لے تو وہ شرعی مسافر نہیں اور مقیم ہی کی نماز پڑھے گا۔

گویا اس طرح سفر کے لئے کوئی نصابِ شرعی مقرر نہیں ہوسکتا اور جو کچھ احادیث و آثار اور تعاملِ صحابہ سے سمجھا گیا تھا، وہ سب کاوش غیر شرعی تھی، اسی طرح اقل و اکثرِ حیض کی مدت سارے اکابرِ امت و علماء اسلام نے غلط طور سے مقرر کی تھی، کیونکہ وہ علامہ موصوف کے مقررہ قاعدۂ نافعہ کے خلاف ہے، علامہ موصوف کی عادت ہے کہ وہ اپنے ذہن و عقل سے ایسے قوانین بناتے ہیں جو شرعی نصوص سے ٹکراتے ہیں، اسی نظریے سے انہوں نے مسافر کے لئے مدتِ مسح خفین کی توقیت کو بھی ختم کردیا ہے، یعنی ایک دو ماہ یا زیادہ بھی سفر میں رہے تو برابر مسح کرتا رہے، جنبی شخص وضو کرلے تو مسجد میں ٹھہر رہ سکتا ہے کسی کی عادت رات میں نفل نماز یا تہجد کی ہو تو وہ بستی کے اندر پانی کے ہوتے ہوئے بھی تیمم کرکے یہ نماز پڑھ سکتا ہے، عمداً کوئی نمازِ فرض ترک کردے تو اس کی قضا جائز و مشروع نہیں۔ سونے چاندی کا بنا ہوا زیور ہو تو اس کی ہم جنس زیور کے ساتھ کمی بیشی کے باوجود خرید و فروخت کرسکتے ہیں وغیرہ وغیرہ، یہ اور اس قسم کے سینکڑوں مسائل علامہ نے اپنی عقلِ وقاد کے ذریعے حل کردیئے ہیں۔ اگر ان کے مقررہ مسئلہ کی کسی سے کچھ تائید مل جائے تو بہت بہتر ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی اوپر آپ نے دیکھا کہ امام بخاری کو ساتھ لے لیا کہ وہ بھی بلا وضو سجدۂ تلاوت جائز سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی یہ رائے دوسرے محققین اکابر کی نظر میں مشکوک اور غیر متعین ہے۔

زیارۃِ نبویہ کے وقت روضۂ مقدسہ پر سلام عرض کرے تو قبلہ سے پشت نہ کرے، اور اپنی اس منفرد رائے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول مل گیا تو اس کو تائید میں پیش کردیا، حالانکہ اس کی سند موضوع ہے، اور صحیح قول ان کا بھی دوسرے اکابر کی طرح استقبالِ قبر شریف ہے۔

الحاصل بقول حضرت شاہ صاحبؒ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ دین و شریعت تمام تر میری رائے کے موافق ہے، اس لئے میں جو بھی رائے قائم کروں یا قاعدہ نافعہ مقرر کروں وہی عین دین و شریعت ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ ہی یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہر استدلال کے موقع پر صرف اپنی کہتے ہیں دوسرے کی نہیں سنتے۔

دوسرے حضرات نے یہ ریمارک تک بھی کردیا کہ علامہ کا علم و مطالعہ ان کی عقل سے زیادہ[1] تھا (جس کی وجہ سے صحیح توازن قائم نہ ہوسکا) بہرحال! ہم تو بہت چھوٹے اور ان کی نسبت سے حقیر در حقیر ہیں، اور درحقیقت ان کی جلیل القدر علمی خدمات و تحقیقات عالیہ کے مرہونِ منت بھی، اس لئے صرف نقل پر اکتفا کرتے ہیں، ہمارا فرض صرف اتنا ہے کہ ان کے علوم نافعہ سے استفادہ کریں اور تفردات کی نشاندہی کرکے ان سے بچیں اور دوسروں کو بچائیں۔ اور غلطیوں سے بجز انبیاء علیہم السلام کے کوئی معصوم ہے بھی نہیں۔ واللہ المسئول للھدایۃ والرشاد۔

امام بخاری نے ایک دن و رات کے سفر کو بھی سفرِ شرعی نقل کیا ہے۔ موطأ امام مالک میں ہے کہ عبداللہ بن عمر پورے ایک دن کے سفر پر قصر کرتے تھے علامہ ابن عبدالبرؒ نے الاستذکار میں فرمایا کہ ایک دن تام کا سفر تیز رفتاری سے تھا جو تقریباً چار منزل کا ہے۔

موطأ مالک میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ قصر کرتے تھے مکہ و طائف جیسی مسافت میں (فاصلہ ۱۲ فرسخ۔ ۳۶ میل) اور مکہ و عسفان جیسی میں (فاصلہ ۳۶ میل) اور مکہ و جدہ جیسی مسافت میں، (فاصلہ تین رات کا) امام مالک نے فرمایا کہ ان سب کے درمیان چار برید کی

---

[1] ملاحظہ ہو غیث الغمام مولانا عبدالحیٔ وغیرہ مؤلف

مسافت ہے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ جمہور علماء چار برید مسافت سے کم میں قصر نہیں کرتے تھے جو تیز رفتاری سے پورے ایک دن کی مسافت ہے اور محتاط حضرات تین دن کامل کی مسافت پر قصر کرتے تھے، (اوجز المسالک ص۲/۳۷)۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ احادیث میں جو بلا محرم کے سفر کی ممانعت ہے، میرے نزدیک اگر اعتماد اور فتنہ سے امن کی صورت ہو تو عورت غیر محرم مرد کے ساتھ بھی سفر کر سکتی ہے اور اس کے لئے احادیث میں مجھے کافی مواد مل گیا ہے۔ اور کتب فقہ کے مسائل فتن میں ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے ابو العاص کو حکم دیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو کسی شخص کے ساتھ مکہ سے مدینہ بھیج دیں۔ حالانکہ وہ محرم نہیں تھے اور حضرت عائشہؓ نے فتنۂ افک میں غیر محرم کے ساتھ سفر کیا تھا۔ (فیض الباری ص۲/۳۹۷)۔

ترکِ سننِ موکدہ سفر میں

امام بخاری نے فرض کے بعد وقبل کی سنن کا باب باندھا اور ثابت کیا کہ حضور علیہ السلام سفر میں صرف فرض پڑھتے تھے اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمانؓ کا بھی ایسا ہی معمول تھا۔ دوسرے باب میں لائے کہ حضور علیہ السلام نے سفر میں سنن فجر اور نوافل بھی پڑھے ہیں، اسی لئے علماء کے اقوال اس بارے میں مختلف ہیں، ایک یہ کہ فرض نماز سے پہلے اور بعد سننِ موکدہ نہ پڑھی جائیں۔ بعض نے کہا کہ بعد والی پڑھی جائیں، پہلی نہیں، بعض نے دن ورات کا فرق کیا کہ صرف تہجد کے نوافل پڑھے۔

امام محمدؒ نے فرمایا کہ حالتِ سیر میں نہ پڑھے اور جب کہیں راستہ میں قیام کرے تو پڑھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرا عمل بھی امام محمدؒ کے قول کے مطابق ہے۔

قولہ و صحبت رسول الله صلے الله علیه وسلم، حضرت ابن عمرؓ کے ارشاد کا مطلب حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک یہ تھا کہ حضور علیہ السلام اور حضرت ابوبکر وغیرہ دو رکعت سے زیادہ نہ پڑھتے تھے، بوجہ قصر کے، یہ بتانا مقصد نہ تھا کہ سنن بھی نہ پڑھتے تھے،

قولہ ما اخبرنا احد الخ علامہ ابن بطال نے فرمایا کہ ابن ابی لیلے کے اس قول میں کوئی حجت نہیں ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے صلوٰۃ الضحیٰ خود بھی پڑھی ہے اور اس کے پڑھنے کا حکم بھی فرمایا ہے اور یہ بہت سے فرق سے ثابت ہے، علامہ عینی نے اس کے ثبوت میں ۲۵ طریقے ذکر کئے ہیں۔ (حاشیہ بخاری ص۱۴۹)۔

علامہ ابن تیمیہ اور صلوٰۃ الضحیٰ

اس سے بھی معلوم ہوا کہ علامہ ابن تیمیہ کا صلوٰۃ الضحیٰ کو غیر ثابت بلا سبب قرار دینا نادرست ہے جبکہ جمہور ائمہ وحنفیہ، مالکیہ وحنابلہ، اس کو مندوب و مستحب بلا سبب خاص اور اکثر شافعیہ سنت فرماتے ہیں اور علامہ شیرازی اس کو سننِ راتبہ میں سے سمجھتے ہیں۔ (معارف السنن ص۴/۲۶۷)۔

باب الجمع فی السفر

جمع بین الصلاتین کا مسئلہ بھی اہم اختلافی مسائل میں سے ہے اور محدث ابن ابی شیبہ نے بھی اپنی مصنف میں ریمارک کیا کہ امام ابو حنیفہؒ نے احادیث کے خلاف اس کے عدم جواز کا فیصلہ کیا ہے، علامہ محدث کوثریؒ نے اس کا مدلل جواب "النكت الطريفه" میں دے دیا ہے کہ بخاری ومسلم کی حدیث ابن مسعود میں تصریح ہے کہ میں نے نہیں دیکھا کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بجز مزدلفہ کے کبھی کوئی نماز اس کے غیر وقت میں بھی پڑھی ہو وہاں آپ نے ضرور مغرب وعشاء کو جمع کیا تھا اور مسلم شریف میں حدیث ابنِ عباسؓ ہے کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ظہر وعصر کی نماز ایک ساتھ بغیر خوف وسفر کے پڑھی، جبکہ ائمۂ متبوعین میں سے کوئی بھی حضرت میں جوازِ جمع کا قائل نہیں ہوا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جمع سے مراد تاخیرِ عصر تھی آخر وقت تک اور اداءِ عصر اس کے اول وقت میں جیسا کہ حدیثِ جابر بن زید سے معلوم ہوتا ہے

جس کوابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے پس امام اعظم کواوثق واحوط چیز اختیار کرنے پر ملامت کرنا صحیح نہیں۔
امام محمدؒ نے موطأ میں لکھا کہ جمع بین الصلاتین کی صورت یہ ہے کہ پہلی نماز کو مؤخر کر کے اس کے آخر وقت میں پڑھا جائے اور دوسری کواس کے اولی وقت میں پڑھا جائے۔ ہمیں حضرت ابن عمر کی یہ روایت ملی ہے کہ انہوں نے مغرب کی نماز کو غیبوبۃ شفق سے پہلے تک مؤخر کیا اور امام مالک نے اس کے خلاف نقل کیا ہے، اور ہمیں حضرت عمرؓ سے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے اپنے سارے قلمرو میں یہ حکم بھیج دیا تھا کہ لوگ دونمازوں کوایک وقت میں جمع نہ کریں اور سب کوخبردار کردیا تھا کہ دونمازوں کوایک وقت میں جمع کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ایک کبیرہ گناہ ہے۔ ہمیں یہ خبر ذریعہ ثقات علاء بن الحارث سے ان کومکحول سے پہنچی ہے، پھر یہ کہ بلاغ دونوں صحیح ہیں اور شاید روایتِ مالک عن نافع (سار) حتیٰ غاب الشفق) میں غیبوبۃ شفق ثانی مراد ہے، اور مغرب کے آخرِ وقت میں اختلاف مشہور ہے یا ممکن ہے پہلی روایت میں مراد قرب غیبوبۃ شفق ہو، اس طرح نافع کی دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہ ہوگا۔ لہٰذا یہ روایت بھی تاویلِ جمع صوری سے مانع نہ ہوگی۔ اور بالفرض دونوں روایتوں کوجمع کرنا ناممکن ہوتو دونوں ساقط ہوجائیں گی اور پھر باقی روایات پرعمل کریں گے، جوجمعِ صوری پر بلاتامل محمول ہوسکتی ہیں۔ اس سے زیادہ دلائل کی تفصیل معانی الآثار امام طحاوی میں ہے (النکت الطریفہ فی التحدیث عن ردود ابن ابی شیبۃ علی ابن حنیفہ ص ۳۹)

افادۂ انور: ہمارے حضرت الاستاذ شاہ صاحبؒ کی تقاریر درسِ حدیث انوارالمحمود، العرف الشذی فیض الباری اور احقر کے جمع کردہ امالی الشیخ الانور میں اس اہم مسئلہ پر مکمل ومدلل کلام موجود ہے، یہاں ہم اس کاضروری خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ کچھ حضرات نے جمع کی بعض احادیث کے ظاہر پر نظر کر کے سفر میں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کوکسی ایک کے وقت میں جمع کر کے پڑھنے کومطلقاً جائز قرار دیا ہے، یہ قول امام شافعی، امام احمد، اسحق، اور امام مالک کا ایک روایت میں ہے۔
دوسرا قول امام مالک کامشہور روایت میں ہے کہ جب تیز رفتاری سے سفر ہورہا ہوتو جمع جائز ہے۔ تیسرا یہ کہ سفر جلد طے کرنے کے لئے جائز ہے، یہ قول مالکیہ میں سے ابن حبیب کا ہے، چوتھا یہ کہ جمع کرنا مکروہ ہے، محقق ابن العربی نے کہا کہ یہ مصریین کی روایت ہے امام مالکؒ سے، پانچواں یہ کہ جمع تاخیر جائز ہے، جمع تقدیم جائز نہیں، اس کوابن حزم نے اختیار کیا ہے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ سفر کی وجہ سے مطلقاً جائز نہیں، اور وہ صرف عرفات ومزدلفہ میں جائز ہے، یہ قول حسن، ابن سیرین، ابراہیم نخعی، اسود، امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب کا ہے، اور بروایت ابن القاسم امام مالک کا بھی مختار مذہب ہے۔ تلویح میں ہے کہ امام ابوحنیفہ واصحاب کا مسلک ان دونوں مقام مذکور کے علاوہ عدمِ جواز جمع کا ہے، اور یہی قول حضرت عبداللہ بن مسعود، سعد بن ابی وقاص، ابن عمر، ابن سیرین، جابر بن زید، مکحول، عمرو بن دینار، ثوری، اسود واصحاب، عمر بن عبدالعزیز، سالم ولیث بن سعد کا ہے، صاحبِ تلویح نے یہ بھی لکھا کہ علامہ محدث نووی کا یہ قول کہ امام ابویوسف وامام محمد نے اس مسئلہ میں امام اعظم کی مخالفت کی ہے اور امام شافعی واحمد کی موافقت کی ہے۔ اس کوصاحب الغایہ نے شرح ہدایہ میں رد کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

ایک مغالطہ کا ازالہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ان کا یہ رد صحیح ہے کیونکہ ہمارے حضرات ہمارے ائمہ ثلاثہ کا حال زیادہ جانتے ہیں۔ حافظؒ نے بھی یہی تحقیق کی ہے (فتح ص ۳۹۲/۲)۔

دلائلِ حنفیہ: مجوزین (شافعیہ وغیرہم) نے ظہواہر حدیث سے استدلال کیا ہے اور مانعین (حنفیہ وغیرہم) کا استدلال قول باری تعالیٰ۔ حافظوا علی الصلوات (نمازوں کواپنے اوقات میں ادا کرو) اوران الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا (یعنی نمازوں کے وقت مقرر ومتعین ہیں، ابتدا کا وقت بھی مقرر ہے کہ اس پر تقدیم جائز نہیں اور انتہا کا بھی متعین ہے کہ اس سے مؤخر کرنا جائز نہیں، اور جن

روایات سے جمع فی السفر معلوم ہوتا ہے وہ جمع فعلی وصوری پر محمول ہیں، کہ سفر میں سہولت کے لئے پہلی کو آخر وقت میں اور دوسری کو اول وقت میں پڑھا تو یہ فعل صرف صورۃً جمع کا تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی اس صراحت کے بعد کہ ہر نماز کا وقت الگ مقرر ہے، کسی نماز کو دوسری نماز کے وقت میں پڑھنا مشروع نہیں ہوسکتا، دوسرے معنی جمع کے یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے سفر کی وجہ سے دو نمازوں کی، درمیانی موکدہ سنتیں نہ پڑھی ہوں گی، اگرچہ درمیان میں فصل ضرور کیا ہوگا۔ اور اسی کو راویوں نے جمع کے لفظ سے ادا کردیا۔

امام محمدؒ سے مروی ہے کہ وہ سفر میں سنتیں نہ پڑھتے تھے، اور بعض صحابہ حضرت ابن عمر وغیرہ سے بھی ایسا ثابت ہے اور اس کی تائید احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے مثلاً مسلم کی حدیث ابن عباسؓ کہ حضور علیہ السلام نے ظہر وعصر کو مدینہ میں بلا خوف وسفر کے جمع کیا۔ اور ایک روایت مسلم میں من غیر خوف ولا مطر بھی ہے۔ راوی حدیث سعید نے حضرت ابن عباس سے سوال کیا کہ ایسا کیوں کیا تو فرمایا تاکہ امت پر تنگی وسختی نہ ہو، اور ایک روایت میں ابن عباس سے یہ بھی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ نمازیں اور سات نمازیں ایک ساتھ پڑھیں، راوی ابوالشعثاء (حضرت جابر بن زید) نے حضرت ابن عباس سے کہا کہ میرا خیال ہے آپ نے ظہر کی نماز کو مؤخر کیا ہوگا۔ اور عصر کو جلدی پڑھا ہوگا، اور ایسے ہی مغرب کی نماز کو مؤخر کر کے عشاء کی نماز جلدی پڑھی ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت انسؓ سے بھی روایت ہے کہ جب حضور علیہ السلام کو کسی سفر میں عجلت مقصود ہوتی تو آپ مغرب کی نماز کو مؤخر فرمادیتے تاکہ عشاء کے ساتھ پڑھیں اور ظہر کی نماز کو مؤخر کر کے عصر کی اول وقت میں پڑھ لیا کرتے تھے۔

(فتح الملہم ص ۲۶۸/۲۶۱ جلد دوم میں بھی عمدہ بحث وتحقیق اس مسئلہ کی قابل مطالعہ ہے)۔

امام ترمذی کی تائید

امام ترمذی نے آخر کتاب میں لکھا کہ میری کتاب میں کوئی حدیث ایسی نہیں ہے، جس کے معمول بہ نہ بنانے پر امت نے اتفاق کیا ہے، بجز دو حدیثوں کے، ایک تو حدیث ابن عباس جس میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے مدینہ کے اندر بلاخوف وسفر وبلاخطر کے نمازوں کو جمع فرمایا۔ دوسری حدیث چوتھی بار شراب پینے والے کو قتل کرنے کی ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث ابن عباس پر عمل حنفیہ ہی نے کیا ہے، جنہوں نے اس کے معنی کو سمجھا کہ پہلی نماز آخر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی گئی تھی۔ یا یہ کہ حضور علیہ السلام نے دونوں نمازوں کے درمیان سنتوں کا فصل نہیں کیا تھا، لہٰذا اس کو راویوں نے جمع سے تعبیر کیا، اگرچہ وہ دونوں اپنے اپنے وقتوں میں پڑھی گئیں۔ اور یہی مراد اس سے ہے کہ امت کو تنگی سے بچا کر سہولت کی صورت بتلادی۔

علامہ شوکانی کا رجوع

حضرتؒ نے فرمایا کہ پہلے شوکانی بھی جمع وقتی کے قائل تھے، پھر اس سے رجوع کیا اور رسالہ تصنیف کیا "تشنیف السمع یا بطال ادلة الجمع" اور خوب تفصیل سے ثابت کیا کہ حدیث ابن عباسؓ جمع فعلی وصوری پر محمول ہے۔ (انوار المحمود ص ۱/۳۹۴) واضح ہو کہ صاحب تحفۃ الاحوذی نے بحث جمع میں علامہ شوکانی کے رجوع وتصنیف مذکور کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

قاضی عیاض کا ارشاد

آپ نے لکھا کہ احادیث سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام کی اکثری عادت جمع کی نہ تھی اور اس لئے شافعیہ نے کہا ہے کہ ترک جمع افضل ہے، اور امام مالکؒ سے ایک روایت میں مکروہ بھی آیا ہے۔ پھر یہ کہ احادیث جمع سے تخصیص ہوتی ہے حدیث اوقات کی جس

میں حضرت جبریل نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ نے اعرابی کو نمازوں کے اول وآخر اوقات کو بتلایا تھا اور آخر میں فرمایا کہ وقت ان دونوں کے درمیان ہے (فتح الباری ص ۳۹۴/۲) اوجز ص ۵۱/۲ میں محدث زرقانیؒ سے نقل ہوا کہ شافعیہ و مالکیہ نے ترکِ جمع کو مسافر کے لئے افضل قرار دیا اور امام مالک سے ایک روایت میں کراہت بھی منقول ہے۔

مقصدِ امام بخاری وتائید حنفیہ

حضرتؒ نے فرمایا: میرے نزدیک یا تو امام بخاری نے جمع صوری یا فعلی کو اختیار کیا ہے یا کسی ایک جانب کا حکم نہیں کیا۔ کیونکہ اس باب جمع بین الصلاتین میں یا تو انہوں نے بعینہٖ لفظ حدیث پر ترجمہ قائم کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر پائے، ورنہ حسب عادت اپنی رائے ظاہر کرنے کو کوئی لفظ بڑھاتے، جیسے کہ اختلافی مسائل میں وہ کیا کرتے ہیں، یا ترجمہ وعنوان تاخیر کا قائم کرتے، یا تاخیر صلوٰۃ والا ترجمہ قائم کیا ہے، اور کسی نماز کو مؤخر کر کے دوسری نماز کے وقت سے قریب کر کے جمع کر کے پڑھنا یہی حنفیہ کا مسلک ہے۔
لہٰذا حنفیہ کی تائید ہوئی پھر یہ بھی ہے کہ امام بخاری نے جمع تاخیر کی تصویب کی اور جمع تقدیم کو معلل خیال کیا، اسی لئے تاخیر ظہر الی العصر کا باب قائم کیا اور تقدیم کا باب نہیں قائم کیا۔ ابوداؤد نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ جمع تقدیم میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے، جب کہ اس کو بعض ائمہ نے اختیار کیا ہے۔ اور مالکیہ نے تصریح کی ہے کہ جمع تاخیر والی صورت فعلی ہے فقط، اور تقدیم والی وقتی ہے، لہٰذا امام بخاری کے کلام سے جمع تقدیم وقتی کی نفی مفہوم ہوئی، اور تصریح مالکیہ سے جمع تاخیر وقتی کی نفی ثابت ہوتی ہے اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے کہ صرف جمع فعلی وصوری مشروع ہے، جمع حقیقی ووقتی مشروع نہیں ہے، بجز موقع حج کے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد بھی اوپر ذکر ہوا ہے کہ میں نے کبھی بھی حضور علیہ السلام کو دو نمازیں ایک وقت میں جمع کرتے ہوئے نہیں دیکھا بجز حج کے۔

انوار المحمود ص ۳۹۵/۱: میں ہے کہ "حضرت ابن مسعودؓ کا یہ اثر موطأ مالک، بخاری، ابوداؤد و نسائی میں ہے، اور ان کا جمع وقتی سے مطلقاً انکار کرنا، حالانکہ وہ خود بھی حضرت ابن عباس وغیرہ کی طرح حدیث جمع بالمدینہ کے راوی ہیں، اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ مدینہ طیبہ میں بھی صرف جمع صوری تھا اور دوسرے مواقع میں بھی بجز موقع حج کے کیونکہ اگر وہ جمع وقتی ہوتا تو ابن مسعود کی دونوں روایتوں میں تعارض ہو جاتا، اور حدیثِ ابن مسعود کی روایت نسائی میں ذکرِ عرفات بھی مصرح[1] ہے۔ لہٰذا جمع وقتی کو صرف عرفات ومزدلفہ پر...... محصور رکھیں گے۔ نیز ابن جریر کی تخریج سے جو حضرت ابن عمرؓ کا اثر ہے وہ بھی صرف جمع صوری وفعلی پر دال ہے۔"

اوجز المسالک (ص ۵۰/۱ تا ص ۶۲/۲): میں بھی دلائل حنفیہ کی بہتر تفصیل ہے، جس میں رجال ومتونِ حدیث پر بھی مختصر مگر جامع کلام قابلِ مطالعہ ہے۔

اشتراکِ وقت وافادۂ انور

یہاں حضرتؒ کی خاص تحقیق بابت اشتراکِ وقت نہایت اہم اور قابلِ ذکر ہے، فرمایا کہ مثلاً اول ظہر کے لئے خاص ہے اور مثل ثالث عصر کے لئے اور دوسرا مشترک ہے، جس میں دونوں نمازیں صحیح ہو سکتی ہیں، صرف دونوں میں فصل ہونا چاہئے اور وہ بھی سفر و مرض وغیرہ اعذار کی وجہ سے رفع ہو جاتا ہے، امام طحاویؒ نے بھی ایک جماعتِ سلف سے اس کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ بیانِ وقت کے باب میں مستحب و غیر مستحب وقت لکھتے ہیں مثلاً وقتِ عصر کو غروبِ شمس تک کہہ کر پھر آخر وقت میں نماز کو مکروہ بھی کہتے ہیں۔

العرف الشذی ص ۷۶ میں ہے کہ "...... اشتراکِ وقت ثابت ہے بعض سلف سے کما قال الطحاوی، اور ثابت ہے ائمہ ثلاثہ امام مالک،

---

[1] عجیب بات ہے کہ علامہ محدث نوویؒ نے بھی اعتراض کیا تھا کہ تم کس طرح مغرب وعشا کو عرفہ میں جمع کرتے ہو جبکہ حدیث ابن مسعود میں اس کا ذکر نہیں ہے؟ حالانکہ نسائی کی روایت میں اس کا ذکر موجود ہے جو ان کے سامنے نہ ہوگی واللہ تعالیٰ اعلم (العرف الشذی ص ۷۹)

امام شافعیؒ واحمدؒ سے۔ اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ جو عورت آخر وقتِ عصر میں پاک ہو تو اس کو ظہر وعصر دونوں کی قضا کرنی پڑے گی اور جو آخر وقتِ عشا میں پاک ہو تو............ اس کو مغرب وعشاء دونوں کی قضا کرنی پڑے گی، تو یہ حکم انہوں نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کے اندر اشتراک وقت ہی کی وجہ سے دیا ہے ورنہ دو وقتوں کی قضا کا حکم کیسے دے سکتے تھے؟! نیز ملاحظہ ہو معارف السنن باب مواقیت الصلوٰۃ جلد دوم اور بدایۃ المجتہد ص ۱/۸۰ در بیان اوقات صلوٰۃ لاہل الضرورۃ وص ۱/۸۴ وص ۱/۸۵)۔

امامِ طحاوی کی منقبتِ عظیمہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ سب سے پہلے مذاہب صحابہ کو امام طحاویؒ نے مدون کیا ہے اور کتاب اختلاف العلماء تصنیف کی، نیز محمد بن نصر، ابن جریر، ابن المنذر اور ابو عمرو نے، ان کے بعد دوسروں نے بھی مگر، اس باب میں امام طحاوی پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔

امامِ اعظم کی منقبتِ عظیمہ

امام صاحب کی فنِ حدیث میں مسابقت تو سب کو معلوم ہے، کیونکہ آپ کی کتب الآثار کے ۲۲۔۲۳ نسخے محدثین کبار کی روایت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اور آپ تابعی تھے، امام مالک کی موطأ وغیرہ بھی آپ کے بعد کی ہیں۔ آپ کی روایات میں ثنائیات بھی بہ کثرت ہیں اور ثلاثیات تو اور بھی زیادہ ہیں، بلکہ کچھ وحدانیات بھی ہیں، اور فقہ میں تو امام شافعی ومالک وغیرہ سب ہی ان کے تقدم وتفوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ہمیں یہاں یہ بتانا ہے کہ علمِ اصول وعقائد وکلام میں بھی آپ ہی سب سے مقدم وفائق تھے۔ اور علامہ ماتریدی حنفی (مشہور ومعروف متکلم اسلام) دو واسطوں سے آپ ہی کے تلمیذ تھے۔ جن کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے اعتراف کیا کہ حق تعالیٰ کے لئے صفت تکوین ثابت کرکے انہوں نے بہت سے اعتراضات سے بچا دیا ہے اور امام بخاریؒ نے بھی اس صفت کو تسلیم کیا ہے، جبکہ دوسرے مشہور متکلم اسلام علامہ اشعریؒ نے اس صفت کو الگ سے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور اسی لئے بہت سے متکلمانہ اعتراضات وارد ہوئے ہیں۔ پوری بحث صحیح بخاری کتاب التوحید میں آئے گی ان شاء اللہ۔ واللہ الموفق۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن حجر کا یہ اعتراف باوجود حنفیہ سے تعصب کے قابلِ قدر ہے۔ اور امام بخاری کا مرتبہ حدیث ورجال میں بہت اعلیٰ ہے، مگر علمِ اصول وعقائد میں وہ بھی امام اعظمؒ سے مستغنی نہیں ہوسکے۔ آگے تفصیل ملاحظہ ہو۔

امام بخاری وحافظ کا خراجِ عقیدت امام اعظمؒ کیلئے

امام بخاری نے "باب ماجاء فی تخلیق السماوات والارض وغیرها من الخلائق (ص ۱۱۱۰) کے عنوان میں آگے لکھا۔ هُوَ الخالق المكنون غير مخلوق وما كان بفعله وامره وتخليقه وتكوينه فهو مفعول مخلوق مُكوَّن.

اس پر حافظ ابن حجر نے پوری تفصیل سے کلام کیا ہے کہ حق تعالیٰ کی صفتِ فعل کو ایک جماعت سلف نے قدیم کہا ہے، ان میں امام ابوحنیفہ بھی ہیں۔ اور دوسروں نے جن میں ابن کلاب واشعری ہیں حادث کہا ہے آگے حافظ نے دونوں کے دلائل ذکر کرکے لکھا کہ امام بخاریؒ کا اس موقع پر تصرف وتفصیل مذکور واضح کر رہا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہ وغیرہ کے قولِ اول کی موافقت کی ہے، اور بات بھی یہ ہے کہ اس شق کو اختیار کرنے والا حوادث لا اول لہا" کی دلدل میں پھنسنے سے محفوظ رہتا ہے، وباللہ التوفیق، آگے لکھا کہ ابن بطال نے بھی امام بخاریؒ کی غرض ومراد واضح کی ہے، مگر وہ ان کی پوری بات کی طرف نہ جاسکے، جس کی طرف امام بخاریؒ نے اشارہ کیا ہے، (اور ہم نے اس کو واضح کیا ہے، فلله الحمد علی ما انعم۔ (فتح الباری ص ۱۳/۳۴۰) طبع خیریہ مصر ۱۳۲۹ھ۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ابن کلاب کے تتبع میں حوادث لا اول لہا کا قول اختیار کیا ہے، جس پر اکابرِ علماءِ امت نے ان پر

مفصل نقد ورد کیا ہے۔ اور حافظ نے بھی فتح الباری ص ۳۱۹/۱۳ میں پورا رد کیا ہے اور لکھا کہ علامہ ابن تیمیہ کی طرف جو تفردات منسوب ہیں یہ ان مسائل میں سے بہت ہی شنیع تر مسئلہ ہے اور اس کا صریح ردامام بخاری کی حدیث الباب سے بھی ہوتا ہے۔ وللتفصیل محل آخر۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

باب صلوٰۃ القاعد

اس کے مسائل وابحاث عام طور سے کتابوں میں شائع شدہ ہیں اور کوئی خاص اہم اختلافی بحث یہاں قابلِ ذکر نہیں ہے۔ البتہ کتب فقہ میں عام طور سے قاعداً نماز میں رکوع کی کیفیت واضح طور سے مذکور نہ ہونے کی وجہ سے علماء کو بھی دیکھا کہ غلطی کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر عوام بھی۔ صحیح اور مفصل کیفیت کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں دیکھی کہ مصلی قائماً اور مصلی قاعداً دونوں کے رکوع کو الگ کر کے بتلایا ہے یعنی حنفیہ کے نزدیک بیٹھ کر نماز پڑھنے والا رکوع میں صرف اتنا جھکے گا کہ اس کا سر گھٹنوں کے محاذی ہو جائے، اور شافعیہ وغیرہم کے نزدیک اس سے زیادہ کہ گھٹنوں سے آگے تک جھکے۔ مگر کسی کے نزدیک بھی سرین اٹھا کر جھکنے کی صورت مشروع نہیں ہے جو بہت سے لوگ مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں۔ یا بعض علماء کو مغالطہ رکوع قائماً سے ہوا ہے کہ اس میں پیٹھ اور سر کو رکوع میں برابر کرنے کا حکم لکھا ہے۔ صلوٰۃ قاعداً کے مسائل صلوٰۃِ مریض میں لکھتے ہیں لیکن قائماً وقاعداً رکوع کو الگ الگ زیادہ تفصیل سے صرف کتابِ مذکور میں دیکھا گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

حقیقی جمع بین الصلاتین شرعاً ممنوع ہے

(۱) لقولہ تعالیٰ **ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا** (۲) **حافظوا علی الصلوات الا ولاء فی اوقاتها** (۳) حضور علیہ السلام اور حضرت جبریل نے پانچوں وقت الگ الگ بتائے (مسلم وترمذی وابوداؤد) (۴) حدیث ابوقتادہ مرفوعاً کہ وقتِ نماز کے بعد تفریط کا مرتکب ہوگا، (مسلم) (۵) حدیثِ ابنِ عباس ''کہ بغیر عذر کے جمع کرنا گناہ کبیرہ ہے (ترمذی) (۶) حضرت ابوموسیٰ سے بھی ایسا ہی مروی ہے (ابن ابی شیبہ) (۷) حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے عرفات ومزدلفہ کے علاوہ کبھی غیر وقت میں کوئی نماز نہیں پڑھی۔ (نسائی) (۸) حضرت ابن مسعود نے صرف جمع صوری وفعلی کی روایت کی ہے۔ (ابن ابی شیبہ والطبرانی) (۹) حضرت عائشہ، حضرت انس وحضرت ابن عمر وغیرہ سے بھی صرف جمع فعلی وصوری ہی مروی ہے۔ (طحاوی واحمد وغیرہ) (۱۰) حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ تفریط کسی نماز کو اتنا مؤخر کرنا ہے کہ دوسری کا وقت آ جائے۔ (طحاوی) (۱۱) حضرت عمرؓ نے تمام قلمرو میں اعلان کرادیا تھا کہ کوئی جمع بین الصلوتین نہ کرے اور یہ کہ وہ گناہ کبیرہ ہے۔ (موطا امام محمدؒ)۔

(کتاب التہجد) بخاری ص ۱۵۱ تا ص ۱۶۵

(تہجد ونوافل کے بیان میں ۳۷ باب ۶۱ حدیث، فضل المساجد میں ۶ باب ۸ حدیث، ابواب العمل فی الصلوٰۃ میں ۱۸ باب ۳۶ حدیث اور سہو میں ۹ باب ۱۴ حدیث ہیں کل ۷۰ باب اور ۱۰۹ حدیث)

تہجد، ہجود سے ہے جس کے معنی سونے اور بیدار ہونے کے دونوں ہیں، چونکہ نمازِ تہجد سونے کے بعد آخر لیل میں پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کا نام تہجد ہوا۔ اس لحاظ سے سونے سے قبل کی نماز کو تہجد نہیں کہیں گے، مگر مشکوٰۃ شریف ص ۱۱۳ باب الوتر میں حدیث وارد ہے کہ یہ سہر (بیداری) مشقت کی چیز اور طبائع پر بھاری ہے، اس لئے اگر کوئی شخص بعد عشاء وتر کے بعد دو رکعت پڑھ لے، وہ اگر رات کو نہ بھی اٹھ سکے گا تو وہ اس کے لئے قیام لیل اور تہجد کی جگہ کافی ہوں گی (دارمی) دوسری حدیث ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دو رکعت وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھتے تھے، جن میں سورۂ اذا زلزلت اور قل یایہا الکافرون پڑھتے تھے (رواہ احمد)

اس سے معلوم ہوا کہ وتر کے بعد کی دو نفل اگر اتباعاً للنبی الکریم بیٹھ کر پڑھے گا تو امید ہے کہ نصف نہیں بلکہ پورا ثواب ملے گا۔ کیونکہ آپ نے یہ نفل ہمیشہ بیٹھ کر ہی پڑھے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

غرض یہ سونے سے قبل کے نفل تہجد حکمی ہیں۔ ورنہ جو نفل سونے سے قبل پڑھے جائیں وہ صلوٰۃ اللیل کہلاتے ہیں اور بعد کے تہجد۔ حنفیہ کے نزدیک وتر کا حکم الگ ہے، جبکہ شافعیہ کے نزدیک صلوٰۃ اللیل اور وتر متحد ہیں دوسری تفصیل کتاب الوتر میں گزر چکی ہے۔ امام بخاری نے الگ وتر کا باب باندھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس کو الگ کرتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ راویوں کے نظریات و تعبیرات کی وجہ سے بھی دوسرے حضرات نے مسائل اخذ کر لئے ہیں، حنفیہ نے اس بارے میں احتیاط کی ہے اسی لئے ان کے فیصلے تمام متونِ احادیث و اسناد و رجال پر نظر کرنے کے بعد ہوتے ہیں۔

افادۂ انور: قوله تعالیٰ ومن الليل فتهجد به نافلة لک: اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ تہجد حضور علیہ السلام پر واجب نہ تھا۔ بلکہ آپ پر صلوٰۃ اللیل فرض و واجب ہی تھی، پھر وہ منسوخ بھی نہیں ہوئی۔ البتہ اس حکم میں نرمی و آسانی کر دی گئی (جس کو نسخ سمجھ لیا گیا) وہ اس طرح کہ اس کے کچھ حصہ کو تو موکد رکھا گیا۔ اسی لئے اس کی قضا واجب رکھی گئی اور اس کا نام الگ سے وتر ہوا اور اس کا وقت بھی آخر لیل ہوا، اس کے لئے جس کو بیدار ہونے پر بھروسہ ہو، ورنہ اول لیل میں بھی پڑھنے کی آسانی کر دی گئی۔

قوله قال اللهم لک الحمد: فرمایا کہ غالباً حضور علیہ السلام نیند سے بیدار ہو کر یہ دعا وضو سے پہلے پڑھتے تھے۔

باب فضل قيام الليل: اس میں حضرت ابن عمرؓ کا مسجد میں مستقل طور سے سونے کا بھی ذکر ہے، حضرت نے فرمایا کہ یہ وہ وقت تھا کہ وہ اپنے لئے مکان بنانا چاہتے تھے، مگر کسی نے مالی مدد نہ کی، لہٰذا ایسے شخص کے لئے مسجد میں سونے میں کوئی حرج بھی نہیں۔

باب طول السجود فی قيام الليل: اس میں ذکر ہے کہ حضور علیہ السلام شب کی نماز میں اتنا طویل سجدہ کرتے تھے کہ اتنی دیر میں تم پچاس آیتیں پڑھ سکتے ہو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ تہجد کی نماز تنہا پڑھتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو اقتدا کرنے سے بھی روک دیا تھا۔ بخلاف دوسری پانچ نمازوں کے جن میں آپ مقتدیوں کی رعایت سے ہلکی نماز پڑھتے تھے، اس لئے آپ کی نماز تہجد کو قرآن مجید میں نافلہ کہا گیا ہے کہ نافلہ اور مالِ غنیمت خمس میں کوئی آپ کا شریک نہ تھا اور پانچ نمازوں میں باقی مالِ غنیمت کی طرح سب مجاہدوں کے لئے حصے تقسیم ہوتے تھے، اسی لئے نفل نماز میں جماعت نہیں ہے، کیونکہ اس میں دوسروں کا حصہ نہیں ہے، اور وہ آپ کا ایک انفرادی عمل تھا۔

اسی وجہ سے حنفیہ کے یہاں تہجد میں تداعی کے ساتھ جماعتِ نفل مکروہ ہے اور تداعی عرف عام میں یہ ہے کہ لوگوں کو اس کے لئے بلایا جائے، باقی حنفی مفتیوں نے جو آدمیوں کی تعداد وغیرہ لکھی ہے، وہ اس عمل کو زیادہ بڑھنے سے روکنے کے لئے ہے اور وہ صاحب مذہب سے منقول بھی ہے۔

فرمایا کہ امام نسائی نے ایک باب قائم کر کے یہ بتلایا ہے کہ یہ سجدۂ طویل نماز میں نہ تھا جبکہ الگ سے تھا میرے نزدیک یہ صواب نہیں ہے، بلکہ وہ نماز ہی کے اندر تھا۔ امام نسائی نے اسی طرح اور بھی تین چار جگہ غلط ترجمہ باندھا ہے، پھر یہ کہ شافعیہ کے نزدیک الگ سے سجدہ بھی مختلف اوقات میں مستحب مانا گیا ہے، حتیٰ کہ غیر موضع شکر میں بھی مگر ہمارے نزدیک اس کی کوئی اصل نہیں ہے، البتہ کتابوں میں سجدۂ شکر کے لئے دو قول ہیں اور جواز سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم تراویح و وتر کے بعد جو لوگوں کی عادت سجدہ کرنے کی ہو گئی ہے اس سے کبیری شرح المنیہ میں روکا گیا ہے۔

باب تحريض النبی صلے اللہ علیہ وسلم علےٰ قيام الليل والنوافل من غير ايجاب

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کے کلام سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ صلوٰۃ اللیل ان کے نزدیک پوری طرح منسوخ نہ ہوئی تھی اور یہی میرا اختیار ہے۔ جبکہ مسلم و ابوداؤد سے اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

حدثنا مقاتل: یہ امام بخاری کے استاذ حدیث حنفی ہیں جو فقہی مسائل حنفیہ کی روایت بھی کرتے ہیں، یہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے شاگرد ہیں، جو امام ابوحنیفہؒ کے حدیث وفقہ میں تلمیذِ خاص تھے۔

قوله فاذاشاء ان یبعثنا بعثنا: یہی قصہ نسائی میں اس طرح ہے: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام رات میں میرے اور فاطمہ کے پاس آئے، اور ہمیں تہجد کی نماز کے لئے اٹھایا (پھر اپنے گھر چلے گئے اور کچھ رات تک نماز پڑھتے رہے اور ہمارے جاگنے اور نماز تہجد پڑھنے کی کوئی آواز نہ سنی تو پھر لوٹ کر آئے اور ہمیں اٹھایا اور فرمایا کہ تم دونوں نماز کیوں نہیں پڑھتے) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنی آنکھوں کو ملنے لگا (تاکہ نیند کا غلبہ کم ہو) اور میں نے کہا واللہ ہم تو صرف اتنی ہی نماز پڑھ سکتے ہیں جتنی ہماری تقدیر میں ہے، اور ہماری جانیں تو حق تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہیں، یہ سن کر آپ لوٹ گئے اور کچھ جواب میں نہ فرمایا، پھر میں نے سنا کہ لوٹتے ہوئے آپ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے یہ آیت تلاوت فرمارہے تھے و کان الانسان اکثر شیء جدلا انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے)۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ خود سے ترکِ عمل اور تقدیر پر بھروسہ کرنا اسی کو قرآن مجید میں جدل سے تعبیر کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے تقدیر پر بھروسہ کرنے کو پسند نہیں فرمایا، کیونکہ اگر کسی شخص کو کسی وقت کسی کام کی قدرت ہی نہ ہو تو وہ عذر صحیح ہے، اور بڑے لوگ کریم النفس اس سے چشم پوشی بھی کر لیتے ہیں۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو باوجود قدرت کے عمل کے لئے تیار بھی نہ کرے۔ اور نہ صرف ہمت کرے، پھر بھی تقدیر کا بہانہ کرے تو وہ مجادل ہے معذور نہیں ہے۔

قوله انی خشیت ان یفرض علیکم

حنفیہ کے نزدیک جو اصول ہے کہ کوئی عبادت شروع کرنے سے واجب ہو جاتی ہے۔ مخالفین نے اس کو کمزور کرنے کی سعی کی ہے، لیکن صاحب بدائع نے (جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ بخارا نے چار صدی میں ایسا حنفی بڑا عالم نہیں نکالا) قاضی عیاض سے نقل کیا کہ شروع فی النفل نذرِ فعلی ہے۔ لہٰذا وہ بھی نذرِ قولی کی طرح واجب ہو جاتی ہے، جیسے تراویح کے بارے میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ تمہارے التزام کی وجہ سے وہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔

قوله کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یصلی من اللیل ثلاث عشرۃ رکعۃ منہا الوتر ورکعتا الفجر

بخاری ص ۱۵۳: حضرتؒ نے فرمایا کہ آثار السنن میں دارقطنی سے ایک رکعت وتر کی حدیث نکالی ہے، حالانکہ وہ متناً وسنداً یہی حدیثِ بخاری ہے، البتہ متن میں وہاں اختصار ہے اور یہاں تفصیل ہے۔

باب عقد الشیطان: رسہ لاتا ہے اور منتر گنڈہ کرتا ہے، اور ان میں "علیک لیل طویل فارقد" پڑھ کر پھونکتا ہے۔ (کذا فی الآثار) وہ رسہ عالم مثال کا ہوگا، جو کو ہماری نظریں نہیں دیکھتیں۔

حدیث نزول الرب اور امام محمدؒ کا ذکرِ خیر

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ خلقِ افعال عباد میں لکھا کہ امام محمد جہمی تھے یعنی جہم کے تبع تھے۔ جو مبتدع اور فرقِ باطلہ سے تھا، حالانکہ چاروں ائمہ کا اجماع نزول کے عقیدہ پر ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ کیف کو مجہول کہا ہے، اور فتح الباری جلد ۱۳ میں خود امام محمدؒ کا قول نقل کیا ہے کہ استواء پر عقیدہ ہے بلا کیف اور جہمیہ کا رد کیا ہے۔ پھر بھی امام بخاریؒ ان کو جہم ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، فیا للعجب! پس جو ذرا بھی خلاف رائے ہوا اسی کی جرح کر دی گئی ہے لہٰذا میں کہتا ہوں کہ امام بخاری نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ نادرست اور غلط محض ہے۔

باب فضل الطهور فی اللیل والنہار

حضرتؒ نے فرمایا: یہ ترجمۃ الباب ابواب طہارۃ کے لئے موزوں تر تھا، مگر امام بخاری اس کو نماز کے باب میں اس لئے لائے ہیں کہ وہ تحیۃ الوضوء ثابت کرنا چاہتے ہیں ہمیشہ باوضو رہنا سلاح المومن ہے، کیونکہ شیطان نجاسات واوناث سے مانوس ہوتا ہے اور طہارت و پاکیزگی سے نفرت کرتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ جب آدمی باوضو رہتا ہے تو رات دن کی نمازیں اس سے فوت نہیں ہوتیں، اور شافعیہ نے تو اتنا توسع کیا کہ اوقات مکروہہ میں بھی نماز کی اجازت دے دی، امام بخاری نے یہ توسع نہیں کیا کیونکہ طلوع شمس کے وقت مطلق نماز سے روک دیا، البتہ بعد عصر اور بعد الصبح میں نرمی اختیار کی ہے۔

حضور علیہ السلام بھی ہر وقت باوضو رہتے تھے، اور آپ سے اوائل لیل میں جنابت پر سونا بھی ثابت نہیں ہے، یا تو وضو غسل کیا یا تیمم کیا ہے۔ البتہ اواخر شب میں کچھ دیر کا اضطجاع ثابت ہے۔

باب ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ

حضرتؒ نے فرمایا: غیر مقلدین جو بلا علم و عمل کے عمل بالحدیث کا دعویٰ کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا اکثار فی العبادۃ بدعت ہے، مولانا عبدالحئی لکھنویؒ نے اس کے جواب میں رسالہ لکھا ہے، لیکن وہ اس کے مرد میدان نہیں ہیں، البتہ نقل خوب کر سکتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کیا قرآن مجید میں **کانوا قلیلا من اللیل مایھجعون** اور **وما خلقت الجن والانس الالیعبدون** وغیرہ نہیں ہے؟! اور نسخ کا دعویٰ جہالت ہے۔ پھر اکثار عبادت اور **اجتھاد فی العمل** کی ترغیب میں احادیث وآثار بھی بہ کثرت ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ قصد فی العمل کی بھی ترغیب ہے کہ میانہ روی اختیار کی جائے، اصحاب فہم سلیم ہر چیز کو اپنے درجہ میں رکھتے ہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے لوگوں کی طبائع مختلف بنائی ہیں، کچھ لوگ قوی العزم اور بڑے حوصلہ کے ہوتے ہیں وہ عزائم پر عمل کرتے ہیں اور رخصتوں کو اختیار نہیں کرتے وہ سارے اوقات خدا کی طاعت وعبادت میں صرف کرتے ہیں اور اپنا سارا مال بھی خدا کی راہ میں صرف کر دیتے ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کر کے اپنی جانیں بھی قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن ایسے کم لوگ ہوتے ہیں، اس لئے ایسے لوگ زیادہ ملیں گے جو دین کی آسانیوں اور رخصتوں پر عمل کرتے ہیں، اسی لئے شریعت کے اکثر احکام ان ہی کے مطابق ملیں گے چنانچہ ان پر پانچ وقت کی فرض نماز ہے اور ساری دنیا کی مال و دولت بھی جمع کرنا جائز ہے بشرطیکہ زکوٰۃ ادا کریں، اور ایسے لوگوں کی رعایت سے ہی یہ بھی ہوا کہ ان کے لئے یہ پسند کیا گیا کہ خواہ تھوڑا عمل کریں مگر ہمیشگی کے ساتھ کریں، اور اپنی ہمت وحوصلہ زیادہ نہ دیکھیں تو عبادتوں میں زیادتی نہ کریں، تاکہ زیادہ عمل سے اکتا نہ جائیں۔

اسی لئے شریعت نے یہاں تک طبائع کی رعایت کی ہے کہ جس کو آخر شب میں جاگنے کا بھروسہ نہ ہو وہ وتر کو موخر نہ کرے، حالانکہ وہ افضل ہے، غرض کہ آثار عبادت بدعت نہیں ہے، انبیاء واولیاء نے بھی آثار کیا ہے۔ اور وہ درست بلکہ مطلوب بھی ہے۔

ظالم کے لئے بددعا جائز ہے

حضرت تھانویؒ نے حدیث مشکوٰۃ کی وجہ سے فتویٰ دیا تھا کہ ظالم کے لئے بددعا کرنا ناجائز ہے، میرے پاس استفتا آیا تو میں نے لکھا کہ حدیث کا منشا یہ ہے کہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر صرف بددعا میں لگے رہو اور ظالم کے پنجہ سے رہا ہونے کی تدبیر نہ کرو یہ نہ ہونا چاہئے، اس لئے حدیث سے عدم جواز ثابت نہیں ہوتا۔

قولہ من العشر الاواخر

حدیث کی مراد یہ ہے کہ طاق راتوں میں تو عبادت کرو ہی، باقی تمام عشرہ ہی میں اعتکاف کرو اور عبادت بھی بقیہ راتوں میں کرو۔

یعنی سب عشرہ کی عبادت مقصود ہے (وتر راتوں کی رعایت سے) نہ صرف طاق راتوں کی۔ یہ مراد دوسرے لوگ نہیں سمجھ سکے۔

فاتحہ خلف الامام کی آخری تحقیق

اسی طرح فاتحہ خلف الامام میں میں نے توجیہ وہ کی ہے جو ۱۳ سو برس میں نہیں ہوئی، اگرچہ عمل تو امت کا پہلے بھی درست تھا۔
وہ توجیہ یہ ہے کہ پہلے اصل مسئلہ تو نہ پڑھنا ہی تھا، اور پڑھنے کی ابتداو فہمائش حضور علیہ السلام کی طرف سے نہیں تھی، بلکہ کسی نے فاتحہ خلف الامام کی تو آپ نے اجازت کے درجے میں فرمایا کہ فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے کیونکہ وہ ایسی ہی شان کی ہے۔
غرض بعد کو اس پر چلے کہ جب نہ پڑھنا ہی اصل ہے تو کس درجہ میں ہے اور ذہنی بحثیں شروع ہوگئیں۔ گو مسئلہ متفق علیہ بین الائمہ نہ پڑھنا ہی تھا، کسی نے حرام کہہ دیا اور کسی نے مکروہ وغیرہ لیکن میرے نزدیک جائز ہے، مطلوب نہیں ہے۔ اور اصل مسئلہ کے خلاف ہے۔ مگر وہ حرام وغیرہ اگرچہ کتابوں میں موجود ہے۔ لیکن وہ مذہب نہیں ہے۔ محض بعد کی ذہنی چیزیں ہیں، جو خارج ہیں بنیۂ عمل سے۔ اور مجھے تو یہ بھی یقین نہیں ہے کہ امام شافعی فرضیتِ فاتحہ کے قائل ہوں، جہری میں خلف الامام، مذہب تو صرف اسی قدر تھا کہ ہمارے نزدیک قراءت خلف الامام مشروع نہیں ہے، اور ان کے نزدیک مشروع ہے۔ اور اقوالِ فرضیت و وجوب شوافع کی طرف سے اور کراہت وغیرہ کے اقوال ہماری طرف سے صلب مذہب میں نہیں تھے۔ گو پھر بحث میں آ کر کتابوں میں بھی درج ہوگئے ہیں۔ انتهى ما قال الشيخ الانور بلفظه و لله الحمد۔
(نوٹ) حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ تحقیق آپکے آخری درس بخاری شریف کی بیان کردہ ہے، مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء اور اس سے تقریبا ۸ ماہ بعد آپ نے رحلت فرمائی، تاریخ وفات ۲۹ مئی ۳۳ء مطابق ۲ صفر ۵۲ھ ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔
حضرتؒ کا مشہور و معروف تحقیقی رسالہ ''فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب'' بزمانہ صدارت دارالعلوم دیوبند رجب ۳۸ھ میں تالیف ہوا تھا۔

باب المداومة علی رکعتی الفجر

اسی سے حسن بصری وجوب کے قائل ہوئے ہیں اور ایک روایت امام ابوحنیفہ سے بھی سننِ فجر کے وجوب کی ہے۔

قولہ ورکعتین جالسا

حضرت نے فرمایا کہ ان دونوں رکعت بعد الوتر کا ذکر صحیح بخاری میں یہاں کے علاوہ کہیں نہیں ہے، لیکن اس پر ترجمہ یہاں بھی قائم نہیں کیا، کیونکہ ان کا یہ مذہب نہیں ہے۔ اور امام مالک سے بھی ان میں تردد منقول ہے۔ حالانکہ ان کے بارے میں احادیثِ صحیحہ ثابت ہیں، باقی یہ کہ ان کو حضور علیہ السلام نے قصداً بیٹھ کر پڑھایا اتفاقاً، علامہ نووی نے اتفاقی قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک مختار قصداً ہی ہے کیونکہ ان کا کھڑے ہو کر پڑھنا حضور علیہ السلام سے بالکل ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے ساری عمر کے فعل کو اتفاق پر محمول کرنا بداہت کے خلاف ہے۔
باب الضجعة: حضور علیہ السلام صبح کی سنتوں کے بعد کچھ دیر داہنی کروٹ پر لیٹتے تھے، دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ صبح کی دو سنتیں پڑھ کر تشریف لاتے میں بیدار ہوتی تو مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ وہ نمازِ جماعت کے وقت تک لیٹ جاتے تھے۔
حضرتؒ نے فرمایا کہ امام ابراہیم نخعی کی طرف منسوب کیا گیا کہ وہ اس لیٹنے کو بدعت کہتے تھے، میرے نزدیک وہ اس میں توغل اور مبالغہ سے روکتے تھے، مثلاً اس سے کہ مسجد میں لیٹا جائے، کیونکہ حضور علیہ السلام تو اپنے گھر میں لیٹتے تھے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ وہ لیٹنا فصل کے لئے تھا، لہٰذا جو گھر سے سنتیں پڑھ کر مسجد میں آئے گا اس کے لئے تو فصل یوں بھی حاصل ہوگیا، غرض کہ وہ جائز ہے اور مطلوب بھی نہیں۔ البتہ کوئی حضور علیہ السلام کے اتباع کی نیت سے کرے تو وہ اس لحاظ سے بہتر بھی ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سنن فجر کے بعد باتیں کرنے کو حنفیہ مکروہ کہتے ہیں حتیٰ کہ بعض نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی بات کرے تو پھر سے سنتوں کا اعادہ کرے۔
اور مدونہ میں میں نے دیکھا کہ امام مالک فجر کی سنتوں کے بعد قبلہ سے بھی منحرف نہ ہوتے تھے، حتیٰ کہ فرض پڑھ لیتے تھے اور ان دونوں کے درمیان بات بھی نہ کرتے تھے، میرے نزدیک بات نہ کرنا امرِ مطلوب ضرور ہے، مگر عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم اپنے کلام کو حضور علیہ السلام کے کلام پر قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آپ کے تو تمام افعال عبادت تھے۔

باب ماجاء فی التطوع مثنیٰ مثنیٰ

حضرت نے فرمایا کہ اس بارے میں امام بخاری نے امام شافعیؒ کا مذہب اختیار کیا ہے۔ اور امام طحاوی نے صاحبین کا مذہب اختیار کیا ہے۔ جو مختار ہے امام مالک واحمد کا بھی کہ رات کے نوافل میں دو دو رکعت افضل ہیں، میرے نزدیک بھی یہی دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے، اور یہ اختلاف صرف افضلیت کا ہے۔
باقی دن کی نماز میں صاحبین بھی چار کو افضل کہتے ہیں اور امام ابوحنیفہ دن رات کے سب نوافل میں ایک سلام سے چار افضل فرماتے ہیں۔ علامہ عینی وطحاوی نے مفصل دلائل ذکر کئے ہیں۔ پھر یہ کہ اختلاف صرف اس صورت میں ہے کہ کوئی شخص چار یا زیادہ نوافل پڑھے۔ لیکن جو اول ہی سے صرف دو رکعت پڑھنا چاہے، اس میں اختلاف نہیں ہے۔ لہٰذا امام بخاری کا یہاں باب باندھ کر تحیۃ الوضو اور نماز استخارہ سے استدلال کرنا بے محل ہے کہ اس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔
حضرت شیخ الحدیثؒ نے لکھا کہ اگر امام بخاری کا مقصد یہاں یہ ہو کہ دو رکعت سے کم کی نماز نہیں ہے تو یہ بات شافعیہ وحنابلہ کے خلاف اور حنفیہ مالکیہ کی تائید میں ہوگی۔ کیونکہ ان کے نزدیک بتیرا (ایک رکعت والی نمازِ نفل) ممنوع ہے۔ اور شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک نفل نماز ایک رکعت کی بھی جائز ودرست ہے (حاشیہ لامع الدراری ص ۲/۹۰)۔

قولہ فلیرکع رکعتین من غیر الفریضۃ

یہ نماز استخارہ ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بتلایا کہ اس سے اور بعد والے ابواب سے بھی حنفیہ کے خلاف کوئی حجت قائم نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان سب میں شروع ہی سے دو رکعت کا ارادہ کیا جاتا ہے، سوائے بعض مواضع کے۔
حضرت شیخ الاحدیث نے اس حدیث کی سات لطیف ابحاث ذکر کی ہیں، جو قابلِ مطالعہ ہیں، جن میں سب سے پہلی یہ کہ امام مسلک کے سوا تمام اصحابِ صحاح نے اس کو روایت کیا ہے، اور محدثین نے اس حدیث کی صحت میں کلام کیا ہے، اور باوجود دلائلِ صحت کے بھی امام احمد نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اور کہا کہ استخارہ میں حدیث عبدالرحمٰن منکر ہے۔ (حاشیۂ لامع ص ۲/۹۰)۔

علم حدیث کی دقت وعالی مقام

یہاں سے معلوم ہوا کہ فن حدیث میں کیا کچھ علمی وفنی مشکلات ہیں کہ امام مسلم کے علاوہ پانچوں اعلیٰ مرتبے کے محدثین صحاح مع امام بخاری کے صحیح وقوی سمجھ کر حدیثِ استخارہ کی روایت کرتے ہیں، مگر امام احمد اس کو منکر قرار دے کر تضعیف کرتے ہیں اور یہ ایسا ہی ہے کہ ابوداؤد وترمذی ایسے جلیل القدر محدثین نے ثمانیہ اوعال اور اطیطِ عرش والی ایسی منکر وشاذ احادیث کی روایت کردی، جن پر اعتماد کر کے علامہ ابن تیمیہ وابن القیم ایسے بڑے بڑے حضرات نے ان پر عقائد کی بنیاد رکھ دی، اور یہ نہیں دیکھا کہ ان کے راوی کس درجہ کے ساقط ہیں اور بڑے بڑے محدثین ضعفِ رواۃ کی وجہ سے ان احادیث پر مستقل طور سے نقد وجرح کر چکے ہیں وغیرہ۔

ہمارے اساتذۂ حدیث علامۂ محدث کوثری، علامہ محدث مولانا محمد انور شاہ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس اسرارہم وغیرہ فرمایا کرتے تھے کہ تمام فنون وعلوم میں سب سے زیادہ مشکل فن حدیث ورجال کا ہے جس کی گہرائیوں اور مشکلات کی حد نہیں ہے، اور اسی لئے اس میں بڑے بڑوں تک سے بھی غلطیاں ہوگئی ہیں، افسوس کہ ہم اپنی کم استعدادی کی وجہ سے ان اکابر محدثین وقت سے زیادہ استفادہ نہ کرسکے، بس اتنا ضرور ہے کہ ان حضرات کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ ہمارے سلف ومتقدمین کیسے بلند پایہ ہوں گے، اور اب تو دیکھتے ہی دیکھتے وہ انحطاط آگیا ہے کہ اس کا تصور بھی ۳۔۴ سال قبل نہ ہوتا تھا۔

درجہ تخصص حدیث کی ضرورت

اسی روز افزوں انحطاط کو دیکھ کر راقم الحروف کی تجویز ہے کہ مرکزی دارالعلوم اپنے یہاں تخصص حدیث کا شعبہ ضرور جلد سے جلد قائم کریں، ورنہ کچھ عرصے کے بعد موجودہ باقیات صالحات معدودے چند تخصص کرانے والے حضرات بھی نہ رہیں گے۔ واللہ الموفق۔ اور پھر کیف افسوس ملنا پڑے گا۔

راقم الحروف پاکستان گیا تو وہاں بھی بڑے مدارس عربیہ کے اہل حل وعقد کو اس طرف توجہ دلائی اور یہاں بھی گزارش کرتا رہتا ہوں، خدا کرے اس طرف جلد توجہ ہو۔ والامر الی اللہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ابتداء کے پانچ کلمات دعاء استخارہ کہہ کر اپنی ضرورت وحاجت عرض کرے، جس طرح اسماءِ الٰہیہ لکھ کر تعویذ لکھا کرتے ہیں کہ ان کی برکت سے وہ کام ہوجائے۔ پھر یہ وعدہ ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے لئے خیر وبہتری کی صورت مقدر ومیسر کریں گے اور یہی حضور علیہ السلام کی دعا سکھائی ہوئی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ پڑھنے والا کوئی خواب بھی دیکھے گا یا اس کو کچھ بتلایا جائے گا، اگرچہ ممکن یہ بھی ہے۔

افادۂ علمیہ بابۃ عادۃ امام بخاریؒ

حضرت نے فرمایا کہ یہاں امام بخاری نے ابواب جمعہ کی ایک قولی حدیث بھی اذا دخل احدکم المسجد فلا یجلس حتی یصلی رکعتین پیش کی ہے۔ اس میں پہلے بھی کلام ہوچکا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ محدث دارقطنی نے صحیحین پر ایک سودس استدارک کئے ہیں لیکن میرے نزدیک وہ اکثر قواعد بازی کے ہیں۔ اور متونِ بخاری میں کسی جگہ کلام نہیں کیا سواء اس جگہ کے، اور کہا کہ یہ اصل میں قصۂ سلیک تھا، جس سے راوی حدیث نے مسئلہ نکال لیا، اور حدیث کی روایت بالمعنی کردی، اور اس حدیث کو قولی بنادیا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ دارقطنی کو بھی اس امر پر تنبہ نہ ہوا کہ امام بخاری بھی اس علت پر مطلع ہیں اور اسی لئے اس کو ابواب جمعہ میں نہیں لائے تھے۔ جبکہ وہ مسئلہ حدیث کے قائل بھی ہیں۔ اور اسی علت کی وجہ سے وہاں نہیں لائے تھے۔ اور یہاں غیر باب میں لائے ہیں۔ تاکہ امام ابوحنیفہ کے خلاف رکعتیں کے افضل ہونے پر استدلال کریں۔ جبکہ ہم بتاچکے ہیں کہ یہ صورت اختلاف کی ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں تو صرف دو ہی رکعت پڑھنی ہیں نہ چار یا زیادہ۔ اس لئے یہاں بھی اس حدیث الباب کو پیش کرنا بے محل ہے، یہ امام بخاری کی عادت بہت سی جگہوں میں ظاہر ہوئی ہے جیسے ابھی قریب میں گزرا کہ ایک غیر باب میں حدیث رکعتین بعد الوتر جالساً کو لائے ہیں اور اسی لئے اس پر ترجمہ نہیں قائم کیا جبکہ یہ صریح مسئلہ رکعتان بعد الوتر جالساً کا وہاں سے نکلتا ہے۔

غرض جہاں بھی امام بخاری کو الفاظ حدیث میں سے کسی لفظ میں بھی تردد ہوتا ہے تو خاص اس پر ترجمہ وعنوان قائم نہیں کرتے، اور دوسرے الفاظ پر کرتے ہیں جن میں تردد نہیں ہوتا۔ گویا وہ اس طریقے سے اس لفظ میں اپنے تردد کا اشارہ دیتے ہیں۔ امام بخاری کی اس عادت کی طرف عام طور سے تنبہ نہیں ہوا، لیکن میں نے اس کا خوب تجربہ کیا ہے۔ وھو التحقیق فاحفظہ.

نماز بوقتِ خطبہ؟

حضرت نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اس کے قرائن موجود ہیں کہ حضور نے خطبہ شروع فرمانے سے قبل سلیک کو نماز کا حکم دیا تھا۔

حاصلِ دعاءِ استخارہ

علماء نے لکھا ہے کہ تمام مقدوراتِ الٰہیہ جو انسان کے لئے پیش آتے ہیں، ان کے لئے دو امر کی ضرورت ہے، پہلے سے ہر معاملہ میں خدا پر بھروسہ کہ وہ ہمارے لئے بہتر ہی کرے گا، اور مواقع ہونے کے بعد رضا کہ ہم خدا کی طرف سے آنے والی ہر خیر و شر پر راضی ہیں۔

دعاءِ استخارہ میں بھی اللھم انی استخیرک سے واسئلک من فضلک تک توکل و تفویض ہے، پھر فانک تعلم سے علام الغیوب تک حق تعالیٰ کے علم و قدرت پر یقین کا اظہار ہے، پھر اپنی ضرورت پیش کر کے جلد یا دیر سے حسب مصلحتِ خداوندی قبول کی التجا ہے، اس طرح اس دعا میں توکل، تفویض اور التجاء و رضا بالقضاء سب کچھ ہے، اور یہی ایک مومن کا دینی و دنیوی سرمایہ ہے۔

باب مایقرا فی رکعتی الفجر

فجر کی دو سنتوں میں قراءت کم ہو یا زیادہ؟ اس میں امام طحاوی نے چار مذہب نقل کئے ہیں۔ ظاہر یہ کے کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ بالکل ہی قراءت نہ کی جائے (شاید ان کو حضرت عائشہؓ کے اس ارشاد سے یہ خیال ہوا کہ حضور علیہ السلام صبح کی سنتیں ہلکی پڑھتے تھے، حتیٰ کہ مجھے شبہ ہوتا تھا کہ فاتحہ بھی پڑھی یا نہیں) دوسرا امام مالک کا مشہور مذہب ہے کہ صرف فاتحہ پڑھے اور وہ اسی پر عمل بھی کرتے تھے، اور ایک روایت میں ان کا اور امام شافعی کا مذہب یہ کہ فاتحہ اور چھوٹی سورت پڑھے، چوتھا مذہب ابراہیم نخعی، مجاہد اور حنفیہ کا ہے کہ وقت میں گنجائش ہو تو قراءت کو طویل بھی کرے، اسی لئے امام صاحب نے قرآن مجید کی ۲ منزل بھی پڑھی ہیں (لامع ص ۲/۹۳)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: شامی میں حنفیہ سے نقل کیا کہ امام اگر جماعت شروع کر دے تو مذہب مالک کی طرح سنتوں میں صرف فاتحہ پڑھنا جائز ہے، پھر میں نے مخدوم ہاشم سندیؒ کی بیاض میں دیکھا کہ صاحبِ قنیہ نقول کتبِ معتزلہ سے بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ عقائد میں معتزلی اور فقہ میں حنفی تھے۔ تاہم یہ بات بھی ضرور مدنظر رکھنی چاہئے کہ بعض آفات اعتقاد کی طرف سے بھی آتی ہیں۔

علامہ سندی نے یہ بھی لکھا کہ قنیہ کو ۸۴ کتابوں سے لیا گیا ہے، جن میں ۱۷ معتزلہ کی بھی ہیں اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ جو روایت حنفیہ کے موافق ہو وہ لی جائے، ورنہ چھوڑ دی جائے۔

حضرتؒ کا یہ ارشاد کہ آفت بعض اوقات اعتقاد کی طرف سے بھی آتی ہے، بڑا دور رس افادی جملہ ہے، کیونکہ بہت سے اکابرِ امت کے افادات میں یہ بات دیکھی جاتی ہے، اور مطالعہ کرنے والا حیران ہوتا ہے کہ ایسے اکابر کے مسامحات کی کیا توجیہ کرے، جیسے علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم کے تفردات کہ ان میں بھی بہ کثرت وہ ہیں جو ان کے الگ اعتقادی رجحانات و نظریات کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں۔ لہٰذا "خذما صفا دع ما کدر" کا نسخۂ کیمیا اثر ہی ہر جگہ کام دیتا ہے۔ واللہ المسئول للہدایۃ۔

باب صلوٰۃ الضحیٰ فی السفر

امام بخاری نے اس باب میں ثابت کیا کہ سفر میں نہ پڑھی جائے، پھر دوسرے باب میں پڑھنے کا ثبوت پیش کیا اور نہ پڑھنے کی وسعت دی۔ پھر تیسرے باب میں بحالتِ اقامت پڑھنے کی تاکید ثابت کی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ صلوٰۃ الضحیٰ کی احادیث سے امام بخاری اپنا مدعا ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ ابوداؤد میں تصریح ہے کہ

۲۔۲رکعت ایک سلام سے پڑھی گئیں، اگر چہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ بطور صلوٰۃ الضحےٰ کے پڑھی گئیں یا بطور صلوٰۃ الشکر کے تھیں اور وقت چاشت کا تھا، اس لئے یہ نام دیا گیا۔

اس نماز کے ثبوت میں قولی احادیث تو بہ کثرت ہیں۔ لیکن فعلاً ثبوت بہت کم ہے۔ اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے تو اس کو بدعت بھی کہہ دیا تھا اور ابن تیمیہ نے بھی اس کو کسی سبب کے ساتھ مستحب مانا ہے، مطلقاً نہیں، کیونکہ مطلقاً مستحب ہونے کے لئے شارع علیہ السلام کا عمل بھی ضروری جانتے ہیں، اور ایسا نہ ہو تو اس کو بھی بدعت کا درجہ دے دیتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ اول تو عمل کی حدیث بھی ثابت ہیں اور حاکم نے صلوٰۃ ضحیٰ کے بارے میں ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے جس کے غالب اقوال مستند ہیں، اور اثباتِ صلوٰۃ الضحیٰ کی احادیث بیس رواۃ صحابہ سے نقل کی ہیں۔ ملاحظہ ہو فتح الباری وغیرہ۔

فضائل کا انحصار صرف فعل پر نہیں

بلکہ حضور علیہ السلام کے قول سے بھی فضائل ورغائب ثابت ہو جاتے ہیں، کیونکہ آپ نے سارے فضائل کا عملی احاطہ نہیں کر لیا تھا۔ یا زیادہ نہ کر سکے تو دوسروں کو ترغیب دلادی ہے تاکہ وہ عمل کر کے اجر حاصل کریں، اور صلوٰۃ الضحےٰ بھی ان ہی میں سے ہے۔

دوسرے اذان کو دیکھئے کہ آپ نے یہ عمل نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی افضل اعمال میں سے ہے، اسی طرح نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ہے کہ اس کا ثبوت بھی فعلاً کم ہے اور قولاً اس کی فضیلت زیادہ آئی ہے، تو وہ بھی بدعت کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر یہ کہ حضور علیہ السلام سے تو دعاؤں کا صدور بطور اذکار کے ہوا ہے اور اذکار میں ہاتھ اٹھانا نہیں ہے۔ امت کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا تو ہم اپنی دعاؤں میں ہاتھ اٹھانے سے کیوں محروم ہوں، جبکہ قولی احادیث بھی اس کی فضیلت میں ثابت ہیں اور حضور علیہ السلام سے نوافل کے بعد اس کا ثبوت عملاً بھی موجود ہے لہٰذا جس نے اس کو بدعت کہا وہ طریق ثواب سے ہٹ گیا اور ایسی فاسد بنیاد ڈالی، جس پر تعمیر شدہ عمارت کا حال بھی معلوم ہے۔ حضرتؒ نے علامہ ابن تیمیہ وابن القیم اور دوسرے غیر مقلدین کی طرف اشارہ کیا اور پھر فرمایا کہ عیدین کے بعد کا مصافحہ اس ذیل میں نہیں آتا کیونکہ اس کا ثبوت کسی نماز کے بعد نہیں ہوا اور صرف ملاقات کے وقت ثابت ہوا۔ بال سے زیادہ باریک تر ان دقیق فروق کو سمجھنے کے لئے بڑی سلامتِ فکر، ذہن ثاقب اور صحیح دینی ذوق کی ضرورت ہے۔

اجتماعی دعاء بعد الصلوٰۃ کا ثبوت

اوپر اس کا ذکر ضمناً ہوا ہے اور غیر مقلدین زمانہ اس کے سخت خلاف ہیں اور اس کو بدعت کہتے ہیں اور ان سے پہلے علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم بھی اس کو بدعت قرار دے کر سخت مخالفت کر چکے ہیں اس لئے یہاں اس کے بارے میں مزید تفصیل ودلائل پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) علامہ ابن تیمیہ نے لکھا کہ امام ومقتدیوں کی اجتماعی دعا نمازوں کے بعد کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے کسی نے نقل نہیں کیا، یہاں تو مطلق نمازوں کا ذکر کیا جس میں نوافل کو بھی شامل کر دیا، پھر آگے لکھا کہ بلاشک وریب امام ومقتدیوں کی اجتماعی دعا کا ثبوت فرض نمازوں کے بعد حضور علیہ السلام سے نہیں ہوا۔ یہاں فرض کی قید بڑھادی، پھر لکھا کہ مشروع دعا کا وقت آخر میں سلام پھیرنے سے قبل ہے، بعد میں نہیں۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۱/۱۸۸)۔

(۲) بعض حضرات اصحاب امام شافعی واحمد اس کے قائل ہیں کہ امام ومقتدی نماز کے سلام کے بعد دعا کریں۔ لیکن ان کے پاس اس کے سنت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے (ولیس مع ھؤلاء بذلک سنة فتاویٰ ص ۱/۲۰۲: یہاں ان اکابر پر بھی ایسا سخت نقد فرما دیا ہے کہ ان حضرات کے پاس اس کوئی دلیل سنت سے نہیں ہے۔

(۳) کسی نے حضور علیہ السلام سے یہ نقل نہیں کیا کہ آپ مقتدیوں کے ساتھ بعد سلام نماز کے اجتماعی دعا کرتے تھے۔ (رر ص ۱/۲۱۰)۔
(۴) امام ومقتدیوں کی نماز کے بعد اجتماعی دعا بدعت ہے کہ وہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں نہیں تھی۔ بلکہ جو دعا تھی وہ نماز کے اندر ہی تھی۔ (فتاویٰ ص ۱/۲۱۹)۔

علامہ محدث مبارکپوری کا احقاق حق

آپ نے تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی ص ۱/۲۵۴ میں لکھا: اس زمانہ میں علماءِ اہلِ حدیث نے اس بارے میں بڑا اختلاف ظاہر کیا ہے کہ فرض نماز سے فارغ ہو کر امام ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور مقتدی ہاتھ اٹھا کر آمین کہیں، تو بعض نے اس کو جائز کہا اور بعض نے ناجائز و بدعت قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ حضور علیہ السلام سے بہ سندِ صحیح ثابت نہیں ہے، اس لئے وہ محدث ہے، اور ہر محدث بدعت ہے۔
علامہ ابن القیم نے بھی زاد المعاد میں لکھا کہ نماز کے سلام کے بعد امام ومقتدیوں کا مستقبلِ قبلہ ہو کر دعا کرنا یہ کسی طرح بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں ہے اور نہ یہ کسی صحیح یا حسن روایت سے ثابت ہے الخ یہ بھی لکھا کہ اس کے جواز کی یہ صورت ہے کہ نماز کے بعد نمازی تہلیل وتسبیح وتحمید کریں پھر درود شریف پڑھ کر دعا کریں تو اس طرح یہ دعا نماز کے بعد نہیں بلکہ اس دوسری عبادت ذکر وتحمید کے بعد ہوگی اور نماز کی دعا صرف وہ ہے جو سلام سے پہلے ہو، اور وہی ماثور بھی ہے۔

حافظ ابن حجر کا رد

علامہ مبارکپوری نے اس کو نقل کر کے لکھا کہ ابن القیم کی اس تحقیق کو حافظ ابن حجر نے رد کر دیا ہے (کما نقلہ القسطلانی فی المواہب) انہوں نے کہا کہ یہ مطلقاً نفی مردود ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو فرمایا تھا کہ نماز کے بعد دعا کو کبھی ترک نہ کرنا، (ابوداؤد ونسائی) اور زید بن ارقم کی حدیث ہے کہ میں نے حضور علیہ السلام کو سنا کہ نماز کے بعد دعا کرتے تھے **اللھم ربنا ورب کل شیئ** (ابوداؤد ونسائی) اور حدیثِ صہیب میں ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نماز ختم کر کے **اللھم اصلح لی دینی** الخ پڑھا کرتے تھے (نسائی و ابن حبان) وغیرہ اگر کہا جائے کہ دبر الصلوٰۃ سے مراد قربِ آخر نماز کا ہے، یعنی تشہد، تو میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد بالا جماع بعد السلام ہی ہے۔ اس کے خلاف کا ثبوت دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے دلائل بھی پیش کئے۔ ایک ترمذی کی حدیث یہ ہے کہ سب سے زیادہ قبولیتِ دعا کا وقت آخری رات اور فرض نمازوں کے بعد ہے اور طبرانی میں حضرت جعفر صادقؒ کی روایت ہے کہ فرض نماز کے بعد کی دعا نفل نماز کے بعد کی دعا سے افضل ہے، جیسے کہ فرض نماز نفل نماز سے افضل ہے۔

علامہ ابن القیم کا اعتراف

اس کے بعد علامہ مبارکپوری نے لکھا کہ یہ بات بلا شک وریب ہے کہ حضور علیہ السلام سے فرض نماز کے بعد قولاً وفعلاً دونوں طرح دعا ثابت ہے، اور خود ابن القیم نے بھی دوسری جگہ اس کو ذکر کیا ہے اور صحیح ابن ابی حاتم کی روایت درج کی ہے کہ حضور علیہ السلام نماز سے فارغ ہو کر یہ دعا پڑھتے تھے۔

" اللّٰھم اصلح لی دینی الذی جعلتہ عصمۃ امری واصلح لی دنیای التی جعلت فیھا معاشی، اللّٰھم انی اعوذ برضاک من سخطک واعوذ بک من نقمتک واعوذبک منک لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذاالجد منک الجد " اس کے بعد دو روایتیں مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان کی بھی ذکر کی ہیں، جن میں دعا بعد ختم صلوٰۃ کی تصریح ہے۔

علامہ مبارک پوری کی استعجاب

علامہ مبارکپوری نے لکھا کہ باوجود اس کے بھی علامہ ابن القیم کا یہ لکھ دینا کہ "نماز کے سلام کے بعد، استقبال قبلہ کے ساتھ امام یا مقتدیوں کا دعا کرنا حضور علیہ السلام کی سنت نہیں ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس کا مطلب اور ان کی مراد کیا ہے، بجز اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ استمرار کے ساتھ دعاء بعد الصلوٰۃ کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔ اور حافظ نے بھی یہی تاویل کی ہے (مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ جو بات حضور علیہ السلام سے ایک دو دفعہ بھی ثابت مان لی جائے تو اس کو علامہ ابن تیمیہ یا ابن القیم بدعت اور خلاف سنت کیسے کہہ سکتے ہیں؟ یہ نہایت تشدد اور اپنی رائے کا اتباع نہیں تو اور کیا ہے؟!)

احادیث رفع یدین فی الدعا

اس کے بعد علامہ مبارکپوری نے پانچ احادیث نقل کیں جن میں حضور علیہ السلام سے نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا فعلاً یا قولاً ثابت ہے، پھر آپ نے دعا میں ہاتھ اٹھانے کی تائید اور اس کا آداب دعا میں سے ہونے کی احادیث بھی ذکر کی ہیں اور لکھا کہ جب حضور علیہ السلام سے فرض نمازوں کے بعد بھی بہت سی دعاؤں میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے اور ممانعت کہیں سے ثابت نہیں ہے، تو اس کو بدعت سیئہ کیسے کہہ سکتے ہو؟!

پھر علامہ مبارکپوری نے ۱۴۔۱۵ حدیث اور بھی نقل کیں جن میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثابت ہے اور لکھا کہ ان سب کی سند جید ہے، اور حافظ ابن حجر سے نقل کیا کہ اس بارے میں احادیث بہ کثرت ہیں اور لکھا کہ علامہ سیوطیؒ نے اس پر مستقل رسالہ بھی لکھا ہے اور لکھا کہ ایک بڑا استدلال حدیث انس سے بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے جمعہ کے استسقاء کی دعا ہاتھ اٹھا کر اور دوسرے سب لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا کی، یہ روایت بخاری کی ہے علماء نے لکھا کہ گو یہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا استسقاء کے موقع پر تھا، لیکن اس کے ساتھ خاص نہیں کیا جاسکتا، اور اسی لئے امام بخاری اس کو کتاب الدعوات میں مطلق دعا میں رفع یدین ثابت کرنے کے لئے لائے ہیں۔ اس کے بعد علامہ نے آخر میں پھر لکھا کہ میرے نزدیک قول راجح یہی ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ اس کے کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے، ان شاء اللہ واللہ تعالیٰ اعلم (تحفۃ الاحوذی ص ۲۴۶/۲۴۵ جلد اول مطبوعہ جید برقی پریس دہلی)

اس کے بعد علامہ نے تنبیہ کے عنوان سے یہ بھی لکھا کہ اس زمانہ کے حنفیہ جو ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کو فرض جیسا ضروری سمجھتے ہیں، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے اور یہ بات ان کے امام ابوحنیفہ اور دوسرے اکابر حنفیہ عینی وغیرہ کی تصریحات کے بھی خلاف ہے) جو اس کو صرف جائز و مستحب کے درجہ میں کہتے ہیں۔ (ررص ۱/۲۴۷)۔

آخر میں ہم چند ضروری باتوں کا اضافہ مناسب سمجھتے ہیں، علامہ نووی نے شرح المہذب ص ۳/۴۸۸ میں لکھا کہ امام، مقتدی، و منفرد کے لئے تمام نمازوں کے بعد دعا کرنا بلا خلاف مستحب ہے، اور امام کا مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر دعا کرنا مستحب ہے اور ابی حاتم کی حدیث ابی ہریرہ سے مستقبل القبلہ دعا بھی ثابت ہے، لہٰذا دونوں صورتیں ثابت ہوئیں۔ اور روایات صحیحہ سے آج کل کی مروجہ نماز کے بعد کی اجتماعی دعاؤں کا ثبوت یقینی طور سے ہو چکا ہے، اسی لئے ہمارے فقہاء نے اس کو ذکر کیا ہے، جیسا کہ نور الایضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے (۱۴۳)۔

اجتماعی دعا بعد النافلہ کا ثبوت

ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کا ثبوت بھی حضور علیہ السلام سے دو بار نوافل کے بعد ثابت ہوا ہے، ایک تو حدیث مسلم شریف سے بیت ام سلیمؓ میں کہ آپ نے سب کے ساتھ نماز کے بعد دعا کی۔ (فتح الملہم ص ۲/۲۲۶) امام بخاری نے بھی اس واقعہ کا ذکر مختصراً پانچ جگہ کیا ہے۔

دوسرے نماز استسقاء کے بعد (معارف ص ۳/۴۹)

یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد کو پھر تازہ کرلیں کہ حضور علیہ السلام سے کسی فعل کے لئے خواہ قولی ثبوت ہو یا فعلی، دونوں برابر ہیں اور کسی ایسے ثابت شدہ عمل کو بدعت ہرگز نہیں کہہ سکتے، یہ ضرور ہے کہ کسی مستحب کو واجب نہ سمجھے اور ہر حکم کو اپنے درجہ تک رکھے۔ اور اگر کوئی بات حضور علیہ السلام کے عمل میں کسی کے ساتھ بھی ثابت ہے تو وہ کافی ہے تاکہ امت اس کو بھی اپنا معمول بنا کر اجرِ عظیم حاصل کرتی رہے۔

حرمین کی نمازیں

یہی اجتماعی دعا بعد الصلوٰۃ کا مسئلہ ہے، اوپر کی ساری تفصیل ہم نے اس لئے کہ اس کی اہمیت اور فضیلت واضح ہو جائے، جبکہ آج علامہ ابن تیمیہ اور ابن القیم کے تشدد کی وجہ سے حرمین شریفین کی نمازیں اس بڑی فضیلت سے محروم ہو چکی ہیں، اور آپ نے دیکھا کہ ایک اہلِ حدیث عالم نے ہی کس طرح ان کے تشدد کو رد کر دیا ہے، اور حق بات بلا خوف لومۃ لائم کہہ دی ہے۔ جزاء اللہ خیر الجزاء۔

علماءِ نجد وحجاز کی خدمت میں

کیا علماءِ نجد وحجاز تک ہماری یہ آواز پہنچ سکتی ہے کہ وہ سعودی قلمرو سے ہر بے جا تشدد کو ختم کرائیں اور جس طرح انہوں نے مسئلہ طلاق ثلاث بلفظ واحد میں علامہ ابن تیمیہ وابن القیم کی غلطی کو تسلیم کر کے جمہور سلف وخلف کے فیصلہ کو نافذ کرادیا، کیا وہ اسی طرح دوسرے اختلافی مسائل پر بھی جمہور امت کے دلائل کی روشنی میں غور وتامل نہ کریں گے، اور اجتماعی دعاء بعد الصلوات بھی جب حضور علیہ السلام کے قول وفعل سے ثابت ہے تو اس کو بھی خاص طور سے حرمین شریفین میں ضرور جائز قرار دیں، اگر یہی خوف ہے کہ عوام اس کو فرض وواجب سمجھ لیں گے (اگرچہ کہیں بھی عوام نے ایسا کبھی بھی خیال نہیں کیا اور نہ کرنا چاہئے) تو حرمین شریفین کے ائمہ مساجد کو اتنی اجازت تو دے دیں کہ وہ کبھی کبھی، کسی کسی نماز میں اجتماعی دعا ہاتھ اٹھا کر کرادیا کریں تاکہ حضور علیہ السلام اور صحابہ کے دور کی اجتماعی دعاؤں کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

واضح ہو کہ علامہ مبارکپوری کے زمانہ میں چونکہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے خلاف غیر مقلدوں نے بہت زیادہ ہنگامے کئے تھے اور اس کو بدعت قرار دیا تھا، اور علامہ موصوف اس کے خلاف تھے تو انہوں نے ص ۱/۲۴۶ میں احادیث دعا برفع الیدین میں ۱۳ جگہ موٹے قلم سے رفع یدیہ اور رافعا یدیہ لکھوا کر طبع کرایا تھا، بعد کے ایڈیشنوں کا حال ہمیں معلوم نہیں۔

باب صلوٰۃ النفل جماعۃً

حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے نزدیک نوافل کی جماعت نہیں ہے، اسی لئے اس کے واسطے تداعی کہ ایک دوسرے کو بلائے اور جماعت کا اہتمام کرے مکروہ ہے، کیونکہ جب حق تعالیٰ نے سرے سے اختیار دیدیا نوافل کے بارے میں کہ چاہے پڑھو یا نہ پڑھو تو پھر اس کے لئے لوگوں کو بلانا کیوں کر مناسب ہوگا؟! اسی لئے بلانا فرض نمازوں کے لئے خاص ہوگیا، پھر ہم نے دیکھا کہ جو نوافل ومستحبات نماز کے اندر ادا ہوتے ہیں تو ان میں بھی جماعت کا کوئی اثر نہیں ہے کیونکہ ہر شخص ان کو اپنے طور پر ادا کرتا ہے اور یہی صورت نماز کے اندر کے اذکار کی بھی ہے، کہ سب اپنے اپنے ادا کرتے ہیں امام ہو یا مقتدی یا منفرد۔ تو معلوم ہوا کہ تضمن کی بات صرف فرائض میں رہتی ہے اور نیابت بھی صرف اقوال میں جاری ہوتی ہے جیسے قراءۃ میں اور افعال سب پر برابر ہیں، اور اقوال میں بھی بعض وہ ہیں جو ترک ہو جائیں تو نماز کی صحت پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ ان میں بھی نیابت کا اعتبار نہیں ہے، اور اگر کہا جائے کہ نمازِ کسوف، استسقاءِ وتر اوتراویح بھی تو سنت ہے، ان میں بھی جماعت نہ ہونی چاہئے تو وہ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں، اور صلوٰۃ کسوف کے لئے تو غایہ میں وجوب کی بھی تصریح ہے۔

فقہاء نے جو یہ لکھا ہے کہ نوافل کی جماعت مکروہ ہے سواءِ رمضان کے، تو اس کی مراد صرف مشہور قیامِ رمضان یعنی تراویح کی نماز

ہے۔ مطلق نفل مراد نہیں ہے۔

حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا: ہمارے علماء حنفیہ کے نزدیک فرائض کے سوا نوافل کی جماعت جائز نہیں بجز کسوف وعیدین کے، جن کا ثبوت شارع سے ہو گیا ہے۔ اور جن نوافل کی جماعت ثابت نہیں، ان کیلئے تداعی اور اجتماع بھی جائز نہیں، البتہ ۲۔۳ کی اقتدا درست ہے، کیونکہ وہ ثابت ہے جیسے کہ حضور علیہ السلام نے بیت ام سلیم میں حضرت انس، ان کی والدہ اور یتیم کو جماعت کرائی تھی وغیرہ۔ یہ اسلئے ہے کہ جماعت کی نماز میں مفاسد بھی ہیں (ریا وغیرہ) اسی لئے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ بجز فرائض کے سب سے بہتر نماز گھر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ تداعی اور ایک امام معین کے ساتھ اجتماع کی نماز میں یہ صورت باقی نہیں رہتی، اگرچہ کسی ایک کے گھر میں ہی ہو۔ (لامع ص ۲/۹۵)۔

حضرت شیخ الحدیثؒ نے لکھا: علامہ عینی نے لکھا کہ ہمارے اصحاب حنفیہ اور ایک جماعت نے غیر رمضان میں جماعت نفل کو مکروہ کہا ہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا کہ امام مالک سے روایت ہے کہ قافلہ کی جماعت میں حرج نہیں لیکن اگر اس کی شہرت ہو کر لوگ اس کے لئے جمع ہوں تو جائز نہیں، اور یہ غالباً انہوں نے اپنے اصول سد ذرائع کے تحت فرمایا ہوگا، تاکہ لاعلم لوگ اس کو فرض نہ سمجھ لیں۔ اور قیام رمضان (تراویح کی نماز) اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ صحابہ اور بعد کے حضرات کے معمول میں رہنے کی وجہ سے مشہور چلی آ رہی ہے۔ تاہم اگر کوئی جماعت نوافل میں اقتدا کرے گا تو اس کیا قتداء صحیح ہوگی۔

ان نقول کے بعد حضرتؒ نے لکھا کہ علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلہ پر خوب بسط سے کلام کیا ہے اور خلاصہ سے نقل کیا کہ نفل کی جماعت اگر کبھی کبھی ہو تو غیر مکروہ ہے، اور اگر بطور مواظبت ہو تو بدعت مکروہہ ہے، کیونکہ توارث کے خلاف ہے، بدائع اور حاشیۂ بحر رائق میں بھی جماعت نفل کو غیر مسنون وغیر مستحب لکھا ہے، کیونکہ بجز رمضان کے صحابہ نے نہیں پڑھی، اور یہ سب اس وقت ہے کہ سب نمازی نفل پڑھنے والے ہوں، لیکن اگر نفل والے فرض پڑھنے والے امام کی اقتدا کریں تو کوئی کراہت نہیں ہے۔ (حاشیۂ لامع ص ۲/۹۵)۔

قال رسول اللہ ﷺ قد حرم اللہ علے النار من قال لا الہ الا اللہ

حافظ نے لکھا کہ راوی حدیث محمود بن الربیع انصاریؓ کی موافقت ومتابعت حضرت انس بن مالکؓ نے کی ہے، جس کو امام مسلم نے ان کے طریق سے روایت کیا ہے اور وہ بہت ہی قوی متابع ہے (حاشیہ لامع ص ۲/۹۶ وفتح الملہم ص ۲/۲۳۵)

دوسری ابحاث وتشریحات شروح میں دیکھی جائیں، یہاں موقع کی مناسبت سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ایک ارشاد ڈرتے ڈرتے پیش کرنا ہے، آپ نے اپنے ایک مکتوب میں جو اپنے پیر ومرشد قدس سرہ کے صاحبزادگان کے نام لکھا ہے یہ تحقیق فرمائی کہ مومن صحیح العقیدہ کو جہنم کا عذاب نہ ہوگا، اور قاتل عمداً تارک صلوٰۃ وغیرہ کو بھی جو عذاب جہنم ہوگا وہ کسی خرابی عقیدہ کی وجہ سے ہوگا، ورنہ مومن صحیح العقیدہ کے تمام معاصی کی سزا قیام قیامت سے قبل ہی دنیوی مصائب وآلام، فتن وامراض اور عذاب قبر وغیرہ کے ذریعے پوری کرادی جائے گی۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت قدس سرہ کی تحقیق مذکور کھٹکتی ضرور ہے، مگر ان کا جزم ویقین اسی پر معلوم ہوا کہ اگر عقائد صحیح ہیں اور ان میں کوئی کھوٹ اور کمی کسر نہیں ہے، تو وہ اس نار جہنم سے محفوظ رہے گا۔ جو کفار ومشرکین کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور اعدت للکافرین واعدت للمتقین وغیرہ کی تصریحات بھی شاید کچھ اشارات دیتی ہیں واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

افادات خاصہ: یہاں ایک بات اپنے حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی یاد آئی، العرف الشذی ص ۵۲۰ میں قولہ جب الحزن الخ پر فرمایا کہ یہ درکہ وطبقہ گنہگار مومنوں کے لئے ہوگا۔ کفار کے لئے نہیں، کیونکہ کافر ومومن برابر نہیں ہو سکتے، اور ریاکار عالم کا حال بھی ریاکار قاری کی طرح

ہوگا۔ پھر فرمایا کہ جن لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ایک وقت میں جہنم ختم ہو جائے گی یا اس کا عذاب کافروں پر بے اثر ہو جائے گا۔ یہ سب غلط ہے اور مسندِ احمد میں جو ایک روایت ہے اس کا تعلق عصاۃ مومنین کی نار جہنم سے ہے۔ اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ یہ جہنم کا طبقہ الگ ہی سے ہوگا، جو کفار کی نارِ جہنم کے اعتبار سے کم عذاب کا ہوگا۔ اور مومنین جو عذاب سے بچ ہی نہ سکیں گے۔ اور کم سے کم ایمان کی وجہ سے آخر میں وہاں سے نکل کر جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہ طبقہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اس طرح ممکن ہے حضرتِ اقدس مجدد صاحبؒ کی مراد وہی کفار ومشرکین والی جہنم ہو کہ اس میں عصاۃِ مومنین نہ جائیں گے۔ اور جب الحزن سے انکار بھی ضروری نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عقائد کی اہمیت: ہمارے حضرت تھانویؒ اس دور کے نوجوان مسلمانوں کی بداعمالیوں اور دینی کوتاہیوں کو دیکھ کر نہایت رنجیدہ ہوتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانے میں اگر عقیدہ ہی صحیح رہ جائے اور گناہوں کو گناہ سمجھیں تو وہ ان سے بہت اچھے ہیں جو معاصی کو معاصی بھی نہیں سمجھتے کیونکہ یہ عقیدہ کی خرابی ہے اور عمل کی خرابی عقیدہ کی خرابی سے ہزاراں ہزار درجہ زیادہ ہے۔ نکاح کے موقع پر آپ کی تاکید تھی کہ بطور احتیاط ہی کے دولہا سے کلمہ پڑھوالیا جائے تاکہ نکاح کی صحت میں شبہ نہ رہے، کیونکہ آج کل بہ کثرت نوجوانوں کے عقائد بھی متزلزل ہو چکے ہیں۔

اضافۂ مزید بابۃ جُبّ الحزن

جُب کے معنی کنویں کے ہیں اور حُزن کے معنی غم کے ہیں، گویا وہ غم وحزن کی جگہ ہوگی، کہ کاش ہم ایمان کے ساتھ اعمالِ بد سے بھی پرہیز کرتے تو یہاں آنا نہ پڑتا، اور یہ جو حدیثِ ترمذی میں ہے کہ دوزخ ہر روز سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے جب الحزن سے، وہ بھی شاید اس لئے ہے کہ اصل دوزخ، جو خاص طور سے کفار ومشرکین کے لئے تیار کی گئی ہے۔ وہ تو خود بھی جانتی ہے کہ وہ کفار ومشرکین اسی کے مستحق تھے، مگر رنج وافسوس سب ہی کو اس کا ہوگا کہ ایمان والوں کو بھی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ایک خاص نوع کی دوزخ میں جانا پڑا، اور وہاں اللہ ورسول کے پیاروں کو بھی کچھ عرصہ کے لئے عذاب سہنا پڑا اور نہ یہ نہیں ہے کہ ان کو کافروں جیسا عذاب ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں کے عذاب میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا، اور وہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ کفار ومشرکین کی دوزخ کا رقبہ تو آسمانوں سے نیچے کا سارا طویل وعریض علاقہ ہے۔ لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں کھربوں میل کا (جس کے مقابلہ میں جب الحزن کے علاقہ کی حیثیت صرف کنویں جیسی ہی ہو بھی سکتی ہے) اور اس درمیان کی ساری چیزیں آگ بن جائیں گی، اور ان کا عذاب بھی دائمی ہوگا، جب الحزن والوں کی طرح محدود اور کم مدتی نہ ہوگا، اسی کا نقشہ سورۂ فاطر پارہ ۲۲) کی آیت نمبر ۳۱ سے ص ۳۶ تک دکھایا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ ہم نے جو کتاب قرآن مجید آپ پر اتاری ہے، آپ کے بعد اس کے والی و وارث ہمارے منتخب بندے ہوں گے یعنی امتِ محمدیہ، اور ان میں تین قسم کے لوگ ہوں گے، کچھ وہ ہوں گے کہ باوجود ایمان وعقیدۂ صحیحہ کے اعمالِ صالحہ کے لحاظ سے کوتاہ ہوں گے یا ظالم ولا نفسہم، بداعمالیوں کے شکار بھی، جن کے بارے میں قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمة اللہ، ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً، انہ ھو الغفور الرحیم بھی وارد ہے۔ دوسرے درمیانی لوگ ہوں گے، جو خلطوا عملا صالحا وآخر سیئاً عسی اللہ ان یتوب علیھم، ان اللہ غفور رحیم کے مصداق ہوں گے، تیسری قسم ان کی ہوگی جو ہر طرح کی نیکیوں میں بھی سب سے آگے اور سابق بالخیرات ہوں گے۔ باذن اللہ وفضلہ۔

علامہ بغویؒ نے ایک روایت ذکر کی ہے کہ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات پڑھ کر فرمایا کہ سابق تو جنت میں بلا حساب داخل ہو جائیں گے مقتصد اور درمیانی کا حساب آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔ اور وہ بھی جنت میں چلے جائیں گے۔ ظالم کو روک لیا جائے گا، اور پہلے اس کو ہم وحزن کے مقام میں رکھا جائے گا، اس کے بعد جنت میں داخل کریں گے۔ اسی لئے وہ خدا کے لاانتہا ہی فضل وکرم کا شکر ادا

کریں گے کہ ہمیں حزن (یا جب الحزن) سے دور کر کے دارالمقامۃ (ہمیشہ ہمیشہ کی رہنے کی جگہ یعنی جنت) میں پہنچا دیا ہے بیشک ہمارا رب بڑا بخشنے والا اور قدر دان ہے کہ از راہِ قدر دانی ایمان پر انعام بھی دیا۔

آگے حق تعالیٰ نے آیت ۳۶ میں یہ بات بھی بالکل صاف کر دی کہ کفار و مشرکین کے لئے جو جہنم تیار کی گئی ہے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اس میں زندہ ہو کر دردناک عذاب کا مزہ چکھتے رہیں گے، اور ان کے عذاب میں کبھی تخفیف نہ ہوگی۔ اور کفر اختیار کرنے والوں کو یہی سزا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر مظہری وغیرہ)

بات لمبی ہوگئی مگر دل نے تقاضہ کیا کہ اس بارے میں کچھ وضاحت ہو ہی جائے، کیونکہ مقصود صرف بخاری کا حل نہیں ہے، بلکہ دوسرے اہم مسائل کا فیصلہ بھی اکابرِ امت کی رہنمائی میں ضرور پیش کرنا ہے۔ واللہ الموفق۔

عقائد کا تعلق علمِ صحیح سے

عقائد کی درستی و صحت کا تعلق صرف علمِ صحیح سے ہے، اگر علم صحیح اور عقل بھی سلیم ہے تو عقائد کے بارے میں کبھی غلطی نہ ہوگی۔ پھر یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کا علم اتنا آسان کر دیا ہے کہ کم سے کم سمجھ والا بھی اس کے بہرہ ور ہو سکتا ہے، اور غلط عقیدے سے ضرور بچ بھی سکتا ہے۔ ورنہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو اس کا مکلف ہی نہ فرماتا۔

عرس بند ہونے کا عجیب واقعہ

مجھے خوب یاد ہے کہ جب ہمارے حضرت شاہ صاحب (علامہ کشمیریؒ) دیوبند سے ڈابھیل پہنچے تو وہاں مدرسہ سے قریب ہی ایک جگہ عرس ہوتا تھا، حضرت نے وہاں وعظ فرمایا اور کہا کہ "صاحبو! عمل تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے، مگر علم صحیح ہے، جو بات تمہیں دین کی بتائیں گے صحیح بتائیں گے، عرس کی رسم کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کو ترک کر دو"۔ ناظرین بڑی حیرت سے یہ خبر پڑھیں گے کہ اسی دن سے وہاں کا عرس موقوف ہو گیا۔ اس زمانہ میں ایسی نظیر کم ہوگی کہ جاہل و کم علم لوگوں نے اس طرح جلد صحیح عقیدہ کو تسلیم کر لیا ہو۔

تصحیح عقائد کی فکر

غرض اعمال کی کوتاہیاں تو بہت ہیں خصوصاً اس زمانہ میں کہ شر کا غلبہ بہت ہی زیادہ ہے اور جتنا قرب قیامت کا ہوگا، شرور و فتن زیادہ ہی ہوں گے اس لئے تصحیح عقائد کی فکر بھی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ عقائد کے صحیح کرنے اور رکھنے میں کوئی دقت نہیں ہے، سب سے اول حق تعالیٰ کی ذات و صفات، علم، قدرت، مشیئت، تقدیر خیر و شر، برزخ و آخرت کا یقین، تمام انبیاء پر ایمان، ملائکہ و شیاطین و جن کا یقین، حق تعالیٰ کے لئے "لیس کمثلہ شیء" ہونے کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا کہ اس میں بڑے بڑوں سے بھی غلطیاں ہوگئی ہیں۔ خدا کا وعدہ ہے کہ آخر زمانہ تک صحیح علم رکھنے والے بھی ضرور دنیا میں رہیں گے۔ جو غلط علم والوں کی غلطیوں پر متنبہ کرتے رہیں گے اس لئے صحیح علم والے علماء و صلحاء سے رابطہ رکھنا بھی ضروری ہے، ورنہ قیامت تک کے لئے ابلیس کو بھی مہلت مل چکی ہے کہ وہ طرح طرح سے گمراہ کرے اور وہ خاص طور سے علماءِ سوء کے ذریعہ بھی راہِ مستقیم سے ہٹاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو "ما انا علیہ و اصحابی" کی شاہراہِ مستقیم پر چلائے اور ثابت قدم رکھے۔ آمین ثم آمین۔

باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ

حافظ ابن حجرؒ نے بعض محققین سے نقل کیا کہ ظاہر ہے لا تشد الرحال میں مستثنیٰ منہ محذوف و مقدر ہے۔ اگر عام لیں تو پھر کسی جگہ کا سفر بھی بجز ان تین کے جائز نہ ہوگا، اور تجارت صلۂ رحم، طلب علم وغیرہ کے لئے بھی سفر حرام ہوگا اور اگر مستثنیٰ کی مناسبت سے مسجد مراد لیں تو ان لوگوں کا

قول باطل ہو جائے گا۔ جو اس حدیث کی وجہ سے زیارۃِ قبرِ مکرم نبوی اور دوسری قبور صالحین کے لئے بھی سفر کو حرام قرار دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔
علامہ سبکی کبیر نے فرمایا کہ زمین پر کوئی بقعہ بھی ایسا نہیں ہے، جس کا فضل و شرف اپنا ذاتی ہوتا کہ اس کی وجہ سے اس کی طرف سفر کریں، بجز ان تین شہروں کے جن کے فضل کی شہادت شرع نے دی ہے، لہٰذا ان کے سوا دوسرے مقامات کا سفر صرف اس لئے ہوگا کہ وہاں جا کر کسی کی زیارت کریں گے، یا جہاد کریں گے، یا علم حاصل کریں گے، تو وہ سفر اس مکان و مقام کے لئے نہ ہوگا بلکہ اس کے لئے ہوگا جو مکان و مقام میں ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے اس کو نہیں روک سکتے، واللہ اعلم۔
حافظ نے لکھا کہ ایک بڑا استدلال مانعین کے مقابلہ میں یہ ہے کہ مشروعیت زیارۃِ قبرِ مکرم نبوی پر اجماع امت ہو چکا ہے اور ابن تیمیہ نے جو اس کے لئے سفر کو حرام کہا ہے تو یہ ان کی طرف منسوب شدہ مسائل میں ابشع المسائل میں سے ہے۔ الخ (فتح الباری ص ۳/۴۳)
یعنی یہ ان کے مستنکر تفردات میں سے سب سے زیادہ مستنکرہ مسائل میں سے ہے۔
آگے حافظؒ نے نمازِ مسجد حرام اور نمازِ مسجد نبوی کے ثواب کا فرق اور تفضیل مکہ علی المدینہ کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی ذکر کیا کہ قاضی عیاضؒ نے مدینہ میں سے اس بقعۂ مبارکہ کو مستثنیٰ کیا ہے۔ جس میں حضور علیہ السلام دفن ہیں اور اسی امر پر سب کا اتفاق نقل کیا کہ وہ افضل البقاع ہے۔ (فتح الباری ص ۳/۴۵)۔

مشاہد حرمین شریفین

فتح الباری ص ۴/۶۲ (آخر حج) کتاب المغازی اول الجزء ۷ جلد۷۔ اور کتاب الاعتصام ص ۱۳/ ۲۳۶ میں فضائل مدینہ منورہ پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ امام بخاری نے تیسویں پارہ کے شروع میں باب ماذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم...... وما اجتمع علیہ الحرمان مکۃ والمدینۃ وماکان بھما من مشاھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم والمھاجرین والانصار ومصلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والمنبر والقبر۔ (ص ۱۰۸۹) اتنا طویل عنوان کیوں قائم کیا؟ اس پر علامہ عینی و حافظ وغیرہ کے ارشادات مطبوعہ حاشیہ میں بھی مختصراً قابلِ مطالعہ ہیں۔
علامہ عینی نے لکھا کہ ہمارے شیخ زین الدینؒ نے فرمایا کہ نہی شدرحال کا تعلق صرف مساجد سے ہے کہ ان تین مساجد کے سوا دوسری مساجد کے لئے سفر نہ کیا جائے، باقی طلبِ علم، تجارۃ، تنزہ، زیارۃ صالحین و مشاہد و زیارتِ اخوان وغیرہ کے لئے سفر کی ممانعت قطعاً نہیں ہے۔ (عمدہ ص ۲/ ۶۸۵)
یہ شیخ زین الدینؒ بھی مشاہد کا ذکر فرما گئے، جس سے امام بخاری وغیرہ اکابرِ متقدمین کی تائید ہوتی ہے۔ کیا امام بخاری بھی ہماری طرح قبوری تھے کہ نہ صرف حضور علیہ السلام کے مشاہد پر باب باندھ دیا بلکہ مہاجرین و انصار کے مشاہد کو بھی اتنی اہمیت دے دی اور پھر حضور علیہ السلام کے مصلے اور منبر و قبر سب ہی کا ذکر فرما دیا۔ اب سلفی حضرات سے کون پوچھے کہ امام بخاری جو مکہ و مدینہ زادھما اللہ شرفا کے مشاہد کا ذکر صحیح بخاری شریف (اصح الکتب بعد کتاب اللہ) میں کر گئے، کیا ان مشاہد کا کچھ بھی وجود آپ حضرات نے باقی رہنے دیا ہے؟! افسوس کہ جن مشاہد و ماثر کا ذکرِ مبارک ہمارے سلف اتنے اہتمام سے کرتے تھے، چودہویں صدی کے خلف نے ان کو اصنام و اوثان کا درجہ دے کر مسمار و نابود کر دیا۔ والی اللہ المشتکی۔
اور اب تو جنت البقیع کا بھی قلعہ نما احاطہ کر کے مقابرِ مہاجرین و انصار پر حاضر ہو کر زیارت و فاتحہ سے روک دیا گیا ہے اور مزارِ مبارک سیدنا حمزہؓ کے گرد بھی اونچی دیواروں سے احاطہ کر دیا گیا ہے۔ اندر جا کر زیارت و ایصالِ ثواب کی اجازت نہیں ہے۔ و یا للاسف۔
اس موقع پر فتح الملہم شرح صحیح مسلم ص ۲/۲۲۳ کا مطالعہ بھی کیا جائے جس میں ذکر ہے کہ حضرت المؤلفؒ نے مؤتمر عالمِ اسلامی مکہ معظمہ منعقدہ ۱۳۴۴ھ میں بحیثیت مندوب جمعیۃ علماء ہند شرکت فرما کر مشاہد و ماثرِ حرمین کے بارے میں سلطان عبدالعزیز اور اکابرِ علماء نجد سے گفتگو کی تھی، اور وہ حضرتؒ کے دلائل شرعیہ کا کوئی شافی جواب نہ دے سکے تھے۔

ہم نے زیارۃ وتوسل کی بحث پہلے بھی تفصیل سے لکھی تھی (گیارہویں جلد میں) اور اب اس جلد میں بھی مزید وضاحتیں اور دلائل ذکر ہوئے ہیں، اور فضائلِ مکہ ومدینہ زادہما اللہ شرفا کی تفصیل بھی آ چکی ہے۔ اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

باب من اتی مسجد قبا: حضرتؒ نے فرمایا کہ قبا کے رہنے والے جمعہ کے دن مدینہ طیبہ آ کر جمعہ پڑھتے تھے تو آپ ان سے اور دوسرے نہ آنے والوں سے بھی ملنے کے لئے شنبہ کے دن قبا تشریف لے جاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قبا میں جمعہ نہ ہوتا تھا، علامہ ابن تیمیہ نے کہا کہ آپ کے اتفاقیہ عمل کو سنت نہ بنانا چاہئے۔ نہ اس پر استمرار کرے، بلکہ اتفاقیہ ہی کر لیا کرے، لیکن علماء نے اس رائے کو پسند نہیں کیا۔

علامہ عینی نے لکھا کہ صرف مسجد نبوی میں ہی جمعہ ہوتا تھا اور اہلِ قبا و اہلِ عوالی نمازِ جمعہ کے لئے مدینہ طیبہ آتے تھے، حضور علیہ السلام قبا سبت کے دن اس لئے بھی جاتے تھے کہ انہوں نے جو اکرام وضیافت وغیرہ ہجرت کے وقت حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کی کی تھی، اس کی مکافات کریں اور ان کی مسجد میں نماز بھی پڑھیں (جو جمعہ کے دن نمازِ ظہر سے معطل رہتی تھی) آپ احباب کے احسانات کی مکافات ضرور کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ خود ہی ان کی خدمت بھی کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ انہوں نے میرے اصحاب کا اکرام کیا تھا تو میں بھی ان کا اکرام کر کے مکافات کو پسند کرتا ہوں۔ (عمدہ ص ۲/۶۸۹)۔

باب فضل ما بین القبر والمنبر: حافظ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت بتلا کر یہاں ارادہ کیا کہ مسجد کے بعض حصے دوسرے سے زیادہ افضل ہیں۔ اور ترجمہ وعنوان میں قبر کا لفظ لائے، حالانکہ حدیث الباب میں بیت کا لفظ ہے اس لئے کہ حضور علیہ السلام کی قبر مبارک اس بیت میں بنی اور بعض طرق حدیث میں قبر کا لفظ بھی وارد ہوا ہے۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ روایتِ صحیحہ میں بیتی ہی ہے۔ اور قبر کی روایت بالمعنی ہے، کیونکہ بیت سکونت میں دفن ہوئے ہیں۔ (فتح ص ۳/۴۶)۔

یہ حدیث آگے کتاب الحج کے بعد فضائل مدینہ سے متعلق ۱۲ ابواب میں بھی آئی ہے۔ وہاں حافظ نے لکھا کہ اس حدیث سے مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کرنے کی ترغیب کے لئے فضیلت بیان فرمائی گئی ہے۔ اور لکھا کہ مجازاً اتنے حصہ کو روضۂ جنت اس لئے کہا گیا کہ نزولِ رحمت اور حصولِ سعادت کے لحاظ سے وہ حقیقی روضۂ جنت کی طرح ہے، یا اس لئے کہ اس حصہ میں عبادت سبب دخولِ جنت ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو ظاہری معنی پر ہی رکھیں کہ یہ حقیقۃً روضۂ جنت ہی ہے کہ آخرت میں یہ حصہ بعینہ جنت میں منتقل ہو جائے گا۔ (فتح ص ۴/۷۰)۔

علامہ عینی نے بھی یہی بات لکھی ہے اور خطابی سے یہ بھی نقل کیا کہ جو شخص اس حصہ میں عبادت کا اہتمام کرے گا تو وہ جنت کے باغوں میں داخل ہوگا۔ اور جو منبر کے پاس عبادت کا اہتمام کرے گا، وہ جنت میں حوضِ کوثر سے سیراب کیا جائے گا۔ پھر قاضی عیاض کا قول نقل کیا کہ منبری علے حوضی کی شرح میں اکثر علماء نے لکھا کہ یہ منبر بعینہ حوضِ کوثر پر لوٹا دیا جائے گا۔ اور فرمایا کہ یہی زیادہ ظاہر ہے، اگرچہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہاں حوض پر دوسرا منبر ہوگا۔ (عمدہ ص ۲/۶۹۳)۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جس روایت میں ما بین القبر والمنبر ہے اس میں اشارہ اس طرف ہوا کہ عالم تقدیر میں وہ قبر مبارک ہونے والی تھی، لہٰذا اس معنی پر یہ اخبار بالغیب کی صورت تھی اور روضہ کے بارے میں میرے نزدیک اصح الشروح یہی ہے کہ یہ بقعۂ مبارکہ جنت سے ہی ہے اور جنت ہی کی طرف اٹھا لیا جائے گا۔ لہٰذا وہ روضۃ من ریاض الجنۃ حقیقۃً ہے بلا تاویل۔

راقم الحروف نے حضرتؒ سے اکثر مواعظ میں یہ بھی سنا کہ دنیا کی ساری مساجد جنت میں اٹھالی جائیں گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کثرتِ عصیان کی وجہ سے حق تعالیٰ کا غضب لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے مگر یہ مساجد آڑے آ جاتی ہیں۔ ونعوذ باللہ من غضبہ

قولہ ومنبری علی حوضی: فرمایا: شارحین نے یہ سمجھا ہے کہ منبر کو لوٹا کر حوض پر پہنچا دیں گے۔ میرے نزدیک مراد یہ ہے کہ منبر اپنی ہی جگہ پر رہے گا اور حوض یہاں سے شام تک پھیل جائے گی۔ لہٰذا وہ منبر اب بھی حوض پر ہی ہے۔ پھر یہ کہ حوض پل صراط سے ادھر ہے یا ادھر ہے؟ حافظ

ابن حجر اور ابن القیم کا رجحان یہ ہے کہ پل صراط کے بعد ہے، اور یہی میری رائے بھی ہے، جس کو عقیدۃ الاسلام میں لکھا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے البدور السافرہ میں دو قول نقل کئے ہیں اور اپنی رائے نہیں ظاہر کی۔

قولہ لا تسافر المرأۃ یومین: میرے نزدیک اس بارے میں احوال وظروف پر مدار ہے، دنوں کی تعیین پر نہیں، اگر اطمینان کی صورت میسر ہو تو بڑا سفر بھی کر سکتی ہے، ورنہ چھوٹا بھی بغیر محرم کے نہ چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم علامہ عینی نے قاضی عیاض سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے مختلف احوال ومواقع میں مختلف ارشادات فرمائے ہیں کسی میں ایک دن کا کسی میں دو دن کا سفر بھی بغیر محرم کے ممنوع فرمایا ہے۔ (عمدہ ص ۲/۶۹۵)۔

باب استعانۃ الید: حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کا مقصد نماز کے اندر وقتِ ضرورت عملِ قلیل کی اجازت ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا اثر بھی جواز توسع کے لئے پیش کیا ہے۔ ابو اسحٰق (سبیعی تابعیؒ) کے نماز کے اندر ٹوپی اٹھا لینے کا ذکر بھی اسی لئے کیا اور اس کی اجازت ہمارے فقہاءِ حنفیہ نے بھی دی ہے امام بخاری نے حضرت علیؓ کا عمل بھی ذکر کیا ہے کہ وہ نماز کی نیت باندھنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے کوئی دوسری حرکت نہ کرتے تھے، سواءِ ضرورۃ کھجانے یا کپڑا صحیح رکھنے کے۔

حضرت نے فرمایا کہ حنفیہ کے پانچ قول ہیں، بنیادی بات تو سرخسی نے لکھی ہے کہ مبتلیٰ بہ کی رائے پر ہے وہ خود جس عمل کو زیادہ اور نماز کے منافی سمجھے وہ نہ کرے، اور کم کی گنجائش ہے، لیکن چونکہ اس کی تحدید مشکل ہے، اس لئے میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے افعال کا تتبع کیا جائے، جتنا عمل آپ سے ثابت ہے اس کو جائز سمجھے، اس سے زیادہ کو منافی صلوٰۃ خیال کرے، الا یہ کہ حضور علیہ السلام کے کسی عمل کے لئے دلیلِ تخصیص موجود ہو، اس میں امت کے لئے جواز نہ ہوگا۔

افادۂ از حاشیۂ لامع: حضرت شیخ الحدیثؒ نے اس مقام میں اچھی تفصیل ودلائل اکابر پیش کئے ہیں آخر میں محقق بجیری کا ارشاد نقل کیا کہ نماز میں کوئی دوسرا عمل مبطل صلوٰۃ ہے چار شرطوں سے، وہ عمل کثیر ہو یقیناً، متوالی وثقیل ہو جس کو بلاضرورت کیا جائے، اس سے شدۃِ خوف کی نماز مستثنیٰ ہوگئی کہ اس میں بھاری کام بھی جائز ہیں) نفل نماز سواری پر پڑھی جائے تو اس میں بھی ہاتھوں کی بعض حرکات غیر مضر ہیں اور متوالی کی حد یہ ہے کہ وہ عمل نماز کے دو فعلوں کے درمیان ایک نہایت ہلکی رکعت کی مقدار سے کم مدت کا ہو، کیونکہ حضور علیہ السلام نے حضرت امامہ بچی کو اتنی ہی دیر کے لئے اٹھایا تھا۔ زیادہ نہیں۔ (حاشیۂ لامع ص ۲/۹۷)۔

حافظ ابن حجرؒ نے جو فتح الباری ص ۴۹ ج ۳ میں لکھا کہ حنفیہ کا مسلک اس مسئلہ میں خلاف جمہور ہے، اس کی معقول وجہ ہم نہ سمجھ سکے۔ کیونکہ حنفیہ کے دلائل نہایت منضبط ومعقول اور احادیث وآثار کے مطابق ہیں اور جمہور کے مخالف بھی نہیں ہیں۔ خلاف میں بھی انصاف کی رعایت ضروری ہے۔

باب اذا دعت الام ولدھا فی الصلوٰۃ

اس بارے میں بھی حاشیۂ لامع ص ۲/۹۹ میں بہتر مواد وتفصیل ہے، اس کی مراجعت کی جائے۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسری قیل وقال سے صرفِ نظر فرما کر ایک دوسری تحقیق فرمائی ہے، کہ دعا کا معاملہ باب التشریع سے الگ ہے، اور موقع وجوبِ اجابۃ یا عدم وجوب سے قطع نظر بھی دعا قبول ہو سکتی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اس کو ملا کر قیل وقال کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ قبولیت دعا کا جو وقت ہوتا ہے، اس میں دعا قبول ہو ہی جایا کرتی ہے، اس میں یہ بحث کہ اس موقع پر قبول نہ ہونی چاہئے تھی فضول ہے۔ مسند میں حدیث ہے کہ ایک دفعہ حضور علیہ السلام حضرت عائشہؓ کے پاس سے کسی بات پر یہ فرما کر نکلے قطع اللہ یدیک، پھر لوٹے تو دیکھا کہ ان کے دونوں ہاتھ ٹیڑھے ہوگئے تھے، آپ نے دعا فرمائی تو ٹھیک ہوگئے (اسی لئے کسی کے لئے بددعا کرنے سے روکا گیا ہے کہ ممکن ہے قبولیت دعا کا وقت ہو) پھر دعا کا معاملہ الفاظ سے وابستہ ہے، خواہ دل میں ارادہ بھی اس بات کا نہ ہو۔ جیسے یہاں بظاہر آپ نے بطور تنبیہ یا ظرافت کے ایسے الفاظ حضرت عائشہؓ کو فرمائے ہوں گے، واللہ اعلم۔

حضرتؒ نے اس موقع کی مناسبت سے حضرت شمس الائمہ حلوائی کا واقعہ بھی سنایا کہ وہ بیمار ہوئے، سب شاگرد عیادت کے لئے آئے، بجز ایک کے، آپ نے بعد کو اس سے وجہ پوچھی تو کہا کہ میری والدہ بیمار تھیں اور کوئی دوسرا ان کی دیکھ بھال کے لئے نہ تھا، اس لئے حاضری نہ ہوسکی، آپ نے فرمایا کہ جاؤ خدا تمہاری عمر میں برکت دے گا، مگر علم میں برکت نہ دے گا، یہ حدیث کا مضمون ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک سے اولاد کی عمر بڑھتی ہے اور استاد کی خدمت سے علم بڑھتا ہے چونکہ شاگرد نے ایک چیز کو اختیار اور دوسری کو ترک کردیا تھا۔ اس لئے استاد نے یہ بات فرمادی، اگرچہ حقیقت میں شاگرد مذکور کا عذر بالکل صحیح تھا، اور ایسی صورت میں دعا مذکور برمحل نہ تھی مگر زبان سے نکل گئی اور قبول ہوگئی۔ اسی طرح جریج کا قصہ حدیث الباب میں ہے کہ وہ نماز میں مشغول رہے اور والدہ کے بلانے پر ان کے پاس نہ گئے، تو ان کو والدہ کی بددعا لگ گئی، حالانکہ وہ گنہگار نہ تھے، اور اسی لئے خدا نے ان کو تہمت زنا سے ایک بچہ کے ذریعہ بری بھی کرادیا۔ مگر دعا اور بددعا کے قاعدہ مذکورہ کے مطابق والدہ کی بددعا بھی پوری ہوئی کہ زنا کی تہمت ضرور لگی۔ اس واقعہ سے متعلق مفصل روایات علامہ عینیؒ نے لکھی ہیں اور حسب عادت افادات علیہ قیمہ کی لائن لگادی ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ (عمدہ ص ۲/۱۴/۷)۔

اس میں یہ بھی ہے کہ جب اس گود کے بچے نے خدا کی قدرت ومشیت کے تحت بول کر یہ بتادیا کہ میرا باپ تو چرواہا ہے (یعنی جریج نہیں) تو لوگوں نے جریج کی نہایت تعظیم وتکریم کی اور کہا کہ ہم آپ کے لئے سونے کا عبادت خانہ تعمیر کرائیں گے، جریج نے کہا کہ نہیں مجھے تو وہ پہلے جیسا ہی مٹی کا بنادو جو تم نے مجھ سے منحرف ہوکر تہمت زنا کی وجہ سے مسمار کردیا تھا۔

باب بسط الثوب

اس مسئلہ میں امام بخاریؒ نے حنفیہ کی موافقت کی ہے، ان کے نزدیک بھی نمازی اپنے پہنے ہوئے کپڑے کے کسی حصہ پر سجدہ کرسکتا ہے۔

باب اذا انفلتت الدابۃ فی الصلوٰۃ

نماز کی حالت میں اگر کوئی ایسی چیز پیش آئے کہ اپنا یا دوسرے کا نقصان دیکھے تو اگر بغیر عمل کثیر کے اس کا ازالہ کرسکے تو وہ جائز ہے۔ ورنہ نیت توڑ کر وہ کام انجام دے اور نماز کو لوٹائے۔ مشہور مسئلہ ہے۔

قولہ فقام رسول اللہ ﷺ فقرأ سورۃ طویلۃ

حضرتؒ نے فرمایا کہ یہاں صراحت ہے کہ نماز کو سورت طویلہ سے شروع کیا اور فاتحہ کا ذکر نہیں ہے، پھر بھی شافعیہ نے کہا کہ فاتحہ کے بعد سورت پڑھی ہوگی۔ کیونکہ ان کو شغف ہے کہ ہر جگہ سے لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کو ثابت کریں۔

باب اذا قیل للمصلی تقدم

ہمارے یہاں حنفیہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز میں بھول جائے کہ کتنی رکعت پڑھی ہیں، اور دوسرا آدمی اس کو بتلادے تو نماز پڑھنے والے کو چاہئے کہ فوراً اس پر عمل نہ کرے، کیونکہ باہر سے اصلاح قبول کرنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، بلکہ خود کچھ تامل کرکے اور اپنے پر بھروسہ کرکے عمل کرے تو نماز درست رہے گی۔ فاسد نہ ہوگی۔

قولہ لاترفعن رؤسکن

حضرتؒ نے فرمایا کہ ترجمہ تو نماز پڑھنے والے کو خارج سے کچھ بتانے کا تھا۔ مگر حدیث میں نماز سے باہر والے کو تعلیم مسئلہ کا بیان

ہے، تو ترجمہ اور حدیث الباب میں عدمِ مطابقت ہے۔

باب تفكر الرجل الشيء في الصلوٰة

علامہ مہلب نے فرمایا کہ فکر اور سوچ انسان پر غالب ہوتی ہے کہ اس سے نماز میں بھی بچنا ممکن نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے شیطان کو انسان پر اتنا اختیار دے دیا ہے کہ اس کے افکار کو غلط راستوں پر لیجانے کی کوشش کرے تاہم وہ تفکر اگر امورِ آخرت کے بارے میں ہو تو دنیاوی امور کے لحاظ سے ہلکا ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ حضرت عمرؓ کا تفکر بھی امرِ اخروی میں تھا کہ میں نماز کے اندر اپنے اسلامی لشکروں کو بھیجنے کی تدبیر کیا کرتا ہوں، لیکن چاہئے کہ نمازی خیالات کا غلبہ نہ ہونے دے۔ کہ بعض وقت یہ بھی بھول جاتا ہے کہ کتنی رکعات پڑھیں، اور چاہئے کہ ارکان واذکارِ صلوٰۃ ہی پر دھیان وتوجہ رکھے۔

صحتِ نماز کی نہایت اہمیت

حضرت العلامہ مولانا محمد انوری لائلپوری انوری قادریؒ نے ''انوارِ انوری'' ص ۱۸۰ میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے نقل کیا کہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ ایک دفعہ گنگوہ تشریف لے گئے، اور حضرت گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھے نماز پڑھنی آجائے سبحان اللہ کہ حضرتؒ کو نماز ہی کا فکر رہا کہ نماز صحیح طریقہ پر پڑھنی آجائے، حضرت گنگوہی نے دعا کرائی، یہ بات حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ نے کئی دفعہ فرمائی تھی۔ (مولانا محمد انوری ہی ناقل ہیں کہ حضرت رائے پوری موصوف حضرت شاہ صاحب کے تلمیذ بھی تھے، مدرسہ امینیہ، سنہری مسجد، دہلی کے زمانہ میں آپ سے کچھ پڑھا ہے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب نہ ہوتے تو میں غیر مقلد ہو جاتا، یہاں اتنی بات مزید سنی ہے کہ حضرت گنگوہیؒ نے حضرت شاہ صاحب کی مذکورہ گزارش پر برجستہ فرمایا کہ اور رہ ہی کیا گیا؟ یعنی جس کو نماز صحیح طور سے پڑھنی آگئی۔ اس کو دارین کی دولت حاصل ہوگئی۔ پھر کیا باقی رہا؟

ایک بزرگ سے یہ بات بھی پہنچی ہے کہ لے دے کے دن رات کے اندر صرف پانچ وقت کی تو نماز پڑھنی ہے، جس میں وقت بھی بہت کم صرف ہوتا ہے، اس لئے چاہئے کہ اس کا پورا اہتمام کر کے خوب ہی دل لگا کر پڑھے کہ حق ادا ہو جائے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ نماز جتنی آسان اور کم وقتی بھی ہے، اتنی ہی زیادہ وہ دشوار بھی ہے۔ وانہا لکبیرۃ تو حق تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے۔

صحتِ نماز کی ایک آسان صورت

راقم الحروف کے نزدیک ایک آسان شکل یہ ہے کہ ہر نماز کے ابتدائی وآخری لحات میں ہرگز غافل نہ ہو، ابتدا میں تو اس لئے کہ تحریمہ کا نیت کے ساتھ اتصال شرطِ صحتِ صلوٰۃ ہے۔ اگر اس وقت بھی دھیان قائم نہ کیا تو پھر ساری نماز میں وقت ضائع ہوا، کیونکہ دخولِ صلوٰۃ ہی درست نہ ہوا، اور اگر یہ لحہ صحیح گزر گیا تو باقی نماز کے حصوں میں کچھ نہ کچھ غفلت یا تفکر وخیالات کا انتشار نماز کے لئے مضر نہ ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ دل کا حاضر ہونا فقط نیت کے وقت شرط ہے، تمام نماز میں شرط نہیں، اس لئے نماز کے دوران میں اگر دل کا استحضار نہ ہوگا تو بلاخوف نماز کے صحیح ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر آخری لحات میں بھی مکمل توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہو کہ انما الاعمال بالخواتیم، اعمال کی صحت حسنِ خاتمہ پر منحصر ہے۔ اول و آخر کی مکمل توجہ وہی کے ساتھ درمیان میں بھی پوری نماز کے اندر قراءت، اذکار، تسبیحات پر متوجہ رہے پھر یہ کہ قیام کس کے دربار میں ہے، رکوع کس کی جناب رفیع وارفع میں کر رہا ہے۔ سجدہ میں پیشانی زمین پر کس اعلیٰ واعظم ذات کے سامنے رکھی ہے۔ اور حالتِ تشہد کے اندر کس کی بارگاہ میں دوزانو بیٹھا ہے۔ امید ہے کہ اس طرح سے اگر اول وآخر صحیح ہو گیا تو درمیانی کوتاہیاں معاف ہوں گی۔ ان شاء اللہ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب ماجاء فی السھو: حضرتؒ نے فرمایا: ابوداؤد میں ترجمۃ الباب اس طرح ہے کہ کوئی شخص ۲ رکعت پر بھول کر تیسری کے لئے کھڑا ہو گیا اور تشہد نہ کیا اور ہم میں سے وہ بھی تھے جو تشہد حالت قیام میں پڑھتے تھے، یہاں بھی تیسری رکعت میں تشہد کا ذکر ہے، فاتحہ کا نہیں، جس کا ظاہر یہ ہے کہ وہ فاتحہ نہ پڑھتے تھے تو کیا امام کے پیچھے بھی فاتحہ رکن تھی یا وہ اور دوسری قراءت اور تشہد وغیرہ یکساں اور برابر تھی؟ پھر یہ کہ یہ واقعہ اوائل اسلام کا ہوگا جبکہ مسائل کم معلوم تھے۔ صحابہ نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا ہوگا کہ جس کا تشہد رہ گیا وہ کھڑے ہو کر پڑھ لے۔ واللہ اعلم۔

قولہ کبر قبل التسلیم: یہ اختلاف کہ سجدۂ سہو سلام سے قبل ہے یا بعد، افضلیت کا ہے، جواز کا نہیں، اور تجرید سے جو معلوم ہوتا ہے کہ قدوری نے اس کو جواز کا مسئلہ بنایا ہے۔ وہ میرے نزدیک روایتِ شاذہ پر مبنی ہے، جبکہ احادیث کو اس پر محمول کرنا دشوار ہے۔

باب اذا صلے خمسا: علامہ محقق عینی نے حدیث الباب کے دوسرے طرق و متون بھی ذکر کئے ہیں، پھر لکھا کہ ابن خزیمہ نے لکھا کہ ابن مسعودؓ کی حدیث الباب میں عراقیین (حنفیہ وغیرہم) کے لئے کوئی حجت نہیں ہے، لیکن یہ اعتراض اس لئے کیا کہ وہ حنفیہ کے مدارکِ اجتہاد کو نہ سمجھ سکے، اور علامہ نووی نے جو لکھا ''از ید فی الصلوٰۃ میں امام مالک، شافعی احمد اور جمہور سلف و خلف کی دلیل ہے کہ بھول کر کوئی رکعت زیادہ پڑھنے سے نماز باطل نہیں ہوتی، اور امام ابوحنیفہ کا قول صحیح نہیں ہوتا کہ باطل ہو جاتی ہے، یہ حدیث اس کا رد کرتی ہے، علامہ عینی نے جواب میں کہا کہ چھٹی رکعت سہواً زائد کرنے پر امام صاحب سے بطلانِ صلوٰۃ کی نقل تسلیم نہیں ہے، پھر یہ کہ ظاہر حضور علیہ السلام کے حال سے یہ ہے کہ آپ چوتھی رکعت پر بیٹھے ہوں گے۔ کیونکہ ایک صواب طریقہ پر حضور کے فعل کو محمول کرنا بہتر ہے غیرِ صواب سے اور غالباً آپ نے ظہر کی چار رکعت ہی پڑھی ہوں گی، پھر سہو ہوا کہ چار پڑھی ہیں یا تین اور یہ بات کہ حضور پانچویں سے لوٹے کیوں نہیں اور چھٹی رکعت کیوں نہ ملائی۔ (جو حنفیہ کا مسلک ہے) تو یہ ملانا بھی حنفیہ کے نزدیک بدرجۂ واجب نہیں ہے، صاحبِ ہدایہ نے لکھا کہ اگر نہ ملائے گا تو کوئی حرج نہیں اور صاحب بدائع نے لکھا کہ چھٹی رکعت ملانا بہتر ہے تا کہ دو رکعت نفل ہو جائیں بجز عصر کے۔ (عمدہ ص ۳/۱۴۱ ۷)

فیض الباری ص ۲/۴۳۹ میں جو طبرانی کی حدیث کا اشکال بلا جواب کے پیش کیا ہے، اس کا جواب علامہ عینیؒ نے ص ۲/۳۱۱ میں فنقص فی الرابعۃ ولم یجلس حتی صلے الخامسہ سے دیا ہے، اور معارف السنن ص ۳/۴۹۴ میں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا یہی جواب زیادہ وضاحت سے بحوالۂ تعلیقات آثار السنن ذکر کیا ہے، کہ نقص بمعنی غیر آتا ہے اور لم یجلس سے مراد للسلام ہے، کہ حضور علیہ السلام نے بھول کر اپنا طریقہ بدل دیا اور سلام تک نہ بیٹھے آگے شافعیہ کے دوسرے اعتراض کا بھی جواب دیا ہے۔ فلیراجعہ۔

باب من لم یتشہد: امام بخاری کے جواب میں ہمارے پاس معانی الآثار و امام طحاوی کی حدیثِ مرفوع قوی ہے کہ حضور علیہ السلام سجدۂ سہو کے بعد تشہد میں بیٹھتے تھے اور ترمذی کی بھی حدیثِ حسن ہے۔

باب یکبر: جمہور کے نزدیک سجدۂ سہو کے لئے جدید تکبیر نہیں ہے۔

باب اذا کلم: نماز کے اندر اشارہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی، اگرچہ حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے اور دوسروں کے یہاں مکروہ بھی نہیں ہے۔ طرفین (امام اعظم و امام محمد) کی طرف منسوب ہے کہ اگر اذکار کو دنیوی حاجات میں استعمال کیا جائے تو وہ ذکر کی شان سے خارج ہو جاتے ہیں اور امام ابو یوسف کے نزدیک محض نیت بدلنے سے ذکر کے زمرے سے خارج نہیں ہوتے، میرا مختار امام ابو یوسف کا ہی قول ہے کہ اس میں سہولت ہے اور ہمیں خدا کی رحیمی کریمی سے امید ہے کہ ہم اس پر عمل کر کے بھی جنت میں چلے جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔